بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

فروری 2020

پہلی شعاع، رضیہ جمیل 8
حمد، صبیح رحمانی 9
نعت، بابر حیات 9
نبیؐ کی باتیں، ادارہ 10

انٹرویو

بندھن، شاکر حسین شاکر 26
دستک، شاہین رشید 22
جب تجھ سے ناتا، شائستہ ہاشمی 15
جب تجھ سے ناتا، م۔ن 18

ناول

شام کی حویلی میں، رخسانہ نگار عدنان 36
شہر تمنا، نعیمہ ناز 178

مکمل ناول

انتظارِ سحر، سدرہ حیات 72
بدلی ہے رُت، عائشہ نور 146

ناولٹ

وہ نازنین، فرح بخاری 116
گل بانو کی کہانی، ساجدہ غلام محمد 202

افسانے

مجھے پتھر کردو، طیبہ عفر مغل 59
ایک بھٹی عادلہ باجی، نظیر فاطمہ 67
یار دل دار، افشین نعیم 226
بھیا کی شادی، حمیرا شیخ 111
محبت سے یاد کرنا، قرۃ العین خرم ہاشمی 141

نظمیں غزلیں

غزل، مرزا غالب 238
نظم، شائستہ مفتی 237
غزل، احمد فراز 238
غزل، صابر ظفر 237

فروری 2020
6 تا 34
قیمت 70 روپے

مستقل سلسلے

خط آپ کے	رضیہ جمیل	32	تاریخ کے جھروکے	امت الصبور	251
مسکراہٹیں	ادارہ	235	آئینہ خانے میں	واصفہ سہیل	254
بالوں سے خوشبو آئے	شگفتہ جاہ	239	موسم کے پیکان	خالدہ جیلانی	256
کھلتا کسی پہ	خالدہ جیلانی	241	خوبصورت بنئے	ادارہ	258

رخسانہ نگار عدنان

شرارتی جوڑیاں

کشف اپنے پرانے طرز کے گھر سے شدید بے زار ہے اور وہ اپنی آنی سے ہزار بار کہہ چکی ہے کہ وہ اس گھر سے جان چھڑالیں لیکن وہ ہر بار اس کی بات ہنس کر ٹال دیتی ہیں۔ کشف گلیوں سے گزرتے خوانچا فروشوں سے بھی سخت بے زار رہتی ہے اور انہیں حسب توفیق بددعاؤں سے نوازتی رہتی ہے۔

طاہرہ بیگم کا اپنے گھر پر کافی ہولڈ ہے۔ ان کی بہو سونیا اور بیٹا آزر دونوں ہی ان کے فرماں بردار ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی پوتی کا رشتہ ان کی مرضی سے طے ہو۔

جبکہ ردا اپنے آفس میں کام کرنے والے جبران سے محبت کرتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ وہ اس کا رشتہ لے کر آئے۔

دوسری جانب کشف کا پڑوسی اسے چھیڑتا ہے اور وہ اس کے پاؤں پر اینٹ دے مارتی ہے۔ بعد میں اسی لڑکے کی ماں سے بھی خوب جھگڑا کرتی ہے۔

زینب شاعری کرتی ہے اور ساتھ ہی ایک اسکول میں بھی پڑھاتی ہے وہ اپنا مسودہ حیدر کے پاس لے کر جاتی ہے تاکہ وہ سرفراز سے بات کر کے اسے چھپوا سکیں۔

آفس سے واپسی پر اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور وہیں تیز برستی بارش میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

آڈیٹوریم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہے جہاں ڈاکٹر موحد تین بڑی بیماریوں کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے لیکچر

دے رہے ہیں۔ اور ہال میں تمام لوگ ساکت ہو کر سن رہے ہیں۔

کشف، ناہید کو دیکھ کر اس سے بے اختیار لپٹ جاتی ہے۔ ناہید کو زینب کی فکر ستاتی ہے اور وہ بارش سے بھی خوف زدہ ہیں۔ کشف انہیں کہتی ہے کہ زینب فون نہیں اٹھا رہی۔ ناہید اس سے بتول خالہ سے کیے گئے جھگڑے کے بارے میں پوچھتی ہیں اور اسے سمجھاتی ہیں۔

میر و خزاں کے موسم میں اپنی گاڑی میں موجود ہے اور کسی کی یاد ہے جو اسے گھیرے ہوئی ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے اگر کبھی ناراض ہوئی تو میر وا سے منا لے۔ وہ ان سوچوں میں الجھا چلتا چلا جاتا ہے۔

موحد راستے میں رش دیکھ کر اترتا ہے اور سامنے بے ہوش پڑی زینب کو دیکھ کر اسے ہاسپٹل لے جاتا ہے۔

آذر کو ایک فون کال آتی ہے اور وہ عجلت میں آفس سے باہر نکلتا ہے۔ زینب کے بارے میں کوئی بھی معلومات نہ پا کر کشف شدید پریشان ہو جاتی ہے۔ سہیل اپنے طور پر پتا کروا لیتا ہے اور اسکول بھی چکر لگا آتا ہے۔ لیکن وہ وہاں بھی موجود نہیں ہوتی۔ وہ حیدر کو فون کرتی ہے وہ بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد اس کے فون پر موحد کی کال آتی ہے۔ اور وہ اسے زینب کے بارے میں بتاتا ہے۔

دوسری طرف زینب کو ہوش آتا ہے اور موحد اسے جانا پہچانا لگتا ہے۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتی ہے اور گھر جانے کا کہتی ہے۔ اور موحد سے اس کے باپ کا نام بھی پوچھ لیتی ہے۔ موحد اسے اس کے گھر چھوڑ کر آتا ہے۔ جہاں کشف کے ساتھ طلال بھی موجود ہوتا ہے۔ باتوں کے دوران بتول خالہ آجاتی ہیں اور ماں بیٹی کے کردار پر الزام تراشیاں کرتی بکتی جھکتی طلال کے ڈرانے پر گھر سے نکل جاتی ہیں۔

آذر، ردا کو لے کر گھر پہنچتا ہے جہاں پورا گھر ردا کی غیر حاضری کے باعث پریشان ہے۔ ردا اپنے کمرے میں جاتی ہے جہاں رمشا اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ اسے ڈانٹ کر بھگا دیتی ہے۔ سونیا اس کے کمرے میں آتی ہیں اور اس سے پوچھتی ہے کہ کیا ہوا ہے اور کمرے کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ ردا حیران رہ جاتی ہے۔

میر و دیوار میں کیل ٹھونک رہا ہوتا ہے جب وہ عورت چیختے ہوئے آتی ہے اور اس سے جھگڑتی ہے۔ اس حسین عورت کی طرف میر و شرمندگی سے دیکھتا اس کی بدزبانی سنتا ہے۔ تبھی ان کی بیٹی آتی ہے اور اس کا سرخ لباس دیکھ کر وہ عورت پھر سے چیختا چلاتا اور آخر میں رونا شروع کر دیتی ہے۔

وہ نوجوان لڑکی ماں کی اس حالت سے شدید الرجک ہے اور کہتی ہے کہ اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے۔ جبکہ وہ عورت چلاتے چلاتے میر و کے گریبان میں چہرہ چھپا لیتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے دور نہ جائے۔

دادی، شائستہ کو فون کر کے کہتی ہیں کہ آذر اور سونیا کو اس رشتے پر اعتراض نہیں۔ وہ بیس دن بعد نکاح رخصتی کی تاریخ رکھ لیتی ہیں جبکہ دروازے میں کھڑا آذر یہ سن کر ساکت رہ جاتا ہے۔

آذر اپنی ماں سے کہتا ہے کہ انہیں رشتہ طے کرنے سے پہلے کم از کم ردا کی مرضی ضرور معلوم کرنی چاہیے۔ لیکن وہ بات کو یوں گھماتی ہیں کہ آذر چپ رہ جاتا ہے۔

کشف آنی سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے۔ وہ اسے ساری تفصیل بتاتی ہے۔ میر منصور باہر گیا اور وہاں جا کر دوسری شادی کر لی۔ کشف ضدی لہجے میں کہتی ہے کہ وہ ان سے ضرور ملے گی۔

سونیا، ردا سے پوچھتی ہے کہ برسات میں کیا ہوا تھا۔ وہ کہتی ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔ پھر وہ اسے بتاتی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے اور جبران سے ہی شادی کرے گی۔ سونیا اسے زوردار تھپڑ مارتی ہے۔ سونیا، آذر کو ڈھکے چھپے لفظوں میں بتاتی ہے کہ اس کی بیٹی شادی کے لیے راضی نہیں۔

حیدر، زینب سے ملتا ہے تو وہ اسے کشف کے رویے کے بارے میں بتاتی ہے۔

کشف خیالوں میں گم بس میں بیٹھی رہ جاتی ہے۔ اڈے پر پہنچ کر وہ چونکتی ہے اور گھبرا کر رہائشی علاقے کی طرف آجاتی ہے۔ جہاں حمزہ اسے سونیا کے گھر ڈراپ کر دیتا ہے۔ کشف کی موجودگی سے آذر بے سکون ہوتا ہے۔

میر منصور، ایما کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بدتمیزی کرتی ہے جواباً وہ اسے تھپڑ مار دیتا ہے۔ ایما پولیس بلا لیتی ہے۔ گھر پر اس کی ماں ایک پرتکلف ڈنر تیار کر کے اس کا انتظار کرتی ہے۔ ایما ماں کو خوشی خوشی بتاتی ہے کہ اس نے باپ کو

پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔

کشف سونیا سے بھی اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے اور اس کے سامنے اس عزم کا اظہار کرتی ہے کہ وہ ضرور امریکہ جائے گی۔

زینب، بتول خالہ سے معافی مانگنے جاتی ہے جہاں وہ اسے کشف کی شادی کا مشورہ دیتی ہیں۔

ڈاکٹر موحد گاؤں میں ہونے والی ایک فوتگی پر جاتے ہیں اور وہاں نہ صرف جنازے میں شریک ہوتے ہیں بلکہ قبر کھودنے میں بھی مدد کرتے ہیں جس پر گاؤں کے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔

سونیا زینب کو فون پر کشف کی وجہ سے بہت ستاتی ہیں۔ زینب کشف سے اس بارے میں پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ ہاں وہ سونیا کے پاس اپنے باپ کی معلومات لینے گئی تھی۔ اسے سونیا کا عجیب رویہ یاد آتا ہے۔

آزر جیران سے ملتا ہے اور اسے بے عزت کرتا ہے، ردا غصے سے باہر نکل جاتی ہے۔

کشف کچن میں ردا کو دیکھ کر ایک کپ کافی کا کہتی ہے۔ باتوں باتوں میں وہ ردا سے کہتی ہے کہ وہ اس شادی سے خوش نہیں کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ ردا یہ سن کر چراغ پا ہو جاتی ہے۔ سونیا ردا کو آ کر تھپڑ مارتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ اس کی ماں کی وجہ سے آج تم اس گھر میں ہو اور آج ہماری عزت رہ گئی ہے۔

ہاسپٹل سے میر منصور زینب کا ہاتھ پکڑ کر باہر لاتا ہے اور اسے زینی کے نام سے بلاتا ہے۔ زینب کہتی ہے کہ اس کا نام زینی نہیں زینب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم جس سے محبت کرتی ہو وہ میں تھا یا کوئی اس کی خاطر میری بات سن لو۔ زینب کہتی ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی اور کبھی نہیں تھا۔ میر منصور اس بات پر یقین نہیں کرتا۔ موحد کے پہنچنے پر زرین بہت خوش ہوتی ہے۔ زرین کو برے حالوں میں دیکھ کر موحد کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایما کی وجہ سے اس حال میں ہیں، میں ان کا کچھ نہیں۔

میر منصور کی یہ بات سن کر زینب حیران رہ جاتی ہے کہ زینب نے بے وفائی میں پہل کر کے شادی کر لی۔ دونوں ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ منصور یہ سن کر پریشان ہو جاتا ہے کہ تیس سال سے اکیلی رہ رہی ہے۔

کشف زینب سے فون پر کہتی ہے کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتی ہے زینب منع کر دیتی ہے۔

کشف کی آنکھ ایک ڈراؤنے خواب سے کھلتی ہے۔ وہ ہلکی سی چیخ مار کر اٹھتی ہے ٹائم دیکھتی ہے۔ ابھی تو بارہ بھی نہیں بجے تھے۔ پانی پی کر وہ خالی گلاس لے کر باہر جاتی ہے۔ کچن میں اندھیرا ہوتا ہے۔ وہ ڈسپنسر سے پانی لینے آگے بڑھتی ہے۔ کہ اس کے ہاتھ سے گلاس گر کر ٹوٹ جاتا ہے۔ کسی نے اس کو بری طرح اپنے بازوؤں میں لے کر جھکڑا تھا۔ اس نے چیخنا چاہا تو کسی نے اس کے منہ کو پوری قوت سے بھینچ دیا۔

کشف پر حملہ کرنے والا کوئی اور نہیں آزر تھا۔ سونیا آزر سے پوچھتی ہے۔ اس کی چیخ و پکار سن کر رمشا، ردا اور طاہرہ بیگم بھی آ جاتے ہیں۔ آزر ڈھٹائی سے کہتا ہے کہ میں نے صرف اپنے بیٹے کو اس سے بچانے کی خاطر یہ قدم اٹھایا ہے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ حمزہ یہ سن لیتا ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کر پاتا۔ طاہرہ بیگم آزر کی حمایت کرتی ہیں۔

حیدر کشف کو سمجھاتا ہے کہ وہ گھر کے اندر آ جائے۔ بلال ثمینہ کو اس کے کمرے میں لے جاتا ہے۔ ماں کو کمرے میں چھوڑ کر بلال کشف کو اندر صالحہ کے کمرے میں لے آتا ہے لیکن کشف وہاں رکنے پر تیار نہیں ہوتی صالحہ اسے کہتی ہیں کہ صبح وہ خود اس کے ساتھ اس کے گھر چلیں گی۔

ثمینہ حیدر سے لڑتی ہے کہ اسے طلاق چاہیے۔ بلال سمجھاتا ہے تو وہ کہتی کہ بلال اپنے باپ کی حمایت کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو زخمی کر لیتی ہے۔

موحد ایما سے ملنے ہاسپٹل آتا ہے جہاں زریں اسے کہتی ہے کہ وہ منصور کو چھوڑ دے گی بس موحد اس کے پاس آ جائے۔ منصور کو یہ سن کر احساس زیاں ہوتا ہے وہ زینب کے پاس جانے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ کشف صالحہ بیگم کے ساتھ اپنے گھر آ جاتی ہے۔

موحد کے پاکستان واپس جانے کا سن کر زریں بہت دکھی ہوتی ہے۔ دیتی اپنے بچے کے ساتھ جو رات جنگل میں گزارتی ہے اس سے اس میں اتنی ہمت آ جاتی ہے کہ وہ اپنے بچے کے لیے تنہا جینے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ زینب اس کی کہانی سے بہت متاثر ہوتی ہے۔

آزر ماں اور بیوی کے ساتھ رمشا کو بھی لے کر ایئرپورٹ جاتا ہے گھر میں ردا اکیلی ہے۔ اچانک وہاں وہ ایک جانی پہچانی آواز سنتی ہے۔ زینب سے ملنے کے لیے منصور ہوٹل آتا ہے۔ وہیں اس کی ملاقات موحد سے ہوتی ہے۔ وہ اس غیر

متوقع صورت حال پر حیرانی سے اسے دیکھتا ہے۔

ردا گھر میں اکیلی ہوتی ہے فرحان آکر اسے اکساتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ چلے ردا کے انکار پر اسے غصہ آجاتا ہے اور وہ بدنیتی پر اتر آتا ہے۔ ردا اپنے آپ کو زخمی کر لیتی ہے فرحان بھاگ جاتا ہے۔ حمزہ آکر اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہے۔

منصور زینب سے ملنے آتا ہے تو وہاں موحد بھی پہنچ جاتا ہے موحد حیران ہوتا ہے کہ زینب سے منصور کا کیا تعلق ہے منصور بتاتا ہے کہ وہ اس کی فرسٹ کزن ہے۔

زینب کا شاپنگ پر جانا تھا منصور اسے اس کے والد کا واسطہ دے کر کہا ہے کہ وہ اس کے ساتھ شاپنگ پر چلے۔ اسے سونیا اور اس کی بیٹیوں کے لیے شاپنگ کرنی تھی۔ منصور اس کے لیے ایک ساڑھی گفٹ لیتا ہے۔ زینب کو ماسی یاد آتا ہے کہ وہ سونیا کی شادی میں اس کے لیے ساڑھی لایا تھا۔ وہ اس کی دی ہوئی ساڑھی ریسپشن پر چھوڑ جاتی ہے۔ منصور حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔

بلال کشف سے ملنے آتا ہے کشف اس سے رکھائی سے پیش آتی ہے۔ اس کے یہ پوچھنے پر کہ وہ سونیا کے گھر سے رات میں کیوں آئی کشف ناراض ہو جاتی تھی۔

سونیا ردا کی حالت دیکھ کر پریشان ہے کہ اس کے سسرال والے آچکے ہیں اور کسی وقت بھی ہوٹل سے گھر ملنے آسکتے ہیں۔ ردا کہتی ہے کہ وہ چکر آنے پر گر پڑی تھی۔ موحد کے جانے کے بعد زرین منصور سے معافی مانگتی ہے منصور کے نہ ماننے پر کپ توڑ دیتی ہے۔

سونیا آکر کشف سے معافی مانگتی ہے اور کہتی ہے کہ زینب یا کسی کو پتا نہ چلے۔

زینب پاکستان آکر حیدر کے ساتھ آتی ہے وہ یہ جان کر حیرت زدہ ہے کہ کشف سونیا کے گھر نہیں بلکہ اپنے گھر میں ہے۔ حیدر یہ جان کر کہ زینب منصور سے کینیڈا میں مل چکی ہے، چونک جاتا ہے۔

سونیا اور آذر نے شائستہ اور سلیمان کی دعوت اپنے گھر میں رکھی تھی جس میں ان کی شادی کی تاریخ مقرر ہونا تھی۔ رمشا ردا کو تیار کرتی ہے۔ ردا رمشا سے محبت کے حوالے سے بات کر رہی ہوتی ہے کہ دروازے میں سلیمان کو کھڑا دیکھ کر شاکڈ رہ جاتی ہے۔

موحد کو زینب ڈنر پر انوائیٹ کرتی ہے۔ کشف کو بہت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈنر پر موحد سے بدتمیزی کرتی ہے۔ میر جیل میں بیٹھا شدید غم میں ہوتا ہے۔ اسے اپنی بیٹی سے اس حرکت کی توقع نہیں ہوتی۔ ردا کو جبران الزام دیتا ہے۔ اور پھر اسے کہتا ہے کہ وہ کل ہر اس صورت اس سے ملاقات کرلے جبران ردا کو ایک انجان جگہ لے جاتا ہے۔

حیدر، زینب کو میر منصور کا کینیڈا کا ایڈریس دینا بھول جاتا ہے۔ رمشا، کشف کے آنے پر بہت خوش ہوتی ہے۔ طاہرہ بیگم ان سے اجازت لیے بغیر کشف کے وہاں آنے کا بہت زیادہ برا مناتی ہیں۔ کشف کو لگتا ہے کہ وہ مر جائے گی۔ وہ سونیا سے وہاں سے جانے کی ضد کرتی ہے۔

میر منصور کے گھر فون آتا ہے کہ ایمان بلڈنگ سے گر کر انتہائی زخمی حالت میں اسپتال میں ہے۔ زینب کی وہاں بہت پذیرائی ہوتی ہے۔

موحد کو ایمانے کے زخمی ہونے کا پتا چلتا ہے۔ وہ پریشان ہوتا ہے۔ منصور اور زرین میں کھٹ پٹ ہو جاتی ہے۔ منصور کو اپنی ماں کی بات یاد آتی ہے کہ انہوں نے زینب کی شادی کر دی ہے۔

طاہرہ بیگم سونیا کو سخت سست سناتی ہیں۔ آذر کو بھی کشف کا وہاں رہنا پسند نہیں آتا۔

کشف گھبرا کر موحد کے پاس جاتی ہے وہ اپنی پریشانی میں الجھا ہوتا ہے۔ کشف کو ناگوار گزرتا ہے۔ زینب فون پر کشف کو ڈانٹتی ہے کہ وہ بغیر بتائے سونیا کے گھر سے کیوں نکل آئی۔ زینب کے ساتھ آئے ایک شاعر کو دل کا دورہ پڑتا ہے اور سب کے ساتھ زینب بھی انہیں دیکھنے اسپتال جاتی ہے۔ جہاں اس کا سامنا میر منصور سے ہوتا ہے۔ وہ دونوں حیران رہ جاتے ہیں۔

عائشہ کی خالہ کا بیٹا ذوہیب گھر والوں کو سرپرائز دینے کے لیے ایک ہفتے پہلے آجاتا ہے۔

ظفر صدیقی صاحب کو وفاقی وزیر بچل شاہ پولیس کے اعلا افسر کے ہمراہ اپنے گھر بلا کر انہیں مقدمے کو ختم کرنے کا کہتا ہے۔ پولیس افسر کرم الٰہی بھی انہیں سمجھاتا ہے کہ جان محمد اب بیان ولی شاہ کے حق میں دے گا۔ بچل شاہ ایک لفافے میں بلینک چیک دیتا ہے کہ اپنی مرضی کا اماؤنٹ بھر لیں۔ مانی یہ جان کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ ظفر صاحب نے قصاص کے پیسے لے لیے۔

ترنم کی عدت ختم ہو جاتی ہے۔ ماں اسے کہتی ہے کہ وہ کچھ ہار سنگھار کر لے۔ ترنم اپنے بیٹے کی بسم اللہ کرنے کے لیے کہتی ہے۔
جمال فون سن کر زرد پڑ جاتا ہے۔ وہ نائلہ سے کہتا ہے کہ اپنا پرس اٹھاؤ اور چلو۔ وہ نائلہ کو خوب پیدل گھماتا پھراتا آگے بڑھتا ہے وہ کسی گھبراہٹ کا شکار تھا۔ ایک جگہ جا کر وہ موٹر سائیکل کی پاس رکتا ہے اور اس پر بیٹھے ایک عجیب و غریب حلیے والے لڑکے کو کہتا ہے کہ نائلہ کو محفوظ جگہ پہنچا دے۔ وہ اسے انتہائی نچلے متوسط علاقے کے ایک گھر میں لے آتا ہے اور وہاں ایک عورت آ کر پوچھتی ہے کہ تم کون ہو۔
طلال کے پاس اس کے باپ کا فون آتا ہے کہ وہ ظفر صدیقی والے کیس سے دور رہے کیونکہ ان کے مفادات اس سے وابستہ ہیں۔ جھنڈے والی گاڑی کا خواب طلال کو اس کیس سے دور کر دیتا ہے۔
پریا طلال کی دیوانگی سے تنگ آ جاتی ہے۔ طلال اسے کہتا ہے کہ جو چیز اس کی ہوتی ہے وہ کسی اور کے قابل نہیں رہتی۔ وہ اس کے چہرے پر تیزاب ڈالنے کی دھمکی دیتا ہے۔ نائلہ کو پتا چلتا ہے کہ وہ جمال کا گھر ہے، راکٹ اس کا بھائی اور وہ لڑکی اس کی بھابھی ہے۔
چنبیلی طلال سے لڑ کر اپنا سامان پیک کرتی ہے۔ طلال اسے مارتا ہے اور دھمکی دیتا ہے کہ باہر نہ جانا۔ چنبیلی انتہائی بری حالت میں کوٹھے پر پہنچتی ہے۔ سب اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں۔
اچانک چنبیلی کی چیخوں سے پورا گھر لرز جاتا ہے۔
حمزہ ردا کے نکاح والے دن کشف سے ملنے جاتا ہے۔ کشف اسے دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے وہ اس سے معافی مانگتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ وہ باہر جا رہا ہے۔ کشف اسے معاف کر دے۔
منصور زرین سے کہتا ہے کہ وہ پاکستان اس لیے جا رہا ہے کہ وہ اپنا گھر بیچ کر اس کا قرض اتارے۔ لیکن زرین اس کی بات پر یقین نہیں کرتی کہ تم وہاں جا کر ہمارے رشتے سے مکر سکتے ہو۔ جس پر منصور اسے بتاتا ہے کہ زرین کے والد نے اس کی خوشامد کر کے اسے زرین سے شادی پر مجبور کیا تھا۔
ردا سلیمان کو پا کر محسوس کرتی ہے کہ یہ اس کی ماں باپ کی فرمانبرداری کا انعام ہے۔
کشف، فائقہ کے ساتھ ورکشاپ اٹینڈ کرنے آتی ہے تو اس کی ملاقات وہاں موحد سے ہوتی ہے۔ موحد اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے کھانے پینے کا انتظام اچھے سے کروا دیتا ہے۔ کشف کو بہت محسوس ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں وہ اس کی وضاحت کر دیتا ہے۔
زینب کشف کی وجہ سے پریشان ہے۔ وہ حیدر کے آفس جاتی ہے۔ وہاں اس سے کشف کے رشتے کی بات کرتی ہے وہ بلال کی بات کرتا ہے۔ وہاں ثمینہ آ جاتی ہے اور ان دونوں کو خوب ذلیل کرتی ہے۔ حیدر ثمینہ کو لے جاتا ہے۔ زینب وہاں سن بیٹھی رہ جاتی ہے چوکیدار آ کے اسے جانے کا کہتا ہے۔
کشف، ڈاکٹر موحد سے ملتی ہے اور کہتی ہے کہ اگر آپ مجھے اچھا سمجھتے ہیں تو میری ماں سے میرا ہاتھ مانگیں اور مجھ سے شادی کر لیں۔
فرحان، سلیمان کے ہوٹل پہنچ جاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ وہ ردا کا بوائے فرینڈ اور سابقہ محبوب ہے۔
موحد کشف سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔ حمزہ باپ سے ناراض ہے۔ آذر غصے میں حمزہ کو گھر سے نکل جانے کو کہتا ہے۔
فرحان سلیمان سے مل کر اسے اپنے اور ردا کے تعلق کے بارے میں بتا دیتا ہے۔ سلیمان، ردا کی کال ریسیو نہیں کرتا۔
ثمینہ حیدر سے لڑتی ہے۔ اور بہت غلط زبان استعمال کرتی ہے بلال اسے روکتا ہے تو وہ اسے بھی لتاڑتی ہے۔
کشف کے حوالے سے کہتی ہے کہ وہ اسے کبھی بہو نہیں بنائے گی کشف یہ سب سن لیتی ہے۔ اور روتی ہوئی گھر چلی جاتی ہے۔ سلیمان، ردا سے فرحان کے متعلق سوال کرتا ہے۔

سترہویں قسط

ردا کے چہرے پر زردی پھیلتی جا رہی تھی۔
یوں اس طرح اچانک خود سے تو سلیمان اتنی بڑی بات، اتنے کنفرم انداز میں اس کے سامنے آ کر نہیں کر سکتا۔
''تو فرحان اس سے ملا ہوگا۔'' اس کا دل بند ہونے کو تھا۔ اس دن اکیلے میں فرحان اور ردا کے علاوہ تیسرا گواہ اللہ تھا۔ اللہ اس کے ساتھ اتنا برا کیسے کر سکتا ہے جب کہ اس نے دل سے والدین کی بات مان کر ان کی عزت کا خیال کر کے مکمل تابعداری کے ساتھ سلیمان کو قبول کر لیا تھا پھر بھی۔
اسے شدت غم کے ساتھ غصہ اور رونا آئے جا رہا تھا۔ مگر یہ دونوں جذبات اس وقت مسئلے کا فوری حل نہیں تھے۔
سلیمان کی شعلہ بار نظریں اس کے چہرے پر گڑی جا رہی تھیں۔
''فرحان صرف میرا ایک آفس کولیگ تھا۔'' وہ بولی تو اس کا لہجہ مضبوط اور بے خوف تھا۔
اسے خود بھی حیرت ہوئی۔
''میں نے صرف یہ پوچھا ہے کہ تمہیں یہ چوٹ اس دن لگی تھی ناں، جب فرحان تم سے گھر میں ملنے آیا اور یہاں سب لوگ ہمیں ایر پورٹ ریسیو کرنے آئے تھے۔ ایسا ہی تھا ناں۔'' وہ اسی طرح سرد بے یقین نظریں اس پر جمائے بے لچک انداز میں پوچھ رہا تھا۔
''اور ردا! جھوٹ نہیں بولنا کیونکہ میرے پاس ثبوت موجود ہے اس بات کا۔'' اس نے ردا سے اس کا سارا اعتماد لمحہ بھر میں چھین لیا۔ وہ فق چہرے کے ساتھ اسے دیکھتی رہ گئی۔
اس کا جسم جیسے نیچے کو گرتا جا رہا تھا اسے کسی قریبی سہارے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔
''میں کیوں جھوٹ بولوں گی۔'' اس کے گلے سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔
''ہم دونوں کے رشتے کی بنیاد میں جھوٹ کی بنیاد اعتمادی کی ملاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔ میں چاہتا تو تم سے یہ سب کچھ پوچھے بغیر بھی تمہاری حقیقت جان کر سب کچھ یک طرفہ طور پہ ختم بھی کر سکتا تھا لیکن میں نے.....''
مگر اس سے آگے ردا کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔
''تمہاری حقیقت، جان کر سب کچھ ختم.....'' اس کے کان زور زور سے سائیں سائیں کرنے لگیں۔
تو وہ فیصلہ کر کے آیا ہے۔
''بھئی میں تو ان منگنی ونگنی کے ذرا حق میں نہیں کوئی حیثیت نہیں ہوتی اس کھڑاگ کی، کرنا ہی ہے تو نکاح کرو پکا اور مضبوط کام جس کو خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہو بھی جائے تو آنچ نہیں آ سکتی۔ کوئی یونہی تو سب ختم کر کے نہیں جا سکتا ناں۔'' اس کے کانوں میں طاہرہ بیگم کی رعونت بھری آواز گونجنے لگی، جب سونیا نکاح کے بجائے صرف منگنی کرنا چاہ رہی تھی تو انہوں نے اس کی کلاس لے لی تھی۔
''واہ دادا! آپ کا، مضبوط اور پکا کام، دو دن بھی نہیں چل سکا۔''
''سلیمان بیٹا! تم یہاں ہو باہر تمہارے انکل تمہارا ویٹ کر رہے ہیں گاڑی میں بیٹھے۔'' سونیا عجلت بھرے انداز میں اندر آئی تھی۔ وہ دونوں ہی چونکے تھے۔ سلیمان کے ماتھے پر پڑے بل کچھ گہرے ہو گئے تھے۔
''میرا انتظار؟'' وہ ناگواری سے فقط اتنا ہی بول سکا۔
''دیکھو، نکاح میں تو تم نے کچھ بھی نہیں کرنے دیا نہ کوئی اپنی شاپنگ کی۔ نکاح کا جوڑا تک تم نے اپنا ہی پہنا مگر بیٹا! ہمارے بھی کچھ ارمان ہیں۔ کچھ خواہشیں ہیں اور پھر بیٹا یہ دنیا داری کی رسم بھی ہے۔ شادی کا جوڑا لڑکی والوں کی طرف سے ہی ہوتا ہے۔ تمہیں تھوڑی دیر کے لیے انکل کے ساتھ جانا ہوگا۔'' سونیا نے ردا کی طرف غور کیے بغیر بظاہر سلیمان کو پکارتے ہوئے بڑی تفصیل سے جواب دیا تھا۔
''آنٹی پلیز! میں نے پہلے بھی آپ لوگوں کو کلیئر کیا تھا کہ مجھے ان فارمیلیٹیز میں نہیں پڑنا تو۔'' وہ کچھ جھنجلا

کر قدرے رکھائی کے ساتھ ترش لہجے میں بولا تھا۔
سونیا کو لمحہ بھر کو برا تو لگا مگر دوسرے پل اس نے جھٹک دیا۔ ایسا کچھ بھی اس نے محسوس نہیں کرنا اس نے خود کو سمجھایا۔
''میں جانتی ہوں بیٹا! لیکن یہ ضروری ہے۔ تمہاری مما سے بھی بات ہوگئی ہے۔''
''آنٹی پلیز۔'' وہ کچھ سخت بولنے سے رکا۔
''برا نہیں ماننا سلیمان! اب رخصتی میں..... آئی مین شادی میں زیادہ وقت نہیں ہے۔'' وہ رکی۔
''سو پلیز..... اماں جان نے بھی کہا ہے کہ تمہارا اور ردا کا اب تھوڑا پردہ ہو جائے تو..... تم سمجھ رہے ہو ناں؟''
وہ گہرا سانس لے کر رہ گیا۔
ردا کچھ اور سمٹ کر کمرے کے کونے سے لگ گئی تھی۔
''اللہ کرے مما! اسے یہاں سے لے جائیں وہ ایسی کوئی بات ہی نہ کر سکے۔'' وہ سہمے ہوئے دل سے دعا مانگنے لگی۔
''ٹھیک ہے آنٹی! میں ایسا ہی کروں گا لیکن ابھی مجھے ردا سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے اس کے بعد میں دوبارہ نہیں آؤں گا۔'' اس کی بات پر ردا نے تڑپ کر اسے دیکھا۔
وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔
ردا کی نظروں میں کیا نہیں تھا۔ ڈر، خوف، التجا، بے بسی، مایوسی اور نوخیز محبت کا مان تھوڑا سا بھرم۔
وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔
اسے لمحہ بھر کو بھول گیا۔ وہ یہاں کس اشتعال میں کیا کہنے اور کیا کرنے کے لیے آیا تھا۔
''ٹھیک ہے تم ردا سے بات کر لینا میں۔ تمہیں واپسی پر آدھ گھنٹہ دے دوں گی لیکن ابھی تمہیں فوراً اپنے انکل کے ساتھ جانا ہوگا۔ دیکھو پھر ہارن بجا رہے ہیں وہ۔ پلیز سلمان بیٹا۔''
وہ محبت بھری منت سے کہتی کچھ بے تکلفی سے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کر لے گئی۔
سلیمان نے جاتے ہوئے ذرا سی گردن موڑ کر ردا کو دیکھا وہ ابھی بھی اسے ان ہی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
وہ سر جھکا کر سونیا کے ساتھ چلا گیا۔
ردا وہیں دیوار کے ساتھ نیچے بیٹھ گئی۔
جیسے پھانسی کی سزا پر عمل درآمد کچھ وقت کے لیے روک دیا گیا ہو مگر پھندا زمین پر گرے مجرم کے سامنے جھول رہا ہو کچھ یہی حالت ردا کی اس وقت تھی۔
''کیا وہ سب کچھ ختم کر دے گا۔ مجھے مما سے جا کر بات کرنی چاہیے۔ وہ شائستہ آنٹی سے بات کریں۔ وہ بیٹے کو سمجھائیں گی تو شاید وہ اپنا فیصلہ بدل لے۔'' اس کے دل میں امید کی ننھی سی کرن جاگی۔
''اور اگر شائستہ آنٹی نے سب کچھ جان کر خود اس رشتے کو ختم کر دیا تو پھر کیا رہ جائے گا بلکہ شاید وہ مجھے ہی بدکردار سمجھنے لگیں اور بیٹے کو زبردستی یہ رشتہ ختم کرنے پر مجبور کر دیں۔ نہیں نہیں مجھے مما سے بات نہیں کرنی چاہیے۔''
وہ اٹھتے اٹھتے پھر وہیں بیٹھ گئی۔
اسے سلیمان کی واپسی کا انتظار کرنا تھا، اس کے فیصلے کا بھی! کیا پتا اس کا دل بدل جائے اس تھوڑے سے وقت میں..... اس کے دل نے امید کی کمزور ڈوری تھامنی چاہی۔

☆☆☆

وہ راستہ بھر سوچتی آئی تھی۔
وہ اس کو ہاں کرے یا ناں۔
دونوں پر ہی دل یک بارگی راضی نہیں تھا۔

شاید وہ موحد والے پروپوزل کے بارے میں اتنا فوکس ہو کر نہ سوچتی مگر اسے بلال کو اپنی سوچ کے قریب پھٹکنے سے بھی ارادتاً روکنا تھا۔

بلکہ شاید ثمینہ آنٹی کی گندی زبان نے غلیظ سوچ نے اسے موحد کے کچھ اور قریب کر دیا تھا۔

اسے موحد سے محبت تھی یا نہیں۔ چاہت تھی یا اس کا جذباتی پن..... یہ سب ثانوی باتیں تھیں اس وقت اسے موحد کے جذباتی سہارے کی نہیں اس کے حقیقی ساتھ کی ضرورت تھی۔

اسے بھی اپنے ماتھے پر مردانہ سہارے کا لیبل لگانا تھا جس کی وجہ سے سوسائٹی اسے بھی وہ عزت کا مقام دینے پر مجبور ہو جائے جو اس معاشرے میں ہر ایسی عورت کو حاصل تھا۔

مضبوط عورت کو کسی مرد کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ اسے اس سوکالڈ کلیشے سے نفرت ہو چلی تھی۔ یہ جن بھی باغی عورتوں کی ایجاد کردہ اصطلاح تھی۔ وہ اس وقت کشف کی نظر میں خود ہی اچھی عورتیں نہیں تھیں۔ انہوں نے خود کو بظاہر اس مضبوط عورت کی ڈھال کے پیچھے چھپانے کی ناکام کوشش کی تھی حالانکہ وہ کمزور اور ناتواں تھیں اس معاشرے کے منہ زور ریلے کے سامنے بے بس تنکے سے بھی کمزور۔

کشف کی سوچ میں یہ تبدیلی رات بھر میں نہیں آئی تھی..... پہلے باپ کے سہارے کی تشنگی پھر آذر کی حرکت اور حیدر انکل کی کمزوری، ثمینہ کی زبان سب نے جیسے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ اسی صورت میں مضبوط ہو سکتی ہے جب اس کے سر پر کسی مضبوط، مرد کے سائبان کی چادر ہو گی۔

لیکن پھر بھی وہ جلد بازی میں کوئی غلط فیصلہ نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ اس لیے کسی بھی نتیجے پر پہنچ نہیں پا رہی تھی۔

''آنی کہتی ہیں میرے بابا بھی بھی۔'' وہ رکی۔ ''مطلب کسی کا مرڈر نہیں کر سکتے۔'' لمحہ بھر کو ہچکچا کر وہ قدرے اعتماد سے بولی۔

موحد چونک کر رہ گیا۔

''کیا تم نے آنی سے بات کی۔'' موحد کا چونکنا کشف کو بھی چونکا گیا۔

''میں آنی سے کوئی بھی بات کیے بغیر رہ نہیں سکتی۔'' وہ بغیر لگی لپٹی کے صاف گوئی سے بولی۔

اور موحد کا جی چاہا، اپنا سر پیٹ لے۔

کشف کے اندر ابھی بھی وہ بچہ پوری توانائی سے ہمکتا تھا جو اسکول سے کہیں باہر سے آنے کے بعد سارے قصے کہانیاں من و عن اپنی ماں کو سناتا ہے۔

''پروپوزل کی بات بھی کی ہو گی پھر تو۔'' موحد ہلکے سے طنز سے بولا۔ ''تو کیا مشورہ دیا آپ کی والدہ نے۔''

اس کی طنزیہ ٹون پر کشف نے خفا نظروں سے اسے دیکھا۔

''خیر، میں نے یہ بات نہیں کی ابھی آنی سے اور مجھے معلوم ہے، ان سے کون سی بات کرنی ہے اور کون سی نہیں۔''

وہ اپنے طور پر بڑی سمجھ داری سے ذرا گردن اکڑا کر بولی۔ موحد نے مسکراہٹ ضبط کر کے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

''آپ ہنس رہے ہیں۔'' وہ اس کی چوری پکڑ کر ناراض ہوئی۔

''ہاں تو خوش ہونا چاہیے ناں مجھے کہ میری لائف پارٹنر کا اسٹمک اتنا مضبوط ہے کہ وہ ہر بات ہر کسی سے شیئر نہیں کرتی۔''

وہ ہلکا سا ہنس کر بظاہر اس کی تعریف کرتے ہوئے بولا۔

''ابھی میں نے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔''

وہ گردن گھما کر اعتماد سے بولی۔

''اوہ۔'' موحد نے بے اختیار ہونٹ سکوڑے۔
''تو کب کریں گی؟'' وہ کچھ تمسخر سے کہہ رہا تھا یا کشف کو ایسا لگا۔ ''یا آنی سے مشورہ کرنا ہے ابھی۔''
''آپ کو جلدی کیا ہے۔'' وہ اس کی جلد بازی پر جھنجلائی۔
''آج اور ابھی۔'' وہ زور دے کر سنجیدگی سے بولا۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔
بے اختیار اس کا سر نفی میں ہلا تھا۔ موحد نے ایک دم سے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔
''کہاں..... کہاں جا رہے ہیں۔'' وہ کچھ پریشان ہوئی۔
''تمہیں تمہارے گھر ڈراپ کرنے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔
''پلیز۔'' بے اختیار کشف نے اپنا ہاتھ موحد کے اسٹیرنگ پر رکھے ہاتھ پر رکھا تھا۔
اس کے بدن میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔
وہ بے اختیار اپنا ہاتھ کھینچنے لگی۔
مگر موحد اس کے ہاتھ پہ اپنا دوسرا ہاتھ رکھ چکا تھا۔ اس نے ہمت کر کے اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا۔ گرفت کچھ اور مضبوط ہو گئی۔
''پلیز۔'' بے بسی سے اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔
''بس اتنی سی بات پر رونے لگیں۔'' اسے کشف پر پیار کے ساتھ ترس بھی آیا تھا۔
لیکن ہاتھ پھر بھی نہیں چھوڑا۔
''میں کمزور نہیں ہوں۔'' کشف نے اپنا کمزور سا دفاع کرنا چاہا۔
''میری محبت کوئی کمزور لڑکی ہو بھی نہیں سکتی۔'' وہ اس کے بے حد قریب تھی موحد کی گہری سیاہ آنکھیں جیسے اس کے آر پار جا رہی تھیں۔
وہ اس کی حدت بھری نظروں سے خائف نظریں جھکا گئی۔
بیگ میں پڑا اس کا فون بج رہا تھا۔ مگر ان دونوں کو ہی شاید اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔
''کشف! کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرنا جو تمہیں مجھ سے دور لے جائے۔'' اس کی لو دیتی آنکھوں نے جیسے اس سے فریاد کی تھی۔
''دور جانا تو شاید اب میرے بس میں بھی نہیں۔'' وہ نظریں جھکا کر بے اختیار کہہ گئی۔
''تو پھر دیر کیوں۔'' وہ آہستگی سے بولا۔
''اتنی جلدی بھی کیوں؟'' وہ ابھی بھی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔
''کیا تمہیں مجھ پہ اعتبار نہیں۔'' اس نے کشف کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا تھا۔
اور کشف تو شاید اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں میں تھما کر بھول چکی تھی۔ اس کی مزاحمت بھی دم توڑ گئی تھی۔
''مجھے خود پر اعتبار نہیں۔ پتا نہیں میں اپنے فیصلے کو نبھا بھی پاؤں گی یا نہیں۔'' وہ بے بسی سے دل کے خدشے کو زبان پر لے آئی۔
''میں تمہارے ساتھ ہوں گا۔ تمہارا ساتھ دوں گا تم جو بھی فیصلہ کرو گی۔ تم تنہا نہیں ہو کشف۔'' وہ التجا کر رہا تھا۔
''ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہوں گے تو پھر کوئی بھی فیصلہ غلط ہو یا ٹھیک، ہمیں کمزور نہیں کر سکے گا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طاقت بنیں گے۔ ایک دوسرے کا سہارا۔ اتنا تو بھروسا کرو مجھ پر۔'' وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

وہ آزر صاحب کے ساتھ لباس کی سلیکشن کے بعد جوتوں کے ڈسپلے کی طرف بڑھ رہا تھا جب اس کے

فون پر میسج ٹون بجی۔

''میں نہیں جانتی سلیمان! آپ نے کس سے کیا سن کر کیا فیصلہ کیا ہے لیکن میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ اس رشتے کے واسطے جو آپ نے مجھ سے خدا اور رسول کو گواہ بنا کر جوڑا ہے۔ مجھ سے ایک بار بات ضرور کریں۔ کوئی بھی یک طرفہ فیصلہ کرنے سے پہلے..... آپ کو اس محبت کی قسم جو آپ کے دل میں میرے لیے ہے جبکہ میرے دل میں تو صرف آپ اور آپ کی محبت ہے۔''

سلیمان رک رک کر میسج پڑھتا جا رہا تھا۔

اس کی نظریں اس کا دل خالی خالی سا تھا۔

''چلو ناں سلیمان بیٹے! آ جاؤ ادھر۔ پھر کچھ اور چیزیں بھی لینی ہیں پھر تمہیں شاید کسی ضروری کام سے بھی جانا تھا۔''

آذر کی یہی عاجزی بھری چاہت تھی جس نے سلیمان کو ساتھ آنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''اور جب ان کو پتا چلے گا.....'' وہ آذر کا خوشی اور جوش سے تمتماتا چہرہ دیکھ کر سوچنے لگا۔

''آ جاؤ سلیمان۔'' وہ اسے اندر بلا رہے تھے۔

''پلیز انکل! باقی کی شاپنگ بعد میں کر لیں گے یا میں حمزہ کے ساتھ آ جاؤں گا ابھی مجھے واقعی میں ایک ضروری کام سے جانا ہے۔'' آذر اسے دیکھنے لگا۔

وہ نرم لہجے میں کچھ اس طرح اس سے معذرت کر رہا تھا کہ آذر کو مزید اصرار بے وجہ سا لگا۔

''چلو ٹھیک ہے جیسی تمہاری خوشی لیکن وقت کم تھا شادی میں تو اس لیے میں چاہ رہا تھا۔ ابھی ساری شاپنگ مکمل ہو جاتی۔'' وہ کچھ بجھے ہوئے لہجے میں سر ہلا کر بولا۔

''اتنا کچھ تو لے لیا ہے انکل! باقی بھی ہو جائے گا۔ اب چلیں۔'' وہ ایک جبری سی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر مزید آذر کی رائے جانے بغیر باہر کی طرف مڑ گیا تھا۔

آذر گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

یہ جو اتنی شاپنگ بھی ہو گئی یہ بھی میرے اصرار کی وجہ سے وہ کرتا رہا ورنہ وہ تو شاید اتنا بھی نہیں چاہتا۔

آذر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے سلیمان کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے سوچ کر رہ گیا۔

☆☆☆

اور کتنی دیر تک وہ سیل فون کی چمکتی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھی رہی اس نے میسج دیکھ لیا تھا لیکن جواب نہیں دیا۔

وہ پلکیں جھپکے بغیر اسکرین کو دیکھے جا رہی تھی۔

اس کا ہاتھ اور آنکھیں تھک گئیں۔

اس نے سیل رکھ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ آنسو ٹپک کر اس کے چہرے پر سفر کرتا اس کی گردن میں جذب ہو گیا۔

☆☆☆

''یا اللہ یہ لڑکی کہاں ہے..... میرا فون کیوں نہیں اٹھا رہی۔'' زینب کئی بار کشف کے نمبر پر کال کر چکی تھی۔

''وہ یا تو کہیں فون رکھ کر بھول گئی ہے یا فون سائیلنٹ پر ہو گا۔''

آخری سوچ خود کو تسلی دینے کے لیے ہی زینب کے دل میں آ سکی تھی۔

''دو گھنٹے میں وہ لوگ آ رہے ہیں کشف کو دیکھنے اگر یہ اس وقت تک گھر نہیں آئی تو بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔''

وہ کچن میں آ کر کبابوں کے لیے تیار مسالے سے کباب بنانے لگی۔

''پوچھا تم نے فرح سے، کون لوگ ہیں، کیسے ہیں، لڑکا کیا کرتا ہے؟'' صالحہ نے اندر آتے ہوئے اس کی بے دھیانی کو منتشر کیا۔

"نہیں۔ابھی تو کچھ خاص نہیں پوچھا خالہ۔" وہ چونک کر بے دھیانی سے بولی۔
"کہاں ہو تم بھی۔ کچھ تو معلومات لیتا ہے بندہ یا یونہی اٹھا کر کسی کو بھی گھر بلا لیتا ہے۔" صالحہ خفا ہوئیں۔
"ابھی وہ پہلے کشف کو دیکھیں گے۔" زینب نے تاویل گھڑنی چاہی۔
"اپنی کشف میں کیا کمی ہے بھلا۔ دیکھتے ہی ہاں کر جائیں گے وہ میری بات لکھ لو یہ تو میری بہو کم نصیب نکلی جو ایسی ہیرے جیسی لڑکی کی قدر نہیں کر سکی۔ پچھتائے گی ایک دن۔"
صالحہ کو یک دم ثمینہ پر غصہ سا آیا تھا۔
"لیکن نہیں ایسے لوگ کہاں پچھتاتے ہیں۔ پچھتاوؤں میں گھرنے کے لیے ہم جیسے جو ہیں۔" دوسرے لمحے وہ خود ترسی کے لہجے میں خود ہی کہنے لگیں۔
"اللہ نہ کرے خالہ! آپ کیوں پچھتائیں۔"
زینب نے صالحہ کی آنکھوں میں جھانکتی اداسی کو دیکھ کر تسلی دینے کو کہا۔
صالحہ جواب میں آہ سی بھر کر رہ گئیں۔
"بیٹا بھی یہاں ڈال کر بھول گیا تھا۔ لگتا تھا اب باقی کی عمر یہیں بسر ہو گی۔
وہ سنک میں پڑے کچھ برتن دھونے لگیں۔
"کمال کرتی ہیں خالہ! میں دھلوں گی چھوڑیں آپ ان کو۔ مجھے بتائیں، یہ کباب ہیں ساتھ میں بسکٹ نمکو اور کیک ٹھیک رہے گا ناں یا کچھ اور منگوالوں بازار سے۔" وہ صالحہ کو نرمی سے سنک کے آگے سے ہٹا کر ٹونٹی بند کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔
"پہلی بار آ رہے ہیں، کافی ہے اتنا کچھ، بات بن گئی تو اللہ خیر کرے خاطر مدارت کو آگے بہت مواقع آئیں گے۔" وہ متانت سے مشورہ دیتے ہوئے کہنے لگیں۔
"اس لیے میں بھی زیادہ تردد نہیں کر رہی، لڑکا انجینئر ہے۔ باپ بچپن میں فوت ہو گیا تھا۔ ماں کا چھ مہینے پہلے انتقال ہوا ہے۔ دو بہنیں ہیں۔ دونوں شادی شدہ۔ ایک ملک سے باہر ہوتی ہے، ایک یہیں۔ انہیں شادی بھی بس مہینہ ڈیڑھ میں چاہیے لڑکا اکیلا ہے تو گھر چلانے کا مسئلہ ہے۔" زینب رک رک کر تفصیل بتانے لگی۔
"اس لحاظ سے تو رشتہ بہت اچھا ہے۔" صالحہ جیسے خوش ہو گئیں۔
"میں اسی چکر میں دو گھنٹے پہلے اسکول سے آف لے کر آ گئی اور یہ کشف خدا جانے کہاں فون رکھ کر بیٹھ گئی ہے فون ہی نہیں اٹھا رہی۔" وہ جھلا کر پھر فون پر نمبر ملانے لگی۔
"بس اب فون ہی آف ہے یا تو بیٹری فارغ ہو گئی ہے یا۔" اسے خود بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کشف کے کال ریسیو نہ کرنے کی۔
"بجی کلاس میں ہو گی یا کسی اور کام میں مصروف ہو گی۔ آ تو جاتی ہے اپنے ٹائم پہ، تم کیوں پریشان ہو رہی ہو وہ مہمانوں کے آنے سے پہلے آ جائے گی۔" صالحہ اسے تسلی دیتے ہوئے کہنے لگیں۔
"کشف کے مزاج کا نہیں پتا موڈ بنے تو گھنٹوں لائبریری میں گزار دیتی ہے۔ انہوں نے پانچ بجے تک آ جانا ہے یونہی خدانخواستہ مجھے شرمندگی نہ ہو۔" زینب پریشانی سے بولی۔
"اللہ رحم کرے۔ تم حیدر کو کال کرو۔" صالحہ روانی میں بولتی ایک دم سے چپ کر گئیں۔
زینب بھی نظریں چرا کر تیزی سے کباب بنا کر ٹرے میں رکھنے لگی۔
"لاؤ، کچھ میں بھی مدد کر دوں تمہاری۔" اس خاموشی کو بھی صالحہ نے ہی توڑا۔
"بس بن گئے۔ یہ تو مہمان آئیں گے تو فراغی ہو جائیں گے چل کر ذرا ڈرائنگ روم کی حالت دیکھ لوں۔"

وہ ٹرے اٹھا کر فریج میں رکھنے لگی کہ اس کا فون بجنے لگا۔
''تھینک گاڈ! میرے خیال میں کشف کی کال آ گئی۔'' اس نے جلدی سے ٹرے رکھ کر فون اٹھایا۔
اس کے پبلشر کا فون تھا۔ وہ اس سے اپنی اگلی کتاب کے لیے معاہدہ کرنا چاہ رہی تھی۔ پہلے یہ سارے کام حیدر بھائی کرلیا کرتے تھے۔ اسے بھاؤ تاؤ، بھی کرنا نہیں آتا تھا مگر اب سب کچھ خود ہی کرنا ہوگا۔
وہ دل کو سمجھاتی آہستہ آہستہ فون پر بات کرنے لگی۔
صالحہ اٹھ کر باہر چلی گئیں۔

☆☆☆

بلال گاڑی بینک کے سامنے پارک کر کے رک کر فون پر آتی کوئی کال سنتے ہوئے رخ پھیر کر سڑک پہ بھاگتی ٹریفک کو سرسری نظر سے دیکھنے لگا۔
دوسرے لمحے اس کے کان سے لگا فون چھوٹ کر نیچے گرنے لگا جسے اس نے بے خیالی میں دوسرے ہاتھ سے سنبھالا۔
گاڑی میں کشف ہی تھی جو باہر کی طرف دیکھ رہی تھی اور ڈرائیونگ سیٹ پر ڈاکٹر موحد تھا۔ گاڑی بالکل اس کے قریب سے گزری تھی وہ ساکت کھڑا رہ گیا۔
تو کشف کی بیزاری، غصے اور نفرت کی وجہ یہ تھی۔
دوسرے لمحے اس کا دماغ سلگنے لگا۔
اسی لیے وہ یوں کھڑے کھڑے مجھے ریجیکٹ ہی نہیں کر کے گئی۔ میری توہین کرتے ہوئے اس نے ایک لمحے کے لیے بھی ہماری اتنی پرانی دوستی کی پروا نہیں کی تو وجہ یہ تھی۔
اس کے دل دماغ میں جیسے دھواں سا بھرنے لگا۔
وہ بھول گیا کہ وہ یہاں کس کام کے لیے آیا تھا۔
دوبارہ گاڑی میں بیٹھ کر بغیر کچھ سوچے وہ چلا گیا۔ اسے ابھی جا کر کشف سے پوچھنا تھی اس بے وفائی کی وجہ!
لمحہ بہ لمحہ اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

''آپ کو مجھے روکنا چاہیے تھا پاپا۔'' وہ عجیب مضطرب سے لہجے میں جس میں فقط پشیمانی تھی۔ پوچھ رہی تھی۔
''تم رک جاتیں؟'' وہ تحمل سے بولا۔
''آپ زبردستی روکتے نہ جانے دیتے مجھے۔'' وہ اسی اضطراب میں انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولی۔
''زبردستی۔'' اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی دہرایا۔ جس کا ایک بار میں پہلے بھی نتیجہ دیکھ چکا تھا۔''
وہ یہ بات ایما کے سامنے دہرانا نہیں چاہتا تھا جانے کیسے اس کی زبان پھسل گئی۔
''تم نہ بھولتے ہو نہ معاف کرتے ہو منصور احمد! معاف کرنا، بڑا کینہ بھرا ہے تمہارے دل میں۔'' ایک کے بعد دوسرا سوٹ کیس بھر بھر کر کمرے سے باہر لاؤنج میں دھکیلتی زریں اس کی پشت پر رک کر نفرین بھیجنے والے انداز میں بولی تھی۔ آواز صرف اتنی تھی کہ منصور ہی سن سکے، وہ اپنی جگہ سُن ہو گیا۔
وہ پلٹ کر اس سے یہ بھی نہیں کہہ سکا کہ کینہ تو اس نے برسوں سے اپنے سینے میں چھپا رکھا تھا۔
آج ہی تو اس کی اصل شکل دیکھی ہے منصور نے۔
مگر یہ ایک لاحاصل بحث تھی۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے جتنی نفرت کرتے تھے اتنی ظاہر نہیں کر پاتے تھے اور اس میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔
منصور نے کئی بار سوچا۔ وہ چپکے سے کسی رات یہاں سے نکل جائے مگر زریں کو بھی شاید اس بات کا خدشہ تھا۔

اس نے کئی دن پہلے سے منصور کا پاسپورٹ اپنے قبضے میں کرلیا تھا۔

''اب تو اسے پاگل پن کے دورے بھی نہیں پڑتے۔'' وہ واپس کمرے میں جاتی زریں کی پھیلی ہوئی پشت کو دیکھ کر تلملا کر رہ گیا۔

''وہ سارے دورے ایک جھوٹا ڈرامہ ہوتا تھا بس۔'' وہ نفرت سے منہ پھیر کر رہ گیا۔

''پاپا! مجھے آپ لوگوں کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا ناں۔'' ایما اپنے آنسو صاف کرتی معلوم نہیں کس خیال میں گم بولی تھی۔

''ہو گیا ایما! جو ہونا تھا۔'' وہ سخت اکتاہٹ سے بولا۔

کاش کسی طرح میں اپنا پاسپورٹ اس گھٹیا عورت کے قبضے سے نکلوا پاتا۔ وہ دل میں بل کھا رہا تھا۔

''صرف اس لیے پاپا! کیونکہ مما نے ہمیشہ آپ کی تذلیل کی۔ آپ کو استعمال کیا، جہاں انہیں آپ کی ہمدردیاں حاصل کرنی ہوتی تھیں۔ وہ مظلوم بن جاتی تھیں۔ ان کے نزدیک آپ کی حیثیت شوہر سے زیادہ ایک خریدے ہوئے غلام کی سی تھی تو پھر میں آپ کی باپ کی طرح ریسپیکٹ کیسے کرتی۔''

منصور کے لیے ایما کی باتوں میں کچھ بھی نیا نہیں تھا مگر پھر بھی وہ بظاہر دلچسپی سے سن رہا تھا۔

''ایک گھر کو بنانے میں اور توڑنے میں ایک ماں، ایک بیوی کا رول ہوتا ہے اور ہماری ماما سوری پاپا مجھے نہیں پتا ان کے ہاتھ میں آپ کی کون سی کمزوری تھی کہ آپ نے اپنی سیلف ریسپیکٹ ان کے پیروں میں رکھ دی، آپ نے غلط کیا پاپا! آپ کو یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' وہ خلا میں دیکھتی کھوئی کھوئی سی کہے جا رہی تھی۔

''اچھا تو کیا کرتا اپنی عزت نفس کی تلوار لے کر کھڑا ہو جاتا تو یہ گھر جو اتنے سال کھڑا رہا شاید بہت پہلے اپنے قدموں پر گر کر ٹوٹ پھوٹ چکا ہوتا۔'' وہ تنک کر جواباً بولا۔

''تو اب کون سا سلامت ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔

وہ کوئی سخت بات کہتے رک گیا۔

ایما کی ذہنی حالت اتنی اچھی نہیں تھی ابھی کہ اس سے ہر بات کہہ ـــــ دی جاتی۔

''ارے واقعی، ازاٹ کنفرم ان بلیو ایبل صوما! رئیلی یو آر گریٹ سو کانگریٹ آف یو، مائی فرینڈ! لو یو ڈیئر۔'' زریں اونچا اونچا جوش میں بولتی فون پر کسی سے کہتی ان کے پاس آئی تھی۔

''کانگریچولیشنز میرو ڈارلنگ! ہماری ٹکٹس کنفرم ہو گئی ہیں، آئی ایم سو ہیپی۔ کل رات گیارہ بجے کی فلائیٹ ہے ہماری۔'' وہ باری باری دونوں کے گلے لگ رہی تھی۔

وہ دونوں چہروں پر بے جان تاثرات لیے اسے دیکھ رہے تھے۔

''ایما میری جان! تم خوش نہیں ہوئیں۔''

وہ اس کے دونوں رخساروں پر چٹ چٹ پیار کرتی شکایتی لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

''ہم موحد کے پاس جا رہے ہیں، یور ڈارلنگ برادر۔'' وہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر جذباتی پن سے ایما سے کہنے لگی تو منصور کو اس کی اتنی اچھل کود بھری خوشی کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

وہ کچھ بھی کہے بغیر اٹھ کر باہر نکل گیا۔

آگے کیا ہونے والا تھا۔ اس کا ذہن کچھ بھی سوچنے سے قاصر تھا۔ اس نے خود کو حالات کے حوالے کر دیا تھا، اب اس کے اختیار میں شاید کچھ بھی نہیں تھا، سو مزاحمت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

وہ کمرے میں آ کر اپنی الماری سے ضروری چیزیں نکال کر ایک بیگ میں رکھنے لگا۔

یہ تو طے تھا۔ اسے اب واپس نہیں آنا۔ زریں اور ایما شاید لوٹ آئیں اور ساتھ میں اس کا وہ گھمنڈی بدتمیز

بیٹا بھی..... لیکن میر منصور یہاں واپس نہیں آئے گا۔
اور مجھے تو خوش ہونا چاہیے۔ میں اس چڑیل کے چنگل سے آزادی پا رہا ہوں۔ وہاں زینب ہوگی، میری زمین، میری دنیا، میرے اپنے جن کے لیے میں نے پردیس میں ہزاروں کالی راتیں کاٹی ہیں۔"
وہ خود کو تسلی دیتے دیتے بہل ہی گیا۔ اب اس کے ہاتھ تیزی سے چیزیں سمیٹ رہے تھے۔

☆☆☆

کشف نے بے بس و پریشان نظروں سے ساتھ کھڑے موحد کو دیکھا۔ اس نے زینب کی بار بار کال آنے پر فون فی الحال بند کر دیا تھا۔
مگر اس دل دماغ کا کیا کرتی جو کسی بھی طرح اس نے فیصلے کی حمایت نہیں کر رہا تھا جو اس نے موحد کے سمجھانے اکسانے اور کچھ ماں باپ کی ضد میں آ کر کر تو لیا تھا مگر اسے عمل کرنا پل صراط پہ چلنے کے برابر لگ رہا تھا۔
"ابھی بھی ڈیل مائنڈڈ ہو۔" موحد نے سرگوشی میں پوچھا۔
وہ فقط اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔
"تو نہیں کرتے پھر۔" وہ کچھ ترشی سے بولا۔
کشف ڈر سی گئی۔ "اگر موحد بھی ناراض ہو گیا..... ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا یہاں سے۔" اس نے کشف کے تذبذب پر آخری دھمکی یہی دی تھی کہ اگر وہ ابھی اس نکاح کے لیے راضی نہیں ہوتی تو وہ ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ کر اس ملک سے ہی چلا جائے گا۔
"تو چلا جائے۔" خفا خفا سے دماغ نے نخوت سے کہا۔
"کیا میں موحد سے اتنی محبت کرنے لگی ہوں کہ اپنی فرشتوں جیسی معصوم، محبت کرنے والی ماں کو دھوکا دینے جا رہی ہوں۔" دل میں بھی لہر سی اٹھی۔
"اگر ہم..... آپ ایک بار آنی سے بات کر لیتے۔" اس نے دبی آواز میں گویا التجا کی۔
"تو اتنی دیر سے میں تمہیں کیا سمجھا رہا ہوں کہ وہ کبھی نہیں مانیں گی اور وہ شخص جوان کی بیک پر ہے، کشف وہ کبھی ہمیں ایک نہیں ہونے دے گا۔"
وہ مضطرب انداز میں پشت پر ہاتھ باندھے ٹہلنے لگا۔
اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ کی چھت بھی کافی نیچی تھی یا موحد کا قد اتنا لمبا تھا کہ وہ اس کے سر کو جیسے چھونے کو بے قرار ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے پروقار سراپے کی پشت کشف کو بے قرار کرنے لگی۔
"اگر یہ بھی مجھے چھوڑ کر چلا گیا....." وہ تڑپ کر رہ گئی۔
"بلال اور ثمینہ آنٹی کو بھی پتا چلے کہ میں اتنی بھی لاوارث نہیں ہوں یا اتنی بری نہیں ہوں کہ کوئی مجھے قبول نہیں کرے گا۔"
اس کے اندر کی سرکش لڑکی نے ہنکارا بھرا۔
"کشف! آئی پرامس، میں بھی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ تمہاری ماں، تمہارے ہر رشتے کے سامنے تمہاری ڈھال بنوں گا۔ تمہارے ساتھ کھڑا ہوں گا..... اگر مجھے یہ سب جلدی نہ کرنا ہوتا تو میں آنی کی رضامندی کا بھی ویٹ کر سکتا تھا۔"
وہ اس کرسی جس پر وہ بیٹھا تھا اس کے بازو کو تھامے رک رک کر اسے پھر سے یقین دلانے لگا۔
"بلیوی! منصور احمد آنی سے کانٹیکٹ میں ہے۔ وہ کبھی ہم دونوں کو ایک نہیں ہونے دے گا۔ اس کی وجہ سے میں نے اپنا باپ کھویا، اپنی ماں کو کھویا، اپنا بچپن، اپنی بہن کو کھویا۔ یہ ڈاکٹری کی تعلیم میں نے پارٹ ٹائم جاب کر کے،

ہوٹلوں کے واش رومز صاف کرتے، ایک ایک پیسے کو بچانے کے لیے فٹ پاتھ پر رہ کر حاصل کی جبکہ میرے نانا اور میرے پاپا لاکھوں، کروڑوں کے مالک تھے، جن پر اس شخص نے میری ماں کے ذریعے قبضہ کرلیا۔"

اس کی آواز جذبات سے بھاری ہو رہی تھی اور کشف کا دل جیسے ڈوبا جا رہا تھا۔

بالکل اس کی طرح چیزوں کو اور باپ کی محبت کو ترسنے والا بچپن تھا موحد کے پاس۔

لیکن میرے پاس میری آنی کی محبت تو تھی۔ بے لوث محبت۔

"لیکن میں تمہیں، اپنی محبت کو نہیں کھونا چاہتا۔ اس شخص کی وجہ سے میں نے پچھلی زندگی، ہر جذبے سے خالی گزاری لیکن تم تو میرے دل کی پہلی اور آخری آرزو ہو کشف! اگر تم بھی مجھے نہ ملیں تو شاید پھر اس دل میں کبھی کوئی خواہش نہ ابھرے یا ہو سکتا ہے....."

وہ رکا تھا سانس لینے کو۔ کشف دھڑکتے دل سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہ دل ہی چپ ہو جائے ہمیشہ کے لیے، بند ہو جائے۔ میں خود اس کا گلا گھونٹ دوں۔ خود کو ختم کرلوں۔ اگر تم مجھے نہ مل سکیں تو....."

وہ جھٹکے سے کھڑا ہوا اور دور جا کر رخ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔

کشف کے دل کو کچھ ہوا۔

"میں راضی ہوں۔ موحد! آپ کے ساتھ رہوں گی ہمیشہ۔" اس نے پیچھے سے آ کر کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھ دیے۔

موحد کے لبوں پر مدھم سی آزردگی لیے مسکراہٹ ابھری اور دوسرے لمحے وہ بھی بجھ گئی۔

☆☆☆

"آپ کی اجازت ہو اگر انکل!" سلیمان نے فرماں برداری سے تھوڑا سر جھکا کر آزر سے کہا۔ وہ گاڑی سے سامان اتروا رہا تھا۔

آزر کا دل خوش ہو گیا۔ کیسا سعادت مند داماد ملا ہے اسے۔

"بیٹا! اب سچ تو یہ ہے کہ ردا پر ہم سے زیادہ تمہارا حق ہے۔ تم اس کے شوہر ہو۔ مجھے تو واقعی میں کوئی اعتراض نہیں۔" آزر نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"بس یہ عورتوں کی پسماندہ ذہنیت ہے۔ تمہاری آنٹی کا بھی کوئی مسئلہ نہیں اماں جان تھوڑے پرانے خیالات کی ہیں تو انہیں شاید اچھا نہ لگے۔ بٹ اینی وے....." اس نے خود ہی سر جھٹکا۔

"تم جاؤ، ردا سے جتنا ٹائم لینا چاہو بلکہ تم نے ڈنر ہمارے ساتھ ہی کر کے جانا ہے۔ میں شائستہ بہن کو بھی کال کر کے بلوا لیتا ہوں۔ آ جاؤ اور پہلے ایک ایک کپ کافی کا تو ہو جائے۔ یہ شاپنگ تو نرا سر درد ہوتا ہے۔ بھئی ان عورتوں کی ہمت ہے جو یہ اس کام کو اتنی خوشی خوشی انجام دیتی ہیں۔" آزر خوش مزاجی سے بولتا ہوا اندر کی طرف بڑھ گیا۔

سلیمان کسی گہری سوچ میں گم اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ حمزہ اس کے قریب سے گزر کر باہر گیا۔ سلیمان کو دیکھ کر وہ لمحہ بھر کو رکا پھر سر جھٹک کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم ردا!" سونیا کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ اس کی رنگت لمحہ بھر میں سفید لٹھے جیسی ہو گئی۔

"سلیمان کو اس خبیث کے بارے میں کس نے بتایا..... تم نے....." وہ آخر میں چیختی ہوئی ردا پر جھپٹی تھی۔

"نہیں..... نہیں مما! میں کیوں بتاؤں گی اور پھر ایسی بات جب میں گھر میں اکیلی تھی اور وہ آیا تھا۔" ردا کے منہ سے خوف میں نکل گیا جو شاید وہ سونیا سے کبھی شیئر نہیں کرتی۔

''کب..... کب..... تم اکیلی تھیں اور وہ کب یہاں آیا تھا۔'' سونیا سخت متوحش ہوئی۔
تو طاہرہ بیگم ٹھیک کہتی ہیں، اسے ہی اپنے بچوں کی ڈھنگ سے تربیت کرنی نہیں آئی۔ وہ ایک غافل لاپروا ماں ہے بس۔
سونیا کو شدت سے رونا آنے لگا۔
''جس روز آپ لوگ سلیمان اور ان کی فیملی کو ریسیو کرنے ایرپورٹ گئے تھے تو.....'' ردا نیچی کمزور آواز میں آہستگی سے کہنے لگی۔
''اس دن جب.....'' سونیا جیسے کچھ یاد کرنے لگی۔
''تمہاری گردن پر زخم آیا تھا۔ اسی روز ناں۔'' اسے اگلے لمحے یاد آ گیا تھا۔ ردا سر ہلا کر رہ گئی۔
''میرے خدا اب کیا رہ گیا ہے دکھانے کو۔ کیا کیا تھا اس نے تمہارے ساتھ..... بولو.....'' وہ اسے دونوں ہاتھوں سے جھنجوڑنے لگی۔
ردا نے بے اختیار نفی میں سر ہلاتے خود کو چھڑایا۔
''آپ کی قسم مما! میں نے اپنی جان لینے کی کوشش کی مگر اسے خود کو چھونے نہیں دیا۔ میرا یقین کریں مما.....!''
وہ آنکھوں میں آنسو لیے مظلوم لہجے میں بولی۔
''پوری..... پوری بات بتاؤ۔ مجھے کیا ہوا تھا..... کیوں آیا تھا وہ یہاں..... اور تم نے مجھ سے کیوں چھپایا اور سلیمان کو یہ سب کس نے بتایا۔''
سونیا ایک ہی سانس میں، ایک کے بعد دوسرا سوال کرتی چلی گئی۔ اس کے دل میں بے تحاشا خوف بھر گیا تھا۔
''اور کیا یہ..... سب کچھ نکاح کے بعد ہی ہونا تھا۔'' وہ اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے بڑبڑائی۔
''تم ابھی بھی اس سے رابطے میں ہو۔'' سونیا جیسے پاگل سی ہو گئی تھی۔ ایک سوال کا جواب ابھی ردا دیتی نہیں تھی، وہ اگلا سوال جڑ دیتی۔ اسے سخت پریشانی لگ گئی تھی۔
''نہیں..... نہیں مما! خدا کی قسم، میں نے تو کئی مہینوں سے، جب سے آفس چھوڑا، میں نے کبھی اس سے بات نہیں کی۔'' وہ ڈر کر قسمیں کھانے لگی۔
''تو اس کو تمہارے رشتے کا، سلیمان کا کیسے پتا چلا۔''
''میں نہیں جانتی..... مجھے نہیں پتا۔'' وہ اب باقاعدہ رونے لگی تھی۔
''تو سلیمان کو یہ سب کس نے بتایا؟'' سونیا جیسے تھک سی گئی۔
''فرحان نے.....'' ردا سر جھکا کر ٹوٹی آواز میں بولی۔
اور سونیا پھٹی پھٹی آنکھوں سے ردا کو دیکھنے لگی، جیسے ردا نے کسی کے مرنے کی خبر سنا دی ہو۔

☆☆☆

دونوں کا نکاح ہو رہا تھا۔
کشف نے کبھی زندگی میں نہیں سوچا تھا کہ اس کا نکاح اس طرح سے بھی ہو گا۔
وہ گھر کے معمولی کپڑوں میں ہو گی، بغیر کسی میک اپ، زیور، کسی بھی تیاری کے بغیر۔
اور اس سے بھی بڑھ کر اس کے نکاح میں ''آنی'' کہیں بھی نہیں ہوں گی۔
یہ خیال آتے ہی اس کا دل پھٹنے لگا۔
موحد کے مضبوط سہارے، اس کے وعدے، قسمیں سب اپنی جگہ مگر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مضبوطی سے کھڑی تھی کہ وہ بہر حال آنی کو، اپنی ماں کو دھوکا دے رہی ہے۔

نکاح میں ایجاب وقبول کے بعد نکاح نامے کے پیپرز پر سائن کرتے ہی اس کو لگا جیسے اس نے اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیے ہیں۔
اس کی ہتھیلیاں پسینے سے تر ہو گئی تھیں۔
اور دل یوں بھاگ رہا تھا جیسے کوئی ٹرین کا ڈبا بگٹٹ بھاگا جا رہا ہو۔ اسے لگا وہ ابھی چند لمحوں میں مر جائے گی۔
موحد اپنے دو کولیگز سے گلے مل رہا تھا، جو اس ارجنٹ نکاح کے لیے فوراً بلائے گئے تھے۔
چند لمحوں میں نکاح خواں، دونوں گواہ اور موحد کا ملازم، سب موحد کے اپارٹمنٹ سے جا چکے تھے۔
کشف دھڑکتے دل کے ساتھ سر جھکائے ساکت بیٹھی تھی۔
باہر جانے والوں کو الوداعی کلمات کہتی آوازیں مدھم ہوتے بالکل ختم ہو گئیں۔
موحد کے بھاری قدم اب واپس اس کمرے کی طرف آ رہے تھے۔
اور کشف کو لگ رہا تھا، اس کے بھاری بوٹوں کے نیچے کہیں اس کا دل، اس کا کمزور وجود بھی آ گیا ہے۔
موحد کے قدم عین اس کے پیچھے آ کر رک گئے۔
''کشف!'' اس نے بھاری گمبھیر لہجے میں اسے پکارا۔
وہ اسی طرح ساکت بیٹھی رہی۔
موحد کا بھاری ہاتھ اس کے جھکے ہوئے کندھے پر آ رکا۔
اور کشف کو لگا جیسے اس کا کندھا کسی پہاڑ کے نیچے آ گیا ہو۔ اگلے پل موحد نے دونوں ہاتھوں سے اس کو بیٹھے بیٹھے اپنی طرف گھما لیا تھا۔
ہاں اب اس کے پاس وہ طاقت آ گئی تھی جب وہ اسے جہاں چاہتا، جس طرف چاہتا گھما سکتا تھا۔
دونوں کے چہرے ایک دوسرے کے روبرو تھے۔
''نکاح مبارک ہو کشف!''
وہ اس کے جھکے چہرے پر سرد نظریں جمائے بولا۔
''آج کا دن میری زندگی کا یادگار دن ہے۔ جس کا شاید مجھے صدیوں سے انتظار تھا۔'' کشف نے بے اختیار سر اٹھا کر دیکھا تو لمحہ بھر کو موحد کا چہرہ اس کی پہچان میں نہیں آ سکا۔
وہ ششدر سی اسے دیکھے جا رہی تھی۔

☆☆☆

کشف گھر کے کھلے دروازے سے اندر آئی تو ڈرائنگ روم سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔
وہ اس وقت کسی کا بھی سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔
آہستگی سے بے آواز قدموں سے چلتی اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔
''او کشف! کمال ہے بیٹا! تم کہاں رہ گئی تھیں۔ تمہارا فون بھی آف تھا۔ کتنا میں پریشان ہوئی ہوں تمہاری وجہ سے، آؤ اب اندر۔''
زینب ایک دم سے پیچھے سے آئی تھی۔ اونچی آواز میں کہتی وہ خود ہی اس کے کندھے سے بیگ اتار کر ایک طرف ڈالتی، اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے جانے لگی۔
''آئی پلیز۔ مجھے اس وقت کہیں نہیں جانا۔'' وہ جز بز ہوئی۔
''میری جان! جانا کہیں نہیں ہے، کسی سے ملنا ہے۔'' زینب کے لہجے میں لگاوٹ تھی۔
کچھ تو غیر معمولی پن تھا ورنہ جس طرح کشف نے فون بند کر رکھا تھا اور معمول سے لیٹ بھی آئی تھی گھر تو

''میرا خیال ہے، ہم دونوں کو بھی چلنا چاہیے۔'' آذر کھڑا ہو گیا۔
سونیا صرف سوالیہ نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔
''سلیمان میرے ساتھ ہی گھر واپس آیا تھا، اسے شاید ردا سے کوئی بات بھی کرنی تھی۔'' دروازے کے قریب آتی رداد ہیں ٹھٹک گئی۔
''آں..... اچھا..... پتا نہیں۔'' سونیا نے نظریں چرائیں۔
''شائستہ بہن کی طبیعت خراب ہو گئی، میں نے انہیں ڈنر کے لیے کال کی تھی، وہی ان کا بی پی شوٹ کر گیا۔ میڈیسن لینے کے باوجود بھی شاید کنٹرول نہیں ہوا۔ سلیمان سنتے ہی فوراً چلا گیا تو ہمیں بھی جانا چاہیے ان کو دیکھنے کے لیے۔ ہو سکتا ہے سلیمان کو ہماری ضرورت ہو۔''
آذر نے بیٹی کے باپ کی حیثیت سے موقع کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے کہا۔ سونیا الجھن میں پڑ گئی۔
''اگر ان کو وہاں دیکھ کر سلیمان نے سارے لحاظ ختم کر کے ان سے پوچھ لیا فرحان کے بارے میں تو معاملہ بگڑ نہ جائے۔'' وہ سوچنے لگی۔
''بلکہ میرا تو خیال ہے، ردا کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔ شائستہ کو اچھا لگے گا، ردا کا یوں خیال کر کے آنا۔'' آذر کو دوسرا خیال آیا۔
''نہیں نہیں..... ردا کو رہنے دیں۔ اماں جان ہی ناراض ہو جائیں گی۔'' سونیا جلدی سے بات بنا کر بولی۔
''میں کر لوں گا اماں جان سے بات، وہ منع نہیں کریں گی۔'' آذر مصر تھا۔
باہر کھڑی ردا کو اور بھی خوف محسوس ہونے لگا۔
اگر سلیمان سے اس کی بات نہیں ہوتی، یہ وقفہ طویل ہو گیا تو شاید اس کا دل ہی بند ہو جائے گا۔
ان تین چار گھنٹوں میں اس کی جو حالت ہو چکی تھی، شاید مرنے کے قریب تو مزید پوری رات وہ اس سولی پر لٹکے نہیں گزار سکتی تھی۔ لیکن وہ سلیمان کا سامنا بھی نہیں کر سکتی تھی۔
''نہیں آذر! میرے خیال میں یہ مناسب نہیں کہ ردا ساتھ جائے۔ ابھی جا کر ہم دونوں دیکھ لیتے ہیں اگر خدانخواستہ کچھ مسئلہ زیادہ ہوا تو پھر ردا بھی چلی جائے گی۔'' سونیا نے حتمی انداز میں کہا۔
''چلو ٹھیک ہے، اماں جان کو بھی ابھی نہیں بتاتے۔ ہم کچھ دیر میں دیکھ کر واپس آ جائیں گے۔ مجھے واپسی پر ہوٹل بھی جانا ہے، کچھ پے منٹ کرنے کے لیے اور ایک دو معاملوں کو دیکھنے کے لیے۔ جوان بیٹے کے ہوتے سارے مسئلے مجھ اکیلے کو دیکھنے پڑ رہے ہیں، ایسی اولاد سے تو.....''
وہ کچھ سخت بولنے سے رکا اور باہر نکل گیا۔
ردا پیچھے ہی مڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

وہ کیوں جاگ رہا تھا۔ اب تو اسے سو جانا چاہیے تھا۔ وہ عین اس کرسی کے سامنے بیٹھا تھا، جہاں شام میں کشف نکاح کے وقت اور اس کے بعد بھی بیٹھی رہی تھی۔ یہاں سے چلے جانے تک.....
''مجھے اسے نہیں جانے دینا چاہیے تھا۔ روک لینا چاہیے تھا۔ زیادہ نہیں بس آج کی رات کے لیے۔'' وہ مضطرب سا اس خالی کرسی کو کشف کے خیالی وجود سے بھر کر سوچے جا رہا تھا۔
''پہلے ہی قدم پر وعدہ خلافی کر لیتا تو وہ کیا سمجھتی مجھے..... کم از کم وہ نہیں جو سمجھ کر اس نے میرا ساتھ دینے کی ہامی بھری تھی۔''
وہ اب آنکھیں بند کیے کرسی پر ہولے ہولے جھول رہا تھا۔

ابھی تو رات نہیں ہوئی تھی مہر گہری شام رات کے اندھیرے میں منہ چھپانے کی تیاری میں تھی اور موحد کو لگ رہا تھا۔ اندر باہر گھور اندھیرا ہے، کالی رات ہے۔

وہ کالی رات جب وہ دیوانہ وار پولیس کی پیٹرولنگ کے ساتھ اس جگہ پہنچا تھا، جہاں کچھ دیر پہلے اس کے پاپا کی ڈیڈ باڈی تھی۔

اسے وہیں اسی جگہ ہونا چاہیے تھا، جہاں ان کے جسم سے بہہ نکلنے والا خون ایک چھوٹے سے تالاب کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

مگر وہ وہاں نہیں تھی۔ اس کے باپ کی ڈیڈ باڈی وہاں نہیں تھی۔

پھر وہ کہیں بھی نہیں ملی۔ لاکھ ڈھونڈنے پر بھی۔

اس کے مرے ہوئے باپ کا جسم نہ میت بنا، نہ اسے غسل دیا جا سکا اور نہ اس کے باپ کی کوئی قبر بنی۔

نہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔

اس کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ ایک ایسا گھاؤ جو اتنے سال گزر گئے اسے وقت بھر سکا نہ اس کی زندگی میں آنے والی کوئی بھی خوشی۔

اس کے باپ کی تو قبر نہ بن سکی لیکن اس گھاؤ کی اس کے وجود کے اندر بڑی پرانی قبر بن چکی تھی۔ اب تو اس قبر پر گھاس پھوس، لمبی لمبی جھاڑیاں اُگ آئی تھیں جنہیں وہ ہر اس وحشت کی گھڑی میں اکھاڑ دیتا جب بھی اسے یہ جان لیوا اندھیرا ستاتا جو اس رات اس ویران جنگل کے کنارہ پر تھا جب اس کے قتل ہوئے باپ کی ڈیڈ باڈی کھوجی تھی۔

وہ اندھیرا پھر آنے والے کئی سالوں میں کم ہونے کے بجائے بڑھتا چلا گیا۔

وہ آج بھی اس کے اندر باہر چھا رہا تھا۔

کسی دلدل کی طرح اسے اپنے اندر کھینچتا جا رہا تھا۔

اسے یقین تھا، کسی ایک روز وہ اس اندھیری دلدل کی ان دیکھی قبر میں اتر جائے گا۔ اس کی بھی ڈیڈ باڈی کسی کو نہیں ملے گی۔ وہ بھی کہیں نہیں دفنایا جائے گا، نہ اس کے مردہ وجود کو غسل دیا جائے گا نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ اس لیے جب بھی یہ کھا جانے والا اندھیرا اس کے اردگرد پھیلتا، وہ گمنام و گمشدہ موت کے لیے خود ہی رو لیا کرتا تھا۔

لیکن یہ آج اس نے کیا کیا۔ اپنے لیے ایک رونے والی، پیچھے رہ جانے والی کو اپنے ساتھ جوڑ لیا۔

اسے کشف کے ساتھ یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔

کیا معلوم اس کی موت آج رات ہی ہو جائے اور وہ ہوا میں کہیں تحلیل ہو جائے۔ اپنے باپ کی طرح تو پھر کشف کا کیا بنے گا۔ وہ کیسے لوگوں کو یقین دلائے گی کہ وہ ڈاکٹر موحد کی بیوہ ہے۔

"مائی گاڈ ــــ میں نے کیا کیا ــــ" وہ پاگلوں کی طرح کمرے میں ادھر سے اُدھر چلنے لگا۔

اور پھر بھاگتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

وہ کوشش کر رہا تھا۔ اس کے دماغ کی رگ پھٹ جائے گی۔ اگر آج ابھی اس کی سلیمان سے بات نہیں ہوئی۔

وہ کئی بار اسے کال اور میسج کر چکی تھی۔ وہ میسج دیکھ کر بھی جواب نہیں دے رہا تھا۔

بیل جا رہی تھی اور وہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔

"تو اس نے فیصلہ کر لیا ہے۔ مجھے جیتے جی قبر میں اتارنے کا۔"

تھک کر اس نے نتیجہ اخذ کر لیا جو پہلے ہی اس کا دل جانتا تھا۔
''تو پھر میں کیوں انتظار کروں کہ کوئی میری موت کا اختیار اپنی ہاتھ میں لے۔ میری زندگی کا فیصلہ دوسروں نے کیا۔ اپنی موت کا فیصلہ کم از کم میں خود کروں گی۔''
وہ فیصلہ کن انداز میں کھڑی ہو گئی۔
چند لمحے کچھ سوچتی رہی۔
پھر جلدی سے الماری سے اپنی سیاہ چادر نکال کر مایوں کے پیلے جوڑے کو اس میں چھپاتے ہوئے اچھی طرح سے اوڑھ کر دراز سے کچھ نکال کر مٹھی میں دبائی کمرے سے باہر نکل گئی۔
کچھ خیال آنے پر وہ مڑ کر آئی۔ ایک آخری نظر کمرے پر ڈالی اور کچھ سوچ کر کمرے کی لائٹ آف کر کے اس نے کمرے کی تاریکی کے حوالے کیا اور خود خاموشی سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

زینب اپنے سامنے بلال کو دیکھ کر لمحہ بھر کو ساکت رہ گئی۔
وہ سلام کر کے زینب کے پیچھے ہٹنے کا انتظار کیے بغیر اندر چلا گیا تھا۔
''کشف اسے دیکھ کر آؤٹ نہ ہو جائے۔'' زینب اسے اندر جاتا دیکھ کر بے بسی سے سوچتی رہ گئی۔
وہ تو خود حیدر سے رابطہ کرنا چاہ رہی تھی۔ خاص طور پر پبلشر والے معاملے کو سلجھانے کے لیے ـــــ لیکن اس دن جو کچھ ثمینہ آفس میں بول کر گئی تھی اور پھر جس طرح کشف نے آ کر اسے سختی سے منع کیا تھا کہ زینب آئندہ ان لوگوں کے ساتھ بات نہیں کرے گی تو اس نے بھی دل کو سمجھا لیا تھا۔
''اور اب یہ بلال آ گیا، اسے کیسے منع کروں۔''
وہ خود سے الجھتی دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی۔
بلال شاید صالحہ کے کمرے میں گیا تھا۔ وہ یہی سوچ کر کچن میں چلی گئی۔

☆☆☆

رمشا اپنا بارات میں پہننے والا ڈریس پہن کر اس کی فٹنگ چیک کر رہی تھی۔
وہ خود کو آئینے میں دیکھتی جیسے نہال سی ہو گئی۔
ایش گرے اور میرون کمبینیشن کے ساتھ خوب صورت ڈیزائننگ والا شرارہ اور شرٹ اس کی گوری رنگت پر بہت اٹھ رہا تھا۔
وہ ابھی دوپٹا لے کر سیٹ کرنے ہی لگی تھی کہ سونیا دروازہ کھول کر کچھ پریشان سی اندر آ گئی۔
''ماما! دیکھیں، کیسا لگ رہا ہے مجھ پہ یہ ڈریس۔'' وہ اترا کر ماں کے سامنے پورا گھومی۔
''ماشاء اللہ۔'' سونیا نے دیکھ کر نظریں پھیر لیں۔
رمشا اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ وہ اسے نظر بھر کر دیکھ بھی نہ سکی۔
''بہت اچھا لگ رہا ہے، اب چینج کر لو۔'' وہ سرسری لہجے میں کہہ کر بیڈ پر پڑے باقی کپڑے دیکھنے لگی۔
''یہ آپی کے دو سوٹ ہیں اور یہ کشف کا۔ میں نے سلوانا اور اس کا سیم لیا تھا۔ مختلف کلر کمبینیشن کے ساتھ۔ آپ اسے بھجوا دیں یا وہ شادی میں تو آئے گی ناں۔'' وہ اسی کمبینیشن اور کام والا لہنگا اور میرون کام والا سوٹ سونیا کو دکھانے لگی۔
''اچھا ابھی رکھو، دیکھتی ہوں۔ کیا کرنا ہے اس کا۔'' سونیا ٹالنے والے انداز میں کہہ کر ردا کے کپڑے اٹھانے لگی۔

''یہ آپی کو دکھا آؤں میں۔'' رمشا کا شاید ابھی چیخ کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔
''آپی..... لو۔'' سونیا نے بے اختیار ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''میں ردا کو تو بلانے کے لیے آئی تھی یہاں..... کہاں ہے وہ۔''
''آپی میرے روم میں تو نہیں آئیں، اپنے کمرے میں ہوں گی یا دادو کے پاس۔'' رمشا نے لاعلمی سے کہا۔
''اس کے کمرے کی تو لائٹ آف ہے اور اماں جان تو نماز پڑھ رہی ہیں۔ کچن اور لاؤنج میں بھی نہیں دیکھا میں نے اسے۔'' سونیا کچھ الجھ کر بولی۔
''میں چاہ رہی تھی، وہ شائستہ بہن کو فون کر کے ان کی خیریت پوچھ لے۔ اسی لیے اسے دیکھ رہی تھی، جاؤ بلا کر لاؤ۔ دیکھو حمزہ کے ساتھ نہ ہو اس کے کمرے میں۔''
سونیا جیسے تھک کر ایک طرف بیٹھ گئی۔
''حمزہ تو آج شام ہی باہر نکلا تھا اور کہہ کر گیا تھا مجھے کہ وہ رات شاید اپنے دوست کی طرف رکے گا۔ کمبائن اسٹڈی کے لیے۔''
رمشا نے رک کر کہا۔
''دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میں کیسے — اس کے مزاج درست کروں۔ یا اللہ! یہ شادی خیریت سے گزر جائے میں اس کی تو اچھی طرح سے طبیعت صاف کروں گی۔ فون دو مجھے، میں اسے کال کرتی ہوں اور تم جا کر ردا کو بلا کر لاؤ میرے پاس۔''
رمشا اسے فون دے کر باہر نکل گئی۔
سونیا حمزہ کو کال کرنے لگی۔ وہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔
دو تین بار کوشش کرنے کے بعد وہ تھک کر فون ہاتھ میں لے کر بیٹھی، کچھ سوچنے لگی۔
''مما! آپی کو میں نے پورے گھر میں دیکھ لیا، وہ کہیں بھی نہیں ہیں۔'' ذرا دیر میں رمشا کچھ بوکھلائی ہوئی آ کر اطلاع دینے لگی تو فون سونیا کے ہاتھ سے گر گیا۔
''کیا بکواس کر رہی ہو یہ۔ تم ہوش میں ہو ناں۔'' سونیا غصے میں کھڑی ہو گئی۔
''یقین کریں مما! میں نے سارا گھر دیکھ لیا ہے، ٹیرس اور لان بھی۔ وہ کہیں بھی نہیں ہیں۔'' سونیا پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

''تو یہ وجہ تھی تمہارے انکار کی؟'' بلال کشف کے سر پر جا کر چلایا۔ جو اپنے بیگ سے چیزیں نکال کر میز پر رکھ رہی تھی۔
''تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' وہ بے اختیار چونک کر پلٹی۔ دوسرے لمحے غصے میں بولی۔
''ہاں، اسی لیے تو تم نے مجھے رستے سے ہٹایا کیونکہ تمہارا دل بھر گیا تھا مجھ سے بلکہ نہیں اب دل بہلانے کے لیے ایک اور نیا اور قیمتی کھلونا مل گیا تمہیں، اس لیے ناں۔'' وہ اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ کر بولا۔
''بکواس بند کرو اپنی گھٹیا انسان!'' وہ غصے سے چلائی۔
''اور تم اس ڈاکٹر موحد کے ساتھ گل چھرے اڑاتی بڑا اعلا کام کر رہی ہو۔'' وہ بھی چلایا۔
اور باہر کھڑی زینب ساکت کھڑی رہ گئی۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

طیبہ عنصر مغل

مجھے پتھر کردو

میں بہت دیر سے شل دماغ کے ساتھ ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی تھی اور ماضی تھا کہ مجھے اپنی جانب کھینچے چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

کالے رنگ کے پھاٹک سے گزر کر اندر داخل ہونے پہ سامنے دورویہ اینٹوں کے درمیان اینٹوں

سے ہی بنی روش تھی جس کے دونوں اطراف کھلے کھلے سبزے والے باغ تھے۔ پھاٹک کے دونوں اطراف بوگن ویلیا کی بیل بہار دکھا رہی تھی تو دیوار کے ساتھ ساتھ لگے سرو کے پودے آنکھوں کو تراوٹ بخش رہے تھے۔ جس گرمی کا احساس لمبے سفر کے بیچ پریشان کرتا رہتا تھا۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی سر سبز لان کی بہار نہال کر دیتی تھی۔

سامنے ہی سبز جنگلے کے پرے ٹھنڈا طویل برآمدہ اور اس کے سامنے ترتیب سے بنے بے شمار کمرے اور کونے میں بنا وسیع باورچی خانہ بھری دوپہر میں صاف اور شفاف تھا۔ خاموشی بتا رہی تھی کہ جیسے گھر کے افراد نیند کے مزے لوٹنے میں مصروف ہیں۔ ہم نے ہولے سے دالان نما بڑے کمرے کا جالی دار دروازہ دھکیلا تو پنکھے کی اے سی جیسی ہوا نے سرشار کر دیا لیکن روشنی سے اندھیرے میں ہمارے پیر کے نیچے سے کسی کی سسکی ابھری تو میں خود بھی چونک پڑی۔

☆☆☆

"ہائے بھیا! کس نے ہماری ہڈی توڑ ڈالی ہے، اس بڑھاپے میں کہاں جڑنے کی اب یہ....." بوا خیرن کی آواز پہ لپک جھپک کسی نے بتی جلا دی، میں اور میرے پیچھے میری دونوں فالتو کی ہنسی نکالتی بہنیں ایک دم ہونق لگ رہی تھیں۔ بھیا تو باہر ٹیکسی والے سے زیادہ پیسوں پہ بحث میں ہی الجھے ہوئے تھے۔ اب اتنی گرمی میں اپنی ہی نانی کے گھر کے باہر کھڑے رہ کر کون انتظار کرتا، اوپر سے پھاٹک کھولنا ہمارے لیے کون سا مشکل تھا۔ اوپر کا کنڈہ تو ہاتھ ڈال کے کھولنے کی بچپن سے پریکٹس تھی اب اندر کے دروازے کس قدر لاپروائی سے کھلے رکھنے کا رواج تھا یہ سمجھ سے باہر ہی رہا لیکن ہر بار چھٹیوں میں ننھیال کا یہی ماحول دیکھنا پسندیدہ مشغلہ تھا اور یہ گھر صرف گھر نہیں ایک طلسم کدہ تھا جس میں داخل ہونے کو پورے سال گرمیوں کی چھٹیوں کا انتظار رہتا تھا

☆☆☆

گھر کا بنا فالسے کا شربت پیتے ہی جان میں جان آئی تو آہستہ آہستہ سب نے ملنا شروع کیا۔ نانو کی شفیق بانہوں میں امی کی خوشبو ملتے ہی امی کی یاد اتنی شدت سے آئی کہ آنکھ بھر آئی، ابھی تو چند گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے ان سے جدا ہوئے اور پھر لاہور سے پنڈی تک راستہ ہی کتنا تھا لیکن ماں تو ماں ہوتی ہے اس بار وہ ہمارے ساتھ نہیں آپائی تھیں کیونکہ ابو کی طبیعت ناساز تھی سو ہمیں ہمارے چاکلیٹی ہیرو جیسے بھیا کے ہمراہ بھیج دیا۔ کہیں بھی خوشی سے نہ جانے والے ہمارے اشعر بھیا نانو کے گھر بلاچوں و چراں چل پڑے تو اس کی وجہ کچھ تو خاص ہی رہی ہوگی تو آیئے اس وجہ خاص سے ملاتے ہیں آپ کو.....

☆☆☆

چار ماموں ایک ہی گھر میں رہائش پذیر تھے۔ تین امی سے چھوٹے اور ایک بڑے۔ سارے ماموں شادی شدہ اور صاحب اولاد تھے، سب کے ہاں ہر سائز کے بچے موجود تھے۔ بڑی اپیا عفت آرا سے لے کر گود کے گڈو میاں۔

اس بیچ ہماری ہم عمر سعدیہ، ثریا، عثمان، ہم سے بڑے سرمد، سعد کے ساتھ ہم سے چھوٹی معصومہ، مومنہ اور علی بھی تھے۔ ممانیاں سب طبیعتاً اللہ میاں کی گائے تھیں تو سلیقہ میں لاثانی بھی تھیں۔

لیکن ان سب میں چمکتا چاند تو ہماری گیتی آپا اپنے نام کی طرح ہی منفرد تھیں۔ چھوٹے ماموں کی سب سے بڑی صاحبزادی خدیجہ مستور کے ناول کا کردار لگتی تھیں تو کبھی فاطمہ بیجا کے ڈرامہ کی ہیروئن کی چھب نظر آتی تھیں۔

آداب و تسلیم سے بات کرنے والی یہ کزن ہمارے لیے افسانوی کردار کی طرح تھیں۔

☆☆☆

بچپن سے ہم ان کو کسی شہزادی کی سی آن بان میں دیکھتے آرہے تھے۔ گھر کے کاموں کو سلیقے سے نبٹاتے ان کے کپڑوں پہ نہ تو کوئی سلوٹ آتی نہ داغ بالکل ویسے جیسے ان کے چہرے پہ نہ کوئی داغ نہ سلوٹ، ریشمی گھنی زلفوں کی چوٹی کمر پہ ناگن کی طرح لہراتی، کالی چپل میں نفاست سے تراشے ہوئے صاف ستھرے ناخنوں والے سفید کبوتر جیسے پاؤں، کبھی قمیص شلوار تو کبھی چوڑی دار پاجامے کے ساتھ لمبی آستینوں والے لباس میں دمکتی سفید و گلابی رنگت پہ جگمگاتی سیاہ آنکھیں، جن میں ذہانت جادو بھرے رہتی تھی کبھی کبھی ہمیں وہ بھولی بھٹکی مغلیہ شہزادی لگتی تھیں۔

☆☆☆

سب سے مل چکے تو بھینی بھینی موتیے کی مہک قریب سے آنے پہ میں نے نانی کی گود سے سر نکالا تو نیم اندھیرے کمرے میں کسی چاند کی طرح روشن گیتی آپا اپنی ازلی خوب صورت مسکراہٹ لیے میری جانب بانہیں وا کیے کھڑی تھیں۔ ان کے گلے لگتے ان کے وجود سے اٹھتی خوشبو میرے حواسوں پہ یوں چھائی کہ میں ان سے الگ ہونا بھول گئی۔

''ارے مونی آپ نے کیا خوب قد کاٹھ نکالا ہے سولہ کا سن لگتے ہی، ہم تو آپ کو پہچان ہی نہیں پائے۔'' بڑی بڑی آنکھوں میں حیرانی سموئے وہ ہمیں خود سے الگ کر کے ہمارا بغور جائزہ لینے لگیں تو میں لجا سی گئی۔

بھیا جو ہمارے پاس ہی نانی کے خوب صورت تخت پہ براجمان تھے۔ آنکھوں میں محبت کے دیپ جلائے گیتی آرا کو دیکھ رہے تھے۔ گیتی آپا نے انہیں آداب کہا تو جواباً بھیا نے وعلیکم کہہ کر ہمیشہ کا انداز اپنایا۔

☆☆☆

''ارے اپیا، یہ اتنی پیاری بیڈ شیٹ کہاں سے لائی ہیں آپ؟'' ہلکے گلابی رنگ کی بیڈ شیٹ پہ ہوئی کڑھائی اور کروشیا نے غضب ڈھا رکھا تھا۔ اس کو سلیقے سے تہہ لگا کر اپیا نے ایک پیارے سے بیگ میں ڈالتے ہوئے مسکرا کر مجھے دیکھا۔

''میری گڑیا کو پسند ہے تو لے جاؤ، ہم اور بنا لیں گے۔'' وہ فراخ دلی سے بولیں۔

''ارے نہیں اپیا مجھے اور بنا دیجیے گا۔ میں تو سبھی بازار سے لائی ہوں گی۔ اتنی پیاری چیزیں آپ کیسے بنا لیتی ہیں؟'' میری آنکھوں میں حیرت تھی۔ میں گھر میں جا بجا بکھری ان خوشنما چیزوں کو حیرت سے دیکھتی۔ سلیقہ تو میرے خیال میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا لیکن گیتی اپیا کی لانبی فنکار انگلیوں نے تو در و دیوار کو سجا رکھا تھا۔

وال ہینگنگ سے لے کر میز پوش، تخت پوش ہر چیز میں ان کا ہنر بولتا تھا۔ گرمیوں کی لمبی دوپہروں میں گیتی اپیا یا تو گلدانوں پہ رنگ کرتی ملتیں یا فریم لگائے کڑھائی کر رہی ہوتی تھیں۔ گھر واپسی پہ ان کے سیے دیدہ زیب کرتے بھی ہمارے ہمراہ ہوتے۔ بھیا کی جیب میں کڑھائی والے رومال وسیع تعداد میں پائے جاتے

اگر اپیا گھر کے کسی کونے سے برآمد نہ ہوتیں تو ہمیں پتا ہوتا کہ وہ یقیناً گول زینے کے بیچوں بیچ نسیم حجازی کا کوئی ناول پڑھتی پائی جائیں گی۔

☆☆☆

بھیا کے چہرے کا رنگ آنکھوں میں کب ڈھل گیا یہ تو پتا نہیں تھا لیکن اس بار گیتی آپا کو ہونے والے تیز بخار نے میری آنکھیں بھی لال کر دیں۔ گیتی آپا کے چہرے کی پیلاہٹ میں ہمارے پڑوس میں رہنے والی جواں سال نیلم کا چہرہ سمانے لگا جو پچھلے برس کے بخار میں دنیا چھوڑ گئی تھی۔ اب نہ گیتی آپا کی کھلکھلاہٹیں تھیں اور نہ ہی بھیا کی سرگوشیاں، ادھر گیتی آپا کملائی بیمار پڑی تھیں ادھر بھیا بال بنانا بھی بھولے ہوئے تھے۔

☆☆☆

اس دن دوپہر کو جب سب سو گئے تو میں جو

جلے پیر کی بلی کی طرح گھر میں چپکے چپکے پھرا کرتی تھی اس وقت میں بھی نانی کی بغل سے ہولے سے نکلی۔ ان کے خراٹوں سے مطمئن ہو کر باہر نکل کر آئی تو برآمدے کے دوسرے کونے سے ہولے ہولے آتی سسکیاں مجھے گول زینے کی طرف کھینچ لے گئیں۔ تھوڑا سا جھانکنے پہ اشعر بھیا کی چوڑی پشت نظر آئی تو میرے بڑھتے قدم تھم سے گئے۔

"گیتی روئیں تو نہیں، آپ جانتی ہیں ابھی میں برسر روزگار نہیں ہوں۔ انتظار کرنے میں کوئی مضائقہ تو نہیں، جلد ہم ایک ہو جائیں گے۔"

"ہر بار آپ یہ دلاسا ہمیں دے جاتے ہیں۔ آخر کیا ضرورت تھی یہ لمبی پڑھائی کرنے کی۔ ایم اے کر لیا تھا، سیدھی سیدھی کوئی نوکری کرتے۔" گیتی آپا کی رسیلی آواز میں حزن گھلا ہوا تھا۔

"آپ ہی کے لیے سی ایس پی کا امتحان دینے چلے تھے۔ جانتی تو ہیں یہ آپ ہی کا تو خواب تھا جو ہم پورا کرنے چلے تھے۔" بھیا شکستہ لہجے میں بولے تو میرے دل کو کچھ ہوا۔

"یہ تاجور خالہ کو کیا سوجھی جو ولایتی بابو کا رشتہ آپ سے کرنے چلی ہیں اور آپ ہی سے کیوں؟ بڑے ماموں کی عفت آرا بھی تو ہیں۔"

"کیا آپ نہیں جانتے؟ کیوں اتنے بے خبر ہیں یا جان بوجھ کر ہمارے اس خانہ برباد حسن سے صرف نظر کر رہے ہیں۔ ہمارا تو یہ حسن ہی ہمارا دشمن نکلا۔ کبھی تو جی چاہتا ہے کہ ہم اپنا چہرہ نوچ لیں۔ خود ہی ولایتی بابو سیف الدین عرف سیفی رشتہ واپس لے لیں گے۔" آنسو گھلی آواز میں تلملاہٹ بھری تو ہمیں گیتی آپا پہ پیار آ گیا۔

"اچھا آپ روئیں مت، خدا خدا کر کے بخار اترا ہے۔ اب ہم جاتے ہیں کسی نے دیکھ لیا تو وبال بن جائے گی زندگی، محبت پردے میں رہے تو ہی پاکیزہ لگتی ہے ہم نہیں چاہتے وقت سے پہلے سب پر عیاں ہو۔" کہہ کر بھیا زینہ اترنے لگے شاید چند سیڑھیاں تھیں۔ اس سے پہلے کہ اشعر بھیا مجھے دیکھ لیتے میں دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔ بھیا سفید کرتے پاجامے میں ملبوس سرخ آنکھیں لیے زینے کے دروازے سے باہر نکل کر بیرونی گیٹ کی طرف چل دیے شاید گھر سے باہر جا کر تھوڑی دیر کو غم بھلانا ضروری ہو گیا تھا ان کے لیے، میں نے جھٹ سے زینے کی طرف قدم بڑھائے سامنے ہی چار سیڑھی اوپر بانہوں میں چہرہ چھپائے گیتی آرا بیٹھی تھیں آہٹ پہ سر اٹھایا۔

"ارے منیا آپ سوئی نہیں۔" لہجہ بھیگا بھیگا سا تھا دسمبر کہ جیسا نم اور اگست کی طرح حبس بھرا، محبت مگر ہر لفظ میں مہک رہی تھی۔

ہم یک ٹک گیتی آپا میں گیتی آپا کی نفاست ڈھونڈ رہے تھے۔ سب ویسا ہی تھا بنا سلوٹ کے کپڑے بغیر الجھن کے سلجھے ہوئے بال اور بالوں میں بس آج موتیے کے گجرے نہ تھے۔ سفید لباس پر بڑے سے دوپٹے کو کندھوں پہ پھیلائے گیتی آپا دوپٹی کی سیاہ چنل میں دو کبوتر لیے ویسی ہی حسین تھیں بس چہرے پہ خوف زدہ کر دینے والی زردیاں تھیں تو آنکھیں شدت گریہ سے لباس عروسی پہنے بیٹھی تھیں۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا، سیڑھیاں پھلانگ کر گیتی آپا کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

"گیتی آپا کیا اب ہمارے گھر میں چنبیلی، گلاب، موتیا نہیں کھلے گا، کیا میرے بھیا سے کوئی گناہ ہو گیا جو ان کو حور نہیں ملے گی۔ ہماری دادی تو یہی کہتی ہیں ہمیں جو مرد گناہ گار ہوتے ہیں ان کو حوریں نہیں ملا کرتیں، لیکن بھیا تو بہت نیک ہیں پانچوں وقت مسجد میں نماز پڑھتے ہیں۔ سب کا خیال رکھتے ہیں۔ جھوٹ نہیں بولتے، کسی کا دل نہیں دکھاتے تو پھر آپ کو تاجور خالہ کے گھر نہیں ہمارے گھر ہونا چاہیے، سیفی بھیا تو اشعر بھیا سے بالکل مختلف ہیں۔" میں بولے جا رہی تھی اور گیتی آپا ہمیں

یک ٹک دیکھے جا رہی تھیں۔

''شاید کرتے ہیں گناہ، دل توڑنے کے، جھوٹ بولنے کے گناہ گار ہیں آپ کے بھیا۔'' یہ کہہ کر گیتی آپا اٹھیں اور تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی تھیں۔

پھر کچھ بھی کام نہ آیا۔ ہم تو لاہور واپس آ گئے، اماں ابا کے راولپنڈی کے چکر بڑھ گئے اور بھیا نے ایک مقامی کالج میں نوکری بھی کر لی لیکن بدیسی ایک بار پھر کوہ نور چرا کر لے گئے دل تو بہت ٹوٹے لیکن میرے اندر بسی گیتی آرا مجھ میں ہی ڈھل گئی۔ میں نے اپنے آنگن میں موتیا چنبیلی گلاب اگا لیے۔ دوپٹی کی چنل پہننے لگی سرتاپا گیتی آرا بن گئی۔ پورے گھر میں میرے سلیقے کی جھلک تھی۔ میرے لباس پہ کبھی شکن نہ ہوتی شکل وصورت تو یوں بھی گیتی آرا کی ہماری اماں جیسی تھی اور ہم بھی اماں ہی کا پرتو تھے۔ سرمد کا رشتہ جب ہمارے لیے آیا تو ہم نے بھیا کی آنکھوں کا زخمی پن دیکھ لیا تھا۔ اس لیے انکار کر دیا لیکن وہ بھی ہمارے بھیا تھے نہ صرف ہاں کہہ دی بلکہ عفت آرا کے لیے رشتہ بھی بھجوا دیا۔ یوں ہم سرمد کے ہو کر چند دن ہی اس طلسم کدے میں رہ سکے جہاں کے پھول پھل خزاں کی نظر ہو چکے تھے۔ گیتی جو دور ولایت میں بس گئی تھیں اور سرمد جو آری میں تھے ہم ان کے ساتھ خانہ بدوش ہو گئے۔ کبھی اس شہر تو کبھی اس شہر سفر کرتے زندگی کے پلوں کے نیچے سے ڈھیروں سال گزر گئے

☆☆☆

اتنے سالوں بعد آج ہم سب نانی کے گھر میں بیٹھے تھے جو نانی کے بعد بھی نانی کا گھر تو تھا لیکن نانی کے گھر جیسا نہ رہا تھا نہ وہ پھاٹک تھا نہ وہ نیم وا دریچے تھے۔ ایک عالی شان کوٹھی تھی، برآمدے کی سبز جالیاں تھیں نہ ان میں لٹکتے آب خورے تھے، نہ طوطوں اور چڑیوں کی چہچہاہٹ رہی تھی۔ ممانیاں نانی جیسی ہو گئی تھیں لیکن نانی کے جیسی حکمرانی ان کے نصیب میں نہ تھی۔ ان کی جگہ مختلف چہروں نے لے لی تھی کہنے کو میں بھی اس گھر کی بہو تھی لیکن میں ہمیشہ خانہ بدوش ہی رہی اگر سرمد نے چاہا بھی کہ اپنے شہر میں پوسٹنگ کروا لیں تو میں نہ مان سکی۔

مجھے زمانے کے بدلتے رنگ بدل نہ پائے تھے مجھے آج بھی میز پوش کے بغیر میز ادھوری لگتی تھی۔ کھلے صحن کے بغیر آکسیجن کم لگتی تھی۔

اور میری دیورانیوں کو میں اولڈ فیشن لگتی تھی۔ میرے بالوں میں لگے گجرے تازہ رہتے تھے اور اشعر بھیا جو عفت آرا کی ہم راہی میں خوش نہیں تو مطمئن و آسودہ تھے مجھے دیکھ کر اکثر ان کی آنکھیں دھندلا جاتی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں اترتے ملال کے موسم مجھے ندامت میں دھکیل دیتے تھے اسی لیے میں میکے بھی کم ہی جاتی تھی کیونکہ میں مونی اور گیتی کے درمیان کہیں کھو گئی تھی۔

لیکن آج ہم سب نانی کی چھت تلے ایک بار پھر جمع تھے کیوں؟

اس لیے کہ تاجور خالہ اپنے بیٹا بہو کے ساتھ سالوں سال بعد پاکستان آ رہی تھیں۔ میری دونوں بیٹیاں گیتی آرا سے ملنے کو بے تاب تھیں کیونکہ سب کہتے تھے کہ میں بنی بنائی گیتی آرا ہوں۔

☆☆☆

تاجور خالہ سے گلے ملنے کے بعد میں سیفی بھیا کے ہیلو ہائے کا جواب دے کر گیتی آپا سے ملنے کو بے تاب تھی جو باقی لوگوں سے مل کر میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ دور سے ان کے لباس سے اٹھتی خوشبو نے سارے کمرے کو مہکا رکھا تھا۔ وہ آج بھی اتنی ہی جوان اور بے تحاشا حسین تھیں لیکن مجھے کیا ہوا مجھے کیوں لگ رہا تھا گیتی سالوں پہلے مر گئی تھی یہ عورت تو کوئی اور ہے۔

تراشیدہ زلفوں کے ساتھ تیز بہت تیز خوشبو لگائے بے حد جاذب نظر لیکن بے تحاشا میک اپ کے ساتھ چست مغربی لباس میں دوپٹے سے بے نیاز دس انگریزی لفظوں کے درمیان چند لفظ بمشکل اردو کے ٹانکنے والی عورت گیتی آپا تو نہ تھیں۔ میں نے ان کے لیے بنائے موتیے گلاب سے گندھے

گجرے جب ان کی طرف بڑھائے تو انہوں نے بہت بے رحمی سے انکار کر دیا۔

"سوری ڈارلنگ، مجھے الرجی ہے ان سے۔"

کونے میں بیٹھے بھیا کے چہرے پہ ڈھیروں حیرت اتری تو ساتھ میں اطمینان بھی در آیا۔ انہوں نے محبت سے اپنی شریک حیات کی طرف دیکھا جس نے گیتی آراء بننے کی کوشش نہیں کی تھی تو عفت آرا کے روپ میں بھی وہ بہت اعتدال پسند اچھی بہو اچھی ہمسفر اور اچھی ماں ثابت ہوئی تھیں۔

☆☆☆

میں نے گھر پہنچ کر سکون کا سانس لیا۔ سارا گھر دھول میں اٹا پڑا تھا میں نے ملازم کو صفائی کے لیے ہدایات دے کر کچن کا رخ کیا لیکن آج کچھ بھی خود سے بنانے کی ہمت نہ تھی۔ خانساماں کو کھانے کی ہدایات دے کر کمرے میں آئی تو کھڑکی سے جھانک کر اپنے لان پہ نظر ڈالی۔ پودے کچھ سوکھے نظر آ رہے تھے لیکن آج جانے کیوں میرے اندر کی گیتی ان کو سنوارنے کے لیے آمادہ نہیں تھی۔ میں سستی سے بیڈ کی طرف بڑھی۔ آتا پاس میں ہی وہ بیگ رکھا تھا جو گیتی میرے اور میری سہیلی کے لیے گفٹس سے بھر کر لائی تھیں۔ میں نے بے دلی سے اس کی زپ کھولی تو اوپر ہی سیاہ جلد والی ایک ڈائری رکھی تھی۔ نیچے گفٹس کا ڈھیر تھا لیکن مجھے صرف اس ڈائری سے دلچسپی تھی آخر یہ ڈائری گیتی آپا نے مجھے ہی کیوں دی، یہ تو ان کی پرسنل ڈائری تھی جو وہ اکثر لکھتی نظر آتی تھیں۔

☆☆☆

بچے اسکول جا چکے تھے۔ سرمد کو لنچ پہ نہیں آنا تھا۔ میں نے ڈائری کھولی تو گویا کتنے سال پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

چند اوراق تو ایسے تھے جن پہ دنیا جہان کے ٹوٹکے تھے تو کچھ پہ گیتی کے اشعار تھے تو کہیں کھانے بنانے کی ریسپیز تھیں۔ ہر رنگ میں اشعر بھیا کی پسند کو مدنظر رکھا گیا تھا۔

لیکن اختتامی صفحات صرف میرے نام تھے۔

پیاری منیا!

جانتی ہوں تم کچھ پوچھو گی نہیں کبھی اگر تم منیا ہوتیں تو شاید سو سے کم سوالات نہ کرتیں لیکن تم..... تم گیتی آرا بن چکی ہو اب....." گیتی آرا وہ گیتی جو کچھ سال پہلے دولت اور اسٹیٹس کے ڈھیر کے نیچے دب کے مر چکی تھی۔ میں روز اس کے مدفن پہ پھول چڑھاتی رہی ہوں اس مدفن پہ جو میرے اندر ہے میں نے سوچا تھا میں کبھی کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی لیکن تمہیں دیکھ کر میرے اندر سسکیاں لیتی واویلا کرتی گیتی نے شکھ کا سانس لے لیا ہے۔ تمہیں دیکھ کر مجھے لگا میں کتنے ہی سال پیچھے آئینے کے سامنے کھڑی ہوں۔ میں تمہارے گھر نہیں آئی نہ آؤں گی لیکن میں جانتی ہوں وہاں کھلا صحن بھی ہوگا، برآمدہ، گول زینہ بھی ہوگا ہر طرف پودوں کی ہریالی ہوگی تمہارے بالوں میں لگے گجروں میں تمہارے گھر کے پودوں کی خوشبو محسوس کی ہے میں نے۔ تمہارے گھر میں ہر طرف تم ہی تم ہو گی۔

چند سال پہلے تمہارے بھیا کو چھوڑ کر جانا صرف تم سمجھ سکتی ہو، کیا گیتی کے لیے ممکن تھا کہ وہ ماں کو ناراض کر دیتی کیا ایسا ممکن تھا گیتی کے لیے منیا؟

میرے لیے ممکن نہیں تھا جب اماں نے انگلینڈ پلٹ نند کو دیسی نند پہ ترجیح دی اور ابو کو بھی اس میں شامل کر لیا پھر کیسے اپنی روایات سے منہ موڑ لیتی۔ چپ چاپ ماں باپ کے حکم پہ سر جھکانے والی گیتی ہوتی ورنہ کچھ بھی نہ رہتی۔

پھر زندگی میں سب کچھ بدل گیا۔ وہ وقت بہت کڑا تھا گزر گیا لیکن اب میں اس بہروپ کے زندان کی قیدی ہوں۔ عمر بھر سیفی کو اوڑھ کے جینا ہے، میں خود شناسی کی اس منزل پہ ہوں جہاں روشنی میں بھی سایہ میرا ساتھ نہیں دیتا۔ یہ آگاہی کا آئینہ ہے جو حقیقت کی مجسم شکل ہے، جس میں میری ذات کہیں گم ہو چکی ہے اور کہتی ہے تمہارا تو وجود بھی کہیں

نہیں ہے۔ میں نفس کی ہر ضرورت سے بے نیاز ایک روح ہوں جو لمحوں کی منڈیر کے آخری کنارے پہ کھڑی پرواز کی منتظر ہوں۔

بس کچھ ایسی ہی حالت ہے میری میں تو میں کے درمیان کے برزخ میں ہوں، اب اس سے چھٹکارہ چاہتی ہوں جو سانسوں کے ساتھ ہی جائے گا ہو سکے تو تم مجھ سے متنفر نہ ہونا میری مئیا!

میں تمہاری شکر گزار ہوں تم نے اپنے اندر گیتی آرا کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ ملنے نہیں آؤں گی مجھے معاف کرنا کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ گیتی آرا کے گھر کو دیکھ کر جلن میں مبتلا ہو کر تم سے حسد کرنے لگوں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اشعر بھی تمہارے گھر نہیں آتے ہوں گے۔ ان کو لاعلم رہنے دینا کہ میرے اندر کی گیتی آرا کا ایک مدفن ان کے اندر بھی آباد رہا تو عفت آرا کی آسودگی کو دوام ملا رہے گا۔ سلامت رہو۔

دعا گو، تمہاری گیتی آرا۔"

☆☆☆

بہت دن بعد میں میکے میں بیٹھی تھی۔ عفت بھابی کچن میں نجانے کیا کیا بنا رہی تھیں۔ کم آنے والی نند کی آؤ بھگت شاید زیادہ اہتمام کی متقاضی تھی۔ اشعر بھیا میرے سامنے بیٹھے میرے شیر دل سے کھیل رہے تھے۔

شیر دل کے ہاتھ چومتے بھیا کو میں نے غور سے دیکھا تو میری نظر کے ارتکاز نے انہیں میری جانب متوجہ کر لیا۔

"کیا بات ہے موحی کچھ کہنا چاہتی ہو؟" ان کا انداز استفہامیہ تھا۔

"بھیا محبت کیا ہوتی ہے۔ یہ ہوتی بھی ہے یا محض ایک بھرم ہے۔" میرے لہجے میں تھکن سی تھی۔

"کیوں بیٹا تم نے ایسا کیوں پوچھا۔ کیا سرمد کے ساتھ تم خوش نہیں ہو؟" وہ شفقت و فکر مندی سے میری طرف تکتے ہوئے بولے۔

"ایسا کچھ نہیں ہے بھیا! آپ کو لگتا ہے کہ گیتی آرا کہیں کھو گئی ہیں جو یورپ سے آئیں وہ کوئی اور

ہیں؟ کیا آپ کو بھی وہ کوئی اور عورت لگی ہیں۔ انجان اور مغرور سی....."

"نہیں منیا! وہ آج بھی گیتی آرا ہیں۔ ہم سے میں کے درمیان کے سفر میں بھی وہ گیتی آرا کو نہیں مار سکیں۔ وہ مسز سیفی کی ہمراہی میں بدلی نہیں ہیں صرف بہروپ ہی تو بدلا ہے"

بھیا کھوئے ہوئے انداز میں بول رہے تھے اور میں حیرت سے منہ کھولے انہیں دیکھ رہی تھی۔ محبت یوں بھی ہوتی ہے کہ ہر انسان دھوکا کھا بھی جائے محبوب کی آنکھ سچ تلاش کر ہی لیتی ہے بلکہ تلاش نہیں کرتی یہ تو وحی کی صورت دل پہ اترتی ہے۔

"تم نے دیکھا تھا وہ پھولوں سے الرجی کا کہنے کے باوجود خوشبو لگانا نہیں بھولی تھی۔ تم نے اس کو بھی نظر انداز کر دیا کہ اس نے ٹشو کے ڈبے کو ہاتھ نہیں لگایا وہ ہر بار پرس سے رومال نکال کر ہاتھ صاف کرتی رہی۔ اس کے لباس پہ آج بھی سلوٹ نہیں تھی اور..... اور..... اس کی آنکھوں میں اگر میرے لیے محبت نہ تھی تو بھی عقیدت تھی۔ لوگ کہتے ہیں مرد کے دل میں کئی خانے ہوتے ہیں وہ اسی لیے ایک وقت میں بہت سی محبتیں پال لیتا ہے۔ سچ ہے میں بھی گیتی آراء کو نہیں بھلا پایا گیتی صرف گیتی ہے۔ گیتی آرا....."

"عفت آرا میری شریک سفر، بہترین ساتھی ہے لیکن گیتی کی جگہ کبھی کوئی نہیں لے سکتا۔ تم کیا سمجھتی ہو نفرت مجھے تمہارے گھر نہیں آنے دیتی۔"

"نہیں محبت مجھے تمہارے در پہ جانے سے روکتی ہے تمہارے گھر کا طلسم میرے زخم ہرے کرتا ہے۔"

عفت بھابی کی مداخلت سے بھیا کی گفتگو کا تسلسل ختم ہوا۔ "چلیں بھئی کھانا لگا دیا میں نے ٹھنڈا ہو جائے گا سب۔" بھابی کی آواز میں خوش حال عورت کی کھنک تھی۔ مجھے یہ محسوس کر کے اپنے بھیا پہ بہت پیار آیا۔

☆☆☆

ٹھیک ایک ہفتہ بعد ہی مجھے گیتی آرا کا مختصر خط موصول ہوا۔

"پیاری منیا جیتی رہو! سلام رخصت۔

مجھے یقین ہے تم نے کچھ بتایا تو نہیں ہوگا لیکن اشعر سے مونی نے بہت سوالات کیے ہوں گے تو منیا ان کے جوابات مجھے پوچھنے کی حاجت ہی نہیں ہے۔ وہ ایک ہی تو ہیں جو گیتی کو پرکھنے میں کبھی دھوکا نہیں کھا سکے ہوں گے تب ہی تو وہ گیتی سے کبھی شکوہ کناں بھی نہیں ہوئے، محبت بہت انمول جذبہ ہے یہ ہر دل پہ وارد نہیں ہوتا اس واردات قلب کے لیے کچھ خاص فرد ہی منتخب ہوتے ہیں۔ یہ میلوں کے فاصلوں پہ بھی ہوں تو دھڑکنوں کی آواز بھی سن لیتے ہیں۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ میں کینسر جیسے مرض میں مبتلا ہوں۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں میں ان سے تعاون نہیں کر رہی ہوں میں نے موت کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں لیکن ان کو خبر نہیں ہے کہ میں تو صرف ایک چلتی پھرتی لاش ہوں ایک زمانے سے، عورت کبھی اپنی پہلی محبت نہیں بھلا سکتی ہے۔

میں تو جب سیفی کی زندگی میں شامل ہوئی تھی تب ہی یہ دعا کی تھی مجھے ایسا صبر ملے کہ میرے اللہ مجھے اور میرے دل کو پتھر کر دے، پیچھے پلٹ کر نہ دیکھوں تو بھی پتھر ہو جاؤں، میری حیات کی دعا مت کرنا۔ دعا کرنا میرے وجود کا پتھر میری قبر کے کتبے میں ڈھلے تو اسے بھی ٹھکانہ مل جائے، سلامت رہو۔

دعا گو: تمہاری گیتی آرا۔"

کاغذ میرے ہاتھ سے نکل کر فرش پہ پڑا تھا اور میں نم آنکھوں سے سوچ رہی تھی کہ محبت دعا ہے یا بد دعا، میں جو سمجھتی تھی کہ میں گیتی آرا بن چکی ہوں تو کتنی کم فہم تھی نا میں، گیتی آرا تو کسی اور ہی دنیا کی باسی تھی جس کا ہر روپ الگ تھا۔ میں تو محض موم کا مجسمہ تھی جسے میں نے گیتی بنایا تھا جو گیتی بن سکا نہ مونی رہا۔

☆

نظیر فاطمہ

ایک تھیں عادلہ باجی

''عادلہ باجی نے جم جوائن کرلیا۔''

''مشہور ڈاکٹر سے ڈائیٹ پلان بنوا کر اس پر عمل درآمد بھی شروع کر دیا۔''

سننے والوں سے ابھی پہلی خبر ہضم نہیں ہوئی تھی کہ دوسری اطلاع بھی آن پہنچی۔ پہلے تو لوگوں کو یقین نہ آیا۔ یقین آیا تو سب نے ایک دوسرے کو یوں دیکھا

جیسے سمندر کے خشک ہونے کی خبر سن لی ہو یا یہ کہ کسی پہاڑ نے اپنی جگہ بدل لی ہو۔

''عادلہ باجی نے؟'' ان کی بڑی بھابھی نے بس یہ تین لفظ کہے۔

''عادلہ باجی اور جم!'' اس سے چھوٹی نے حیرت کے اظہار میں ایک لفظ کا اضافہ کر دیا۔

''عادلہ باجی کی بات کس کو سمجھ میں آ گئی ہے جو یہ فیصلہ کر لیا ہے؟'' سب سے چھوٹی جو ان میں سب سے عقل مند تھی اور دلیل سے بات کرتی تھی اس نے معقول سوال کیا۔

''ہائے ہائے! میری عادلہ نوں یہ کیا مصیبت پے گئی ہے؟'' عادلہ کی امی نے سن کر سیاپا ڈال دیا۔

''میری عادلہ سے تو سب ہی جلتے تھے۔ اب کلیجوں میں ٹھنڈ پڑ گئی ہو گی۔ جب میری وچاری بچی بھوکی رہ کر یہ وڈی وڈی مشینوں پر دوڑا کرے گی۔''

''ہاں ہمیں بڑی ضرورت ہے ان سے جلنے کی..... جلنے کی کوئی وجہ بھی تو ہو۔'' یہ بڑی کے دل کی آواز تھی جو دل میں ہی رہی، زبان تک نہ آ سکی۔

''ان سے تو نہیں جلتے، ان کے طور طریقے اور انداز البتہ ہمیں بہت جلاتے ہیں۔'' یہ درمیان والی کے دل کی آواز تھی۔ یہ بھی زبان تک نہ آ سکی۔

''امی! ہم کیوں جلیں گے عادلہ باجی سے؟ ہماری بہنوں کی طرح ہیں۔ ہم انہیں کچھ کہتے تھے تو ان کی بھلائی کے لیے کہتے تھے۔''

یہ چھوٹی بہو کے دل و دماغ میں آنے والے خیالات تھے جو اس نے با آواز بلند اپنی ساس کے ساتھ ساتھ سب تک پہنچائے تھے۔

''ہاں آئی بڑی میری عادلہ کی ہمدرد۔'' یہ عادلہ کی امی کے دل میں رہ جانے والی آواز تھی کہ وہ اپنی سب سے چھوٹی بہو سے اتنا ہی دبتی تھیں جتنا بڑی دونوں کو دبا کر رکھتی تھیں۔ سب سے چھوٹی بہو ان کی بھتیجی تھی وہ کیا کہتے ہیں سیانے ماں دھی دو ذات، پھپھی بھتیجی ایک ذات..... تو اسے پتا تھا پھپھی سے کیسے نبٹنا ہے۔

☆☆☆

عادلہ باجی اپنے نام کی طرح عادلہ تھیں۔ مگر صرف اور صرف اپنی ذات کے لیے۔ اپنے ساتھ کبھی کوئی زیادتی نہ ہونے دیتیں۔ اپنا بدلہ پورا پورا لیتیں۔ دوسروں کا حق بھی اپنا حق سمجھ کر لے لیتیں۔ عادلہ اس گھر کی دوسرے نمبر کی بیٹی تھیں۔ ان سے بڑا ایک بھائی تھا اور ان سے چھوٹے دو بھائی تھے۔ اکلوتی، لاڈلی بہن اور بیٹی تھیں اور انوکھی لاڈلی بن کر رہتی بھی تھیں۔ پڑھا لکھا گاؤں سے تعلق رکھنے والا خاندان تھا جو شہر میں آباد ہو چکا تھا۔ پیسے کی کمی نہیں تھی بس رکھ رکھاؤ اور تہذیب کی تھوڑی کمی تھی۔ شادی سے پہلے بھی اور شادی کے بعد بھی عادلہ باجی بھائیوں پر رعب زدہ پیار بلکہ غرض زدہ پیار جتاتیں اور بھابھیوں کو رعایا سمجھتیں۔ سوائے ایک چھوٹی کے جو ان کے رعب میں کم ہی آتی تھی۔

عادلہ باجی شادی سے پہلے بھرے بھرے جسم کی مالک تھیں۔ اچھی لگتی تھیں۔ مگر شادی کے بعد ان کے وزن میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا جسے روکنے کی انھوں نے ذرا بھر کوشش نہ کی۔ اوپر تلے کے تین بچے گھر کی ذمہ داری عادلہ باجی خود سے بالکل ہی لاپروا ہو گئیں۔ کھانے پینے کی شوقین تھیں۔ زیادہ ہلنا جلنا بھی ناپسند تھا۔ کوئی سمجھاتا تو اس کے سر ہو جاتیں۔ ماں کی سپورٹ حاصل تھی۔ ماں کا کوئی کام عادلہ کے بغیر مکمل نہ ہوتا اور عادلہ بھی ایک آواز پر حاضر جناب بچوں کو ساتھ لے کر..... میاں بھی ساتھ کہ سسرال میں کوئی اور تھا نہیں۔

عادلہ اور ان کے بڑے بھائی کی شادی اکٹھے ہوئی۔ ان کے بھی تین بچے تھے مگر ان کی بھابھی بالکل فٹ تھیں۔ تھوڑا وزن بڑھا تھا مگر اچھی لگتی تھیں۔

''ارے! یہ تو کھایا پیا حرام کرتی ہے میرے بھائی کا۔'' عادلہ باجی بڑی بھابھی پر چوٹ کرتیں۔

''وہ حرام نہیں کرتیں۔ آپ کچھ زیادہ ہی حلال کر دیتی ہیں۔'' عادلہ کا دوسرے نمبر کا بھائی عمار کہتا تو

عادلہ کو آگ لگ جاتی۔ وہ ایسا واویلا مچاتیں کہ امی کو حواس باختہ کر دیتیں۔ وہ کہتیں۔

"چل دفع ہو جا یہاں سے، بہن کا کھایا پیا تو کتا ہے۔ ابھی اپنے شوہر کی کمائی کھاتی ہے، تم لوگوں پر پڑے گی تو پانی بھی نہیں پوچھنا تم لوگوں نے۔"

عادلہ اور کسی کو معاف کر دیں..... ناممکن..... سالوں بات دل میں رکھتیں اور پھر موقع ملنے پر اس کا بدلہ لیتیں اور اگلے کو یاد کرواتیں کی فلاں موقع پر جو بات ہوئی تھی، یہ اس کا جواب ہے۔ اگلا سوچتا رہ جاتا کچھ یاد آجاتا تو وہ ان کی یاداشت کو سلام کرتا جن کو یاد نہ آتا وہ ٹکر ٹکر ان کی شکل دیکھتا۔

☆☆☆

ان کو موٹاپے کے جتنے طعنے عمار نے مارے تھے، اتنے تو ان کے شوہر نے نہ مارے ہوں گے..... اتنے کیا؟ شوہر نے تو کبھی کچھ کہا ہی نہیں۔ اس کا بدلہ انھوں نے عمار کے لیے موٹی لڑکی پسند کر کے لیا۔ عادلہ کے بغیر لڑکی دیکھنے نہیں جایا جا سکتا تھا اور عادلہ کی پسند کے بغیر لڑکی فائنل نہیں ہو سکتی تھی۔ خیر عادلہ کو لے کر لڑکی دیکھنے گئے تو مضبوط کاٹھی کی اونچے قد، فربہی مائل جسم کی پیاری شکل وصورت والی انجم کو دیکھ کر عادلہ باجی کی باچھیں کھل گئیں۔

"اب آئے گا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔" انھوں نے دل میں سوچا اور لڑکی فائنل کر دی۔ لڑکی فائنل کر کے عمار کو تصویر تھما دی گئی۔

"یہ وہ لڑکی ہے جس سے تمہاری منگنی ہو رہی ہے۔" امی نے عادلہ کی شہہ پر رعب سے کہا۔

"یہ..... یہ لڑکی تو کچھ موٹی سی نہیں ہے؟" عمار تصویر دیکھ کر گڑبڑا گیا۔

"کوئی موٹی نہیں ہے اتنی خوبصورت ہے۔" عادلہ "عدل" کرنے پر آگئی تھیں۔

شادی ہو گئی۔ اونچے لمبے بھرے جسم کے مالک عمار کے ساتھ انجم..... دونوں بہت اچھے لگ رہے تھے۔

"دیکھا۔ کیسی لڑکی پسند کی ہے اپنے بھائی کے لیے؟" عادلہ ہر ایک سے تعریف وصول کر رہی تھیں۔ پھر جب انجم ماں بنی اور اس کا جسم پھیلنا شروع ہوا تو عادلہ باجی کی باچھیں کھل گئیں۔ اب تو آتے جاتے عمار کو چھیڑتیں۔

"تمہاری بیوی بھی اب میرے جتنے موٹی ہو گئی ہے نا۔" عمار جل جاتا مگر منہ سے کچھ نہ کہتا اور عادلہ قہقہے لگاتیں۔

"جواد! دیکھو میں اور انجم ایک جیسی موٹی ہیں نا؟" وہ سب سے چھوٹے جواد کی رائے لیتیں۔

"نہیں باجی! آپ ایسا کریں کہ انجم بھابھی کے ساتھ لکڑی کی ٹال پر جائیں اور ان کی لکڑیاں تولنے والے ترازو میں بیٹھ جائیں۔ پھر ہی پتا چلے گا کس کا وزن کم ہے، کس کا زیادہ۔" جواد جل کر کہتا۔

انجم اور عمار کی بڑی اچھی ذہنی ہم آہنگی ہو چکی تھی۔ جوں ہی بچہ تھوڑا کھانے پینے کے قابل ہوا۔ انجم نے جم جوائن کر لیا اور دوبارہ پہلے جیسی جسامت میں واپس آگئی۔

☆☆☆

عادلہ باجی کو جو کوئی دبلا ہونے کا کہہ دیتا یا ان کے سامنے موٹاپے کے نقصانات گنوا دیتا۔ عادلہ باجی پرسنل ہو کر اس کے خون کی پیاسی ہو جاتیں، یہ نہیں تھا کہ عادلہ باجی کو خود احساس نہیں تھا۔ مگر ان کے نزدیک "شادی کے بعد عورتوں کو وزن گھٹا کر کیا کرنا ہے بھلا۔" یہ وہ فلسفہ نما جملہ تھا جو نجانے کیسے ان کے ذہن میں گھس گیا تھا۔ اس جملے کا اثر تھا کہ وہ روز بروز مزید موٹی ہوتی جا رہی تھیں۔ چلو شادی کے بعد وزن گھٹائیں نا تو بڑھائیں بھی نا..... یہ بات ان کو سمجھ نہیں آتی تھی۔

"عادلہ! تیرے پوتے جواد کے لیے کہیں بات کی تھی، لڑکی دیکھنے جانا ہے اس ہفتے۔" عادلہ حسب معمول حاضر جناب..... لڑکی دیکھی گئی پسند کر لی گئی۔ اچھے رکھ رکھاؤ والے لوگ تھے۔ لڑکی والے بھی انھیں دیکھ کر پسند کر گئے تھے۔

''عادلہ! تیرے ابو کہہ رہے تھے، جا کر ایک دفعہ پھر لڑکی والوں کے گھر کا چکر لگا آئیں۔ پھر منگنی کی تاریخ رکھ لیں گے۔''

''امی جی! اس دفعہ بڑی بھابھی اور انجم کو بھی ساتھ لے چلنا۔ وہ لوگ کہیں گے بہن ہی آئی ہے بھابھیاں نہیں۔'' عادلہ کو اپنی پوزیشن کا بڑا خیال رہتا تھا کہ خراب نہ ہو۔

''امی، عادلہ، بڑی بھابھی اور انجم سب لڑکی والوں کے گھر پہنچے۔ ان کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ لڑکی خود بڑی سلم، اسمارٹ اور اس کی امی بھی پھرتیلی اور اسمارٹ سی خاتون تھیں۔ لڑکی کی دادی بھی اسمارٹ سی بزرگ تھیں۔ اس کا سارا خاندان ہی تقریباً دبلا پتلا تھا۔

کھانے کے بعد لڑکی اور اس کی امی نے انہیں باہر لان میں آنے کا کہا کہ چائے وہیں پیتے ہیں۔ سب باری باری اٹھ گئے۔ کمرے میں صرف دادی اور عادلہ باجی رہ گئیں۔

''بیٹا ایک بات کہوں؟'' دادی نے سوال میں عادلہ سے اجازت چاہی۔

''جی دادی! کہو آپ کو کیا کہنا ہے؟'' عادلہ نے مؤدب ہو کر کہا۔

''تم اپنا وزن کم کرو بیٹی! یہ صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ موٹاپا بیماریوں کی جڑ ہے۔ بلڈ پریشر، دل کا مرض اور شوگر جیسے مرض اس کے ساتھ جڑے ہیں۔ اس لیے اپنی صحت کا خیال کرو اور اپنا وزن کم کرو۔''

دادی نے نصیحت کی بڑا بن کر اور عادلہ باجی کے غصے کا گراف اتنا بڑھا کہ ان کا گول مٹول چہرہ موٹاپا جس کے سارے نقوش نگل گیا تھا تپ کر سرخ اور پھر سیاہ ہو گیا۔ عادلہ اس وقت تو خاموش رہیں۔ گھر آ کر امی ابو کو لے کر کمرے میں گھس گئیں۔ کمرہ بند میٹنگ بھگتا کر اپنے گھر چلی گئیں۔ بھابھیوں نے توجہ نہ کی کہ کمرہ بند میٹنگز اس گھر کا رواج تھیں۔

اگلے روز ابو جی ناشتے کی میز پر آئے تو سب کو ایک نظر دیکھا۔

''وہ میں نے رات کو استخارہ کیا تھا، جواد کی منگنی کے لیے۔ استخارے میں آگ آئی ہے۔ تو بس یہ سلسلہ ختم سمجھو۔''

''مگر ابا جی! ہم ان لوگوں کو ہاں کہہ چکے ہیں۔'' بڑے بھائی نے تڑپ کر کہا جس کے توسط سے یہ رشتہ ہو رہا تھا۔ بھابھیاں حیران کہ یہ راتوں رات ''آگ'' کہاں سے آ گئی استخارے میں۔

عقدہ تو اگلے دن کھلا جب عادلہ باجی آئیں۔

''کروا دیا نا میں نے انکار..... سوکڑے کے مارے خاندان کو..... آئی تھی بڑی مجھے موٹاپے کے طعنے مارنے والی..... غضب خدا کا، مجھے سو بیماریاں لگوا دیں اس بڈھی چرخ نے۔''

بڑی بھابھی اور انجم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور دونوں کو ''آگ'' کہاں سے آئی والے سوال کا جواب مل گیا۔

پھر جواد کی شادی اس کے ماموں کی بیٹی بیلا سے ہو گئی۔ جو حق اور صاف بات کرنے میں کسی سے نہیں دبتی تھی۔

☆☆☆

''عادلہ باجی! آپ میری بڑی بہن ہیں۔ پلیز خود پر رحم کریں، وزن تھوڑا کم کر لیں۔'' بیلا نے پیار اور عزت سے کہا تھا مگر عادلہ باجی بم کی طرح پھٹیں۔ بڑی بھابھی اور انجم کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے اور بیلا آرام سے کھڑی رہی۔ امی نے بیلا کی کلاس لینا چاہی تو وہ مچھلی کی طرح ان کے ہاتھ سے پھسل گئی۔

''پھوپھو! میں نے ان کے بھلے کو کہا ہے۔ کوئی طنز نہیں کیا۔ آپ کیسی ماں ہیں۔ بیٹی سے یوں دشمنی نہ کریں بلکہ انھیں سمجھائیں۔'' بیلا نے ہموار لہجے میں بات کر کے ساس کو لاجواب کر دیا۔

''مم..... مم..... میں کیا کہہ سکتا ہوں؟'' بیلا نے ایک دو بار ان کے شوہر رشید بھائی سے کہا کہ وہ

عادلہ سے وزن کم کرنے کو کہیں تو وہ بے چارے یوں ہکلا گئے جیسے موت کا فرشتہ سر پر آن پہنچا ہو۔

عادلہ سب کی ان سنی کیے اسی رفتار سے کھاتی پیتی اور دبلی بنی رہتیں۔ ان کے موٹاپے نے دن دوگنی رات چوگنی ترقی کی کہ وہ "سومو پہلوان" سے بس کوئی دو ڈھائی انچ ہی کم رہ گئیں۔ جب سب ان کے وزن سے سمجھوتا کر چکے تھے اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ کر لاتعلق ہو چکے تھے تو اطلاع ملی کہ عادلہ باجی وزن کم کرنے کی کوششوں میں ہیں۔

☆☆☆

"عادلہ! بھئی یہ کیا سوجھی تمہیں؟" بڑے بھائی نے عادلہ کے تربوز نما سر پر چپت لگائی تو عادلہ نے نم آنکھوں سے انھیں دیکھا مگر خاموش رہیں۔ بس مسکرا دیں۔

"چلو اچھا ہے، دیر آید درست آید۔" وہ ان کی خاموشی کے جواب میں کہہ کر چلے گئے۔

"بیٹا تجھے ہو کیا گیا؟" دوپہر کو ماں بیٹی کمرے میں اکیلی تھیں۔ تو ماں نے بیٹی سے پوچھا اور عادلہ باجی چھکوں پہکوں رونے لگیں۔

"ہائے میں مر گئی کیا ہو گیا میری دمی؟" امی کا تو دل ہی دہل گیا۔

"امی!" عادلہ باجی ان کے گلے لگ گئیں۔ جی بھر کر رو چکنے کے بعد سر اٹھایا۔ آنکھیں دوپٹے کے پلو سے صاف کیں۔ ناک بھی دوپٹے کے پلو سے رگڑی اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

"امی ارشید نے کہا ہے کہ وہ میرے جیسے سومو پہلوان کے ساتھ نہیں رہ سکتا اب۔ وہ دوسری شادی کر رہا ہے۔" عادلہ بات کے اختتام پر بری طرح رو دیں۔

"رشید کی یہ جرأت....." اماں نے کچھ کہنا چاہا تو عادلہ نے ماں کی بات کاٹ دی۔

"نہیں امی! اب مجھے یہ بات سمجھ میں آ گئی ہے کہ مرد باہر منہ تب ہی مارتا ہے جب گھر کی عورت اسے یہ موقع دیتی ہے۔ میں نے رشید کو اس نوبت تک خود پہنچایا ہے۔ میں خود سے لاپروا ہوئی تو رشید بھی مجھ سے لاپروا ہو گیا۔ اس نے کہا ہے کہ مجھے ایک سال کے اندر اندر اپنا وزن کنٹرول کرنا ہوگا ورنہ وہ دوسری شادی کر لے گا۔ میں نے اس کی بات سن کر رعب سے اسے ٹوکنے کی کوشش کی تو اس کے تاثرات دیکھ کر جم سی گئی جس میں بے زاری، نفرت، اور کیا کچھ نہیں تھا۔ امی میں اپنا گھر بچانے کے لیے اپنی غلطی کو سدھاروں گی۔ اس لیے میں نے یہ سب شروع کیا ہے۔" امی نے دل گرفتہ ہو کر من ہی من میں رشید کو کوسا۔

☆☆☆

پھر چشم فلک کے ساتھ ساتھ سب کی آنکھوں نے یہ منظر دیکھا کہ ایک سال کے بعد عادلہ باجی آدھی سے بھی کم ہو چکی تھیں۔ موٹاپا کم ہوا تو نقوش بھی ابھر آئے اور وہ خوب صورت دکھائی دینے لگیں۔

"عادلہ! کمرے میں آؤ۔" رشید نے عادلہ کو بلایا۔ وہ کمرے میں گئیں تو انھوں نے ان کے سامنے تین گفٹ پیک رکھے۔

"کھولو۔" سوٹ، پرفیوم اور میک اپ کا سامان یہ سب نکلا تھا ان میں سے۔

"اب تم یہ سب پہنو اور میک اپ کرو گی تو اچھی لگو گی۔" ایک سال سے رشید کی بے اعتنائی برداشت کرتی عادلہ باجی پہلے تو حیران ہوئیں اور پھر ان کے محبت بھرے لہجے کو محسوس کر کے رو دیں۔

"بس اب آنسو بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں محبت کرتا ہوں تم سے۔ تمہارے سوا کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ سب تمہیں راہ راست پر لانے کے لیے کیا تھا۔"

رشید نے عادلہ کو بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔ عادلہ نے سکون سے آنکھیں موند لیں اور رشید نے دل ہی دل میں دعا کو دعائیں دیں۔ جس نے یہ سارا منصوبہ ترتیب دے کر رشید سے اس پر عمل کروایا تھا کہ اسی میں عادلہ کی بھلائی اور خوشیاں پوشیدہ تھیں۔

☆

سدرہ حیات

استطاعت

ٹرین کے ڈبوں میں ہوتا شور اس کے کانوں میں چبھنے لگا تھا۔ کیا اس کی زندگی یوں ہی سفر کرتے تمام ہو جائے گی؟ اس نے خود سے سوال کیا تھا۔ مگر جواب شاید اس کی قسمت کے پاس تھا، جس سے بھاگتے بھاگتے اب وہ تھک سی گئی تھی۔ تو کیا اس لاحاصل سفر کو وہ اپنا نصیب مان لے۔ اس نے خود سے سوال کیا اور اسی پل دماغ نے گویا کروٹ لی تھی۔ قسمت بدلنے کے لیے حوصلہ چاہیے ہوتا ہے۔ تو کیا اتنی ہمت، حوصلہ اس میں تھا؟ اس کے اندر ایک جنگ برپا تھی۔ آج اس کا خوف جیت جاتا یا وہ خود۔

☆☆☆

کچن کے شیلف سے ٹیک لگائے، وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھی، جب اندر آتی مشعل کی آواز پر چونکی۔

''آپ کو کچھ چاہیے مشعل بی بی!'' اس کے منہ سے نکلا۔

''ایک تو یہ بی بی وی بی مت کہا کرو۔ کتنی بار منع کیا ہے تمہیں، تمہارے منہ سے بالکل اچھا نہیں لگتا۔'' پانی کی بوتل فریج سے نکالتے ہوئے اس نے تنبیہی انداز میں اسے ٹوکا۔

''جی کوشش کروں گی۔'' اس کی آنکھیں جھک گئیں۔

''کیا بنا رہی ہو؟'' خوشبو نتھنوں سے ٹکرائی تو وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''بریانی دم پر رکھی ہے، بس کچھ دیر میں تیار ہو جائے گی۔'' اسے اطلاع دیتے ہوئے اس نے رائتے کی تیاری شروع کی۔

''واؤ، خوش کر دیا ریشم! تمہارے ہاتھ کی بریانی

تو میں سسرال جا کر بھی یاد کروں گی۔"

"آپ کی امی سے ہی تو سیکھی ہے، ورنہ مجھے کہاں آتی تھی بریانی بنانا۔"

"ہوں، مگر بناتی تم ممی سے بھی زیادہ اچھی ہو۔ ذائقہ بہت ہے تمہارے ہاتھ میں۔ میں نے جب بھی میکے آنا ہوگا —— تم سے بریانی کی فرمائش کیا کروں گی۔"

جواباً اس کی جھکی پلکیں مزید جھک گئی تھیں۔

"اچھا یہ کر کے ذرا میرا جوڑا استری کر دینا یاد سے۔" جاتے جاتے کچھ خیال آیا تو وہ رکی۔

"تمہاری بی اے کی تیاری کیسی جا رہی ہے؟"

"ٹھیک چل رہی ہے۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کیا خاک چل رہی ہوگی۔ شادی کے کام ہی ختم نہیں ہو رہے، خیر ایک دو ہفتوں کی بات ہے، پھر تم دل لگا کر پڑھنا۔ آخر تمہاری اماں اسی لیے تمہیں گاؤں سے تمہارے سوتیلے ابا سے لڑ کر یہاں چھوڑ کر گئی ہیں کہ یہاں تم کام کے ساتھ پرائیوٹ امتحان بھی دے سکو۔"

"جی۔" اسے اپنی آواز خود بھی اجنبی لگی تھی۔

"ممی سے میں نے کہہ دیا ہے، زرینہ خالہ آ بھی جائیں گی تب بھی تم یہیں رہو گی۔ یوں بھی انہوں نے اپنی بیٹی کی طبیعت سنبھلتے ہی واپس آ جانا ہے۔ یہ تو اچھا ہوا جو وہ تمہاری ماں سے کہہ گئی تھیں ورنہ جتنی جلدی میں گئی تھیں، میرا خیال تھا بھول جائیں گی اور ان کی بیٹی کا سسرال خیر سے جس گاؤں میں ہے، اس میں تو فون کے سگنلز تک نہیں آتے۔ تم لوگوں کے گاؤں سے تو خاصا دور ہے نا۔" مسلسل بولتے مشعل کو خیال آیا۔

"جی۔" اس نے سر ہلایا۔ چہرے کا رنگ پھیکا پڑا۔

"جوڑا یاد سے استری کرنا۔" جاتے جاتے وہ تاکید کرنا نہیں بھولی تھی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے جبکہ ذہن کہیں اور پرواز کر رہا تھا۔

☆☆☆

"ابھی موقع نہیں مل رہا۔ میں....." دوسری جانب سے اس کی بات کاٹی گئی تھی جسے سنتے ہی اس نے پریشانی سے لب کاٹے۔ تب ہی فاخرہ آنٹی اسے پکارتی یک دم اندر آئیں تو گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ سے موبائل گرتے گرتے بچا۔

"ماں سے بات کر رہی ہو؟"

"جی۔" ان کے قیاس پر اس نے فوراً سر ہلایا۔

"چلو بات کر لو، پھر ذرا شام کی تیاری دیکھ لینا۔ مشعل کی سہیلیاں ڈھولکی بجانے آئیں گی تو ان کے کھانے دانے کا انتظام دیکھ لینا، بلکہ اسی سے پوچھ لینا کہ کیا بنانا ہے اور کتنی لڑکیاں ہوں گی۔ میں جا رہی ہوں، دو گھنٹوں تک آؤں گی۔"

عجلت میں اسے ہدایت دیتی، وہ پرس سنبھالتی نکل گئیں جبکہ اس کی پریشان صورت اور پسینے میں تر بتر حالت ان کی نگاہوں میں نہ آ سکی۔ اس نے موبائل کو دیکھا، دوسری جانب سے لائن کاٹی نہیں گئی تھی، اس نے فون کان سے لگا لیا۔

"اتنا آسان نہیں ہے، میں آپ کو دوں گی نا۔" کچھ دیر دوسری جانب کی بات سننے کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔ چہرے پر پریشانی ہنوز رقم تھی۔

☆☆☆

مغرب کی اذانوں کے بعد ہی گھر میں مشعل کی سہیلیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور اب لاؤنج میں سب لڑکیاں ڈھولک سنبھالے بیٹھی تھیں۔

"وہ گاؤ نا وہ..... کیا تھا..... بسم اللہ کراں!" مشعل نے گانے کی فرمائش کی تو سب ہی نے مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے اسے گھورا۔

"واہ واہ..... میڈم کی فرمائشیں تو چیک کرو۔" صبا نے اس کی ٹانگ پر چپت رسید کی۔

"ڈھولکی میری، شادی میری تو گانے بھی میری پسند کے ہونے چاہئیں۔" مشعل اترائی۔

"پوری لسٹ ہے میرے پاس، صبر تو کرو۔"

"اوہووو....." سب نے مل کر آواز نکالی۔

اسی وقت مشعل کی نگاہ اندر آتی ریشم پر پڑی تو اسے آواز دے ڈالی۔

"ریشم! آؤ بیٹھو ہمارے پاس۔"

"مجھے تو کوئی گانا نہیں آتا، آپ سب گائیں نا۔" ان سب کو جوس اور دیگر لوازمات پیش کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"خیر ہے۔ ہمارا ساتھ دو یہاں آ کر۔" مشعل نے اپنے قریب اس کی جگہ بنائی تو وہ خالی ٹرے رکھ کر کچھ جھجکتی ہوئی ان کے بیچ جا بیٹھی۔

"تمہاری بی اے کی تیاری کیسی جا رہی ہے؟" فائقہ نے پوچھا۔

"اچھی جا رہی ہے۔" سر جھکائے وہ بولی۔

"ویسے ریشم گاؤں کی بالکل نہیں لگتی۔" صبا نے تبصرہ کیا تو سب ہی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ اس کا چہرہ کسی احساس کے تحت سرخ پڑا۔

"بھئی میرے لیے تو یہ بالکل سہیلیوں جیسی ہے۔" مشعل کے لہجے میں واضح اپنائیت تھی۔ اسے وہاں بیٹھنا مشکل لگنے لگا تھا۔

"اتنی سہیلیاں جمع ہوں اور گانے کی آواز تک نہ ہو، یہ تو حیرانی کی بات ہے۔"

فاخرہ آنٹی کی آمد نے سب کی توجہ پھر سے ڈھولک کی جانب مبذول کردی تو وہ یہ موقع غنیمت جانتی، کھانا لگانے کے لیے اٹھ گئی۔ کچن میں گھستے ہی اس نے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتے، گہرے گہرے سانس لیے تھے۔

"اگر یہاں کوئی اس کی اصلیت جان جاتا تو....." اور اس سے آگے سوچنا اسے بہت اذیت ناک لگا تھا۔ ساری عمر وہ اسی خوف کے زیر اثر رہی تھی کہ کہیں اسکول کالج میں اس کے ساتھ پڑھنے والی لڑکیاں، اس کے اساتذہ میں سے کوئی اس کے بارے میں کچھ جان نہ جائے اور اب وہ زندگی کے جس امتحان سے گزر رہی تھی۔ وہ ان سب امتحانوں سے زیادہ کٹھن تھا۔ بے بسی سے نم چہرے کو دوپٹے سے تھپتھپاتے ہوئے وہ کھانے کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔ فاخرہ آنٹی اگر کچن کا رخ کر لیتیں تو انہیں اپنی ایسی حالت کا وہ کیا جواز پیش کرتی۔

☆☆☆

"ایس پی ریان ملک اور ہمارے غریب خانے پر۔ اتنے عرصے بعد آپ کی گاڑی دیکھ کر گھبراہٹ ہونے لگی تھی کہ یہ پولیس ہمارے ہاں کیوں آ پہنچی۔" گرم جوشی سے اس سے بغل گیر ہوتے ہوئے عباس نے شرارت سے کہا تو مونچھوں تلے اس کے گلابی لب مسکرا اٹھے۔

"پولیس سے مجرم گھبراتے ہیں، خیر سے آپ سے کون سا جرم سرزد ہو گیا۔" صحن میں بچھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے ریان ملک نے جواباً حاضر جوابی کا مظاہرہ کیا۔

"قطعاً غلط مجرم سے زیادہ تو شریف انسان پولیس کو دیکھ کر راستہ بدل لیتا ہے۔"

"اچھا تو اسی لیے تم میرے قریب سے بھی نہیں گزرتے، جواز اچھا ہے۔"

"ریان بیٹا آیا ہے۔" آنٹی کی مسکراتی آواز پر وہ احتراماً کھڑا ہوا۔ اس کا کندھا تھپکتی وہ بھی قریبی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"بس آنٹی معذرت، پہلے حاضر نہیں ہو سکا۔ ایک کیس کے سلسلے میں خاصا مصروف تھا۔ آج فراغت ملتے ہی ڈیوٹی آف کر کے حاضر ہو گیا۔"

"اصل میں تو جناب اس وردی کا رعب ہم پر ڈالنا چاہ رہے ہیں جیوں ہی چلے آئے۔"

عباس نے وردی میں ملبوس اس کے نکھرے ہوئے توانا وجود پر نگاہ ڈالی۔ اس کے چہرے کے نقوش نہایت جاذب نظر تھے۔ اس پر اس کی اجلی رنگت اور ساتھ میں ہلکی داڑھی نے چہرے کو ایک وقار سا بخشا تھا۔

"یہ تو آنٹی اب طعنے ہی مارتا رہے گا۔ آپ اچھی سی چائے پلوائیں اور پھر شادی کے جتنے کام رہتے ہیں، وہ اپنے اس بیٹے پر چھوڑ دیں۔" ریان نے سینے پر ہاتھ

رکھتے ہوئے خلوص سے کہا، ساتھ میں عباس کو دیکھا۔
''اس نکمے کو رہنے دیں، یہ صرف گیارہ بجے اٹھ کر دفتر جا سکتا ہے۔'' ریان کے لہجے میں شرارت واضح تھی۔
''ہاں تو بندے کا اپنا بزنس ہو تو یہ فائدے تو ہوتے ہی ہیں۔'' عباس نے شرمندہ ہوئے بغیر کہا۔
فاخرہ آنٹی انہیں باتیں کرتا چھوڑ کر مسکراتے ہوئے اٹھ گئیں۔ ریان ملک نہ صرف عباس کے بچپن کا دوست تھا بلکہ ان کے شوہر کے ریان کے خاندان سے خاصے پرانے تعلقات تھے۔

''ریان بھائی! میں سخت ناراض ہوں آپ سے۔ بہن کی شادی ہے اور آپ مہینوں چکر ہی نہیں لگاتے۔'' مشعل ناراضی سے بولتی ان کے قریب آئی تھی۔
''چلو، اب صحیح عدالت لگنے والی ہے۔'' عباس نے شرارت سے کہا جبکہ ریان نے سر پر ہاتھ پھیرتے مشعل کو دیکھا جو اسے اپنی چھوٹی بہن کی طرح عزیز تھی۔
''یہ کوتاہی مصروفیت کے چکر میں ہو گئی، پر اب میں حاضر ہو گیا ہوں تو کم از کم اچھی سی چائے تو پلا دو پھر چاہے کاموں کی فہرست تھما دینا۔''
''چائے تو آپ کو پلواتی ہوں مگر ریان بھائی! یہ زیادتی ہے۔ آپ اتنے عرصے بعد آئے ہیں، اب تو شادی میں بھی ہفتہ رہ گیا ہے۔'' مشعل آسانی سے بخشنے کو تیار نہ تھی۔
''اچھا چلو پھر آج باہر ڈنر کرواتا ہوں۔ کیا خیال ہے۔''
''سچ۔'' ریان کی آفر پر وہ اپنی جگہ سے اچھلی۔
''بالکل پولیس کی زبان ہے، کوئی شک ہے کیا۔'' ریان نے شاہانہ انداز میں کہا تو مشعل نے جھٹ سے ہامی بھر لی۔
''وہ ایسا کرو مشی! اپنی ہونے والی بھابھی کو بھی فون کر دو۔ ساتھ چلتے ہیں سارے۔'' عباس نے کان کھجاتے ہوئے کہا تو ریان نے کھنکار کر اسے دیکھا۔
''میں نے کسی دعوت کا اعلان نہیں کیا، اپنی بہن کو ڈنر کروا رہا ہوں۔'' مشعل ہنس پڑی۔ جبکہ عباس بدمزا ہوا۔
''پولیس والوں سے اسی کنجوسی کی امید تھی مجھے۔''
''ریان ملک پر ایموشنل بلیک میلنگ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔''
''جی ہاں، پتھروں پر وار اکثر خالی ہی جاتے ہیں۔'' عباس نے اس پر چوٹ کی۔
''چلو کیا یاد کرو گے۔ بلا لو بھئی بھابھی کو بھی۔'' ریان نے مسکرا کر کہا۔
''میں کچھ دیر میں انہیں فون کرتی ہوں۔''
مشعل نے مسکرا کر اپنے بھائی کا چمکتا چہرہ دیکھا۔ اسی وقت ریشم چائے اور دیگر لوازمات کی ٹرے لیے، لان کے اس حصے تک آئی جہاں وہ بیٹھے تھے۔
''چائے بھی آ گئی۔ لاؤ ریشم! یہاں رکھ دو۔''
مشعل کے کہنے پر وہ ٹرے اس کے سامنے رکھنے لگی، جب سامنے والی کرسی پر پولیس کی وردی میں بیٹھے شخص کو دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔ گھبراہٹ میں اس کا ہاتھ کانپا اور ٹرے کے زور سے میز پر رکھے جانے کی آواز آئی، ساتھ میں ساسر سے تھوڑی سی چائے چھلکی۔ وہ مزید گھبرا گئی۔
''کوئی بات نہیں، چھوڑ دو۔ میں خود ڈال لوں گی۔''
مشعل کے کہنے پر وہ فوراً سیدھی ہوئی اور تیز قدموں سے واپس مڑ گئی۔ سانس جیسے سینے میں ہی اٹک گئی۔ پھر کتنی دیر وہ کچن کی کھڑکی سے باہر پولیس کی اس گاڑی کو تکتی رہی۔

☆☆☆

اس دن مشعل اسے اپنے ساتھ بازار لے گئی تھی اور پھر اپنی شاپنگ کرتے اس کے منع کرنے کے باوجود اسے دو بہت ہی قیمتی جوڑے دلوا دیے تھے
اس کی نظریں جھکی جا رہی تھیں۔ آنسوؤں کا گولہ حلق میں ہی اٹک گیا تھا، جسے وہ بمشکل نگل پائی تھی۔
شاپنگ مال سے نکلتے انہیں خاصی دیر ہو گئی

تھی۔ مغرب کی اذان ہونے کو تھی اور ایسے میں اچانک چلتی گاڑی بیچ سڑک پر رک گئی تو مشعل کو پریشانی ہونے لگی۔ فون کی بیٹری بھی ختم ہو چکی تھی، ڈرائیور کے فون میں بھی بیلنس نہیں تھا۔

''میں کسی مکینک کا پتا کرتا ہوں مگر بی بی جی آپ دونوں کو اکیلا چھوڑ کر کیسے جاؤں۔'' ڈرائیور کو بھی پریشانی ہو رہی تھی۔

''نہیں آپ.....'' مشعل کے باقی الفاظ منہ میں ہی رہ گئے تھے۔ ریان ملک کو قریب آتے دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا جبکہ ریشم اس کے سلام کرنے پر بری طرح چونکی تھی اور گاڑی کے شیشے سے جھانکتے وردی میں ملبوس شخص کو دیکھ کر اس نے گھبراہٹ میں جلدی سے اپنے دوپٹے سے چہرہ ڈھانپا۔

''شکر ہے ریان بھائی! آپ مل گئے۔'' ریان نے اسے اپنی گاڑی میں بیٹھنے کا کہا تو وہ مطمئن سی اپنا بیگ اٹھاتی گاڑی سے اتری۔ ریشم کو بھی مجبوراً اس کا ساتھ دینا پڑا۔ اس کی پولیس جیپ میں بیٹھتے ہوئے ریشم کو اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہوا۔

سارے راستے وہ خاموشی سے ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سنتی رہی۔ چہرہ اس نے ہنوز ڈھانپ رکھا تھا اور بے چین نگاہیں شیشے کے پار راستے پر ٹکی تھیں۔

پندرہ منٹ بعد گاڑی گھر کے پاس پہنچی تو اس کے دل کو کچھ سکون پہنچا۔ گیراج میں گاڑی کے رکتے ہی وہ مشعل کے پیچھے دروازے سے اتری۔ ابھی وہ ٹھیک سے سنبھل بھی نہیں پائی تھی کہ اس کے پکارنے پر گھبرا گئی۔

''ایک منٹ۔'' اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خوف اترا جو اس کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

''آپ کی چادر دروازے میں رہ گئی ہے۔''

اس نقاب والی پر سرسری نگاہ ڈالتے اس نے دروازہ کھولا تو ریشم نے جلدی سے اپنی چادر سنبھالی اور اپنی تیز ہوتی سانسوں پر بمشکل قابو پاتے اندر کا رخ کیا۔ اب ایک لمحہ بھی یہاں کھڑا ہونا اسے مشکل لگ رہا تھا۔

مشعل نے اسے رکنے کو کہا مگر وہ جلدی میں تھا، اسی لیے وہ اصرار نہ کر سکی۔

☆☆☆

فاخرہ آنٹی کو سیڑھیاں اترتے دیکھ کر جھاڑ پونچھ کرتے اس کے ہاتھ رکے۔ اپنے حلیے سے وہ کہیں جانے کو تیار لگ رہی تھیں۔

''تو کیا آج وہ دن آ گیا تھا۔'' اس کے اندر آواز اٹھی تو اس نے اپنے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''ریشم!'' اس کی سوچوں سے بے خبر انہوں نے قریب آ کر اسے مخاطب کیا۔

''میں جا رہی ہوں۔ رات تک ہی لوٹوں گی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

ملال زیست	آمنہ ریاض	300/-
بڑا آدمی	نسیم سحر قریشی	400/-
فصل غم کا گوشوارہ	رضیہ جمیل	300/-
دل اک گلشن	رضیہ جمیل	300/-
سوچ نگر کی رانی	رضیہ جمیل	350/-
حنا	نادرہ خاتون	550/-
چلمن	نادرہ خاتون	300/-

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

شادی سر پر کھڑی ہے اور ابھی تک کارڈز یوں ہی پڑے ہیں۔ آج یہ کام ختم کر کے ہی آؤں گی۔ تم رات کا کھانا دیکھ لینا۔ عباس بھی رات میں ہی ہوگا، اسے بھی آج کارڈز دینے جانا ہے اور ہاں مشعل کے ساتھ اس کے جہیز کے کپڑے سوٹ کیس میں سیٹ کر دینا۔ شام میں اس نے بھی اپنی دوست کی برتھ ڈے پر جانا ہے۔"

"جی۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ڈرائنگ روم میں شادی کے کارڈز پڑے ہیں، وہ گاڑی میں رکھوا دو۔" بیگ میں بجتے موبائل کو ہاتھ ڈال کر باہر نکالتی، وہ اسے ہدایت کرتی باہر کی جانب بڑھ گئیں۔

پھر کارڈز گاڑی میں رکھوانے اور ان کے جانے کے بعد وہ کتنی دیر گیراج میں کھڑی رہی تھی۔

"بیٹا! اندر چلی جاؤ۔ یہاں کب تک کھڑی رہو گی۔" چوکیدار کے پکارنے پر وہ چونکی۔

"جانا تو ہے ہی چاچا! آج بھی اور کل بھی۔" آہستہ سے کہتی وہ مڑ گئی جبکہ چاچا کی سماعت اس کے جملے سے محروم ہی رہی تھی۔

میکانکی انداز میں چلتی وہ لاؤنج تک آئی تھی۔ میز پر سے اپنا موبائل اٹھاتے ہوئے اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ دوسری طرف سے فون اٹھا لیا گیا تھا۔

"آج شام اندھیرا ہوتے ہی آ جایئے گا۔" دوسری جانب کی بات سن کر وہ کچن میں گھس گئی۔ اب اسے اس گھر کے مکینوں کے لیے آخری کھانا بنانا تھا۔ اس نے اپنے اندر ابھرتی تمام سوچوں کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اسے اب کچھ نہیں سوچنا تھا، اب صرف عمل کا وقت تھا جو اسے ہر حال میں کرنا تھا۔

☆☆☆

"آپ تیار نہیں ہوئیں؟" مشعل کو گھر والے حلیے میں دیکھ کر اسے پوچھنا پڑا۔ مشعل نے لیپ ٹاپ پر سے نگاہیں اٹھائیں۔

"موڈ نہیں ہو رہا۔ فون کر کے منع کر دیا ہے۔" مشعل نے عام سے لہجے میں کہا مگر اس کا سانس گویا حلق میں اٹک گیا۔

"چلی جاتیں تو اچھا وقت گزر جاتا۔" اس نے لہجے کو سرسری بنانا چاہا۔

"کل دیکھوں گی، آج موڈ نہیں ہے۔" وہ لیپ ٹاپ کی جانب متوجہ ہو گئی تو ریشم ہونٹ کاٹتی باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بند دروازے کے باہر کھڑے رہنے کے بعد وہ ماتھے پر چمکتے پسینے کو دوپٹے کے پلو سے پونچھتی کچن کی جانب بڑھ گئی۔

"چاچا! یہ شربت لے لیں۔" آدھے گھنٹے بعد وہ شربت کا گلاس ٹرے میں رکھے چوکیدار سے مخاطب تھی۔

"شکریہ بیٹی! جیتی رہو، آج گرمی بھی بہت ہے۔" ممنون لہجے میں بولتے چاچا نے ٹرے تھام لی۔ وہ سر جھکائے مڑ گئی۔ مدھم چال چلتی کچن سے دوسرا گلاس اٹھاتے اس کا رخ اب مشعل کے کمرے کی جانب تھا۔

"آپ کے لیے جوس لائی ہوں۔"

"میرا جوس پینے کا ہی دل چاہ رہا تھا۔" اس نے مسکرا کر ریشم کو دیکھا، جس نے نگاہ چراتے گلاس اس کے قریب موجود میز پر رکھا۔ اسے کام میں مصروف دیکھ کر اس نے بولنے کو لب کھولے مگر دوسرے ہی لمحے جوس کی جانب بڑھتے اس کے ہاتھ کو دیکھ کر وہ چپ چاپ باہر نکل گئی۔ دروازہ بند کرتے اس کا دل گرز اٹھا تھا۔ گہرے سانس بھرتی وہ لاؤنج تک آئی اور میز پر پڑا اپنا موبائل اٹھایا۔

"آدھے گھنٹے میں نکل آئیں۔ یہاں اب کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" فون پر کہتے ہوئے اس کی نگاہیں کھڑکی سے نظر آتے چوکیدار پر تھیں جو شربت کا خالی گلاس واپس رکھتا، اب اپنی کرسی سے ٹیک لگائے پیچھے کو ہو کر بیٹھا تھا۔

نہ جانے کتنا وقت گزر گیا تھا اسے وہاں کھڑے۔ موبائل کی گھنٹی کی آواز پر وہ بری طرح چونکی، پھر گہرا سانس لیتی بیرونی گیٹ کی جانب بڑھی۔ چوکیدار کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی سو چکا تھا۔ شربت میں شامل نیند کی گولی نے اپنا اثر دکھایا۔

☆☆☆

لیپ ٹاپ پر کام کرتے اسے خاصا وقت گزر چکا تھا۔ باہر سے جھانکتا اندھیرا رات ہونے کا پتا دے رہا تھا۔ قریب پڑے جوس کے گلاس پر نگاہ پڑی جو کہ اب گرم ہو چکا تھا اور وہ اپنی مصروفیت میں اسے بھول ہی گئی تھی۔ گہرا سانس لیتی وہ بستر پر سے اٹھی۔ ابھی وہ دو قدم ہی چلی تھی کہ اسے کمرے کے باہر سے دو آدمیوں کی آپس میں بات چیت کرنے کی آواز آئی۔ وہ کچھ حیران سی دروازے کے قریب سرکی۔ وہ جو کوئی بھی تھے یقیناً گھر میں چوری کی نیت سے گھسے تھے۔ مشعل نے گھبرا کر جلدی سے بستر پر پڑا اپنا موبائل اٹھایا اور عباس کو فون ملایا۔

"بھائی! گھر میں چور گھس آئے ہیں۔" اس کے کال اٹھاتے ہی مشعل نے دھیمی آواز میں کہا۔

دوسری جانب وہ پریشان ہو گیا مگر اسے تسلی دیتے ہوئے اس نے جلد پہنچنے کی یقین دہانی کروائی تو اسے کچھ سہارا ہوا۔ اس کے فون کان سے ہٹاتے ہی کسی نے باہر سے دروازہ کھولا تھا اور وہ جو کوئی بھی تھا، اسے دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ میں پکڑے پستول کی نال اس کی جانب کی۔

"ارے یہ لڑکی کہاں تھی؟" ایک اور بڑی عمر کا شخص دروازے سے اندر آیا۔ وہ تو ان کو دیکھ کر پہلے ہی حواس باختہ ہو چکی تھی۔

"خاموشی سے بیٹھ جاؤ لڑکی اور ہمیں ہمارا کام کرنے دو۔" وہ اس سے بولا تو مشعل نے غیر محسوس انداز میں ہاتھ میں پکڑا موبائل اپنی پشت پر کیا اور خاموشی سے بستر پر بیٹھ گئی۔

"سارا گھر دیکھا ہے ناں، بلکہ یہ کمرا بھی دیکھو۔ کوئی قیمتی چیز نہ رہ جائے۔" ہدایت دیتا وہ بولا تو دوسرا چیک کرنے کو آگے بڑھا اور الماریاں کھول کر چیک کرنے لگا۔ اسی وقت مشعل کے ہاتھ میں پکڑا اس کا موبائل بج اٹھا تو جہاں وہ بری طرح گھبرا گئی، وہیں وہ بھی چونک اٹھے۔

"موبائل نکالو لڑکی۔" سختی سے اسے مخاطب کیا تو اس نے جلدی سے موبائل اس کی جانب بڑھا دیا۔

"کہیں اس نے کسی کو اطلاع نہ کر دی ہو۔" ایک پریشانی سے بولا۔ اسی وقت ایک لڑکا بھاگتا ہوا آیا۔

"ابا..... پولیس کی گاڑی آ رہی ہے۔ جلدی کرو۔"

"تو نے کہاں دیکھی؟" پریشانی ان کے چہرے سے عیاں تھی جبکہ مشعل کے لرزتے دل کو کچھ سکون ملا۔

"چھت سے دیکھ کر آ رہا ہوں، جلدی کرو۔"

"اسی لڑکی کی کارستانی ہو گی یہ۔"

"اوہو ابا! اسے چھوڑو، اسے گاڑی میں بٹھاؤ جسے لے جانا ضروری ہے۔ جلدی کرو۔" وہ افراتفری میں بھاگے تو ان کے جملے پر غور کرتی، وہ بری طرح چونکی۔

"ریشم..... کہیں وہ ریشم کو تو اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ اوہ میرے خدا۔" خود کلامی کرتی وہ اپنا سر تھام کر بیٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

"ہائے، کہا تھا..... کہا تھا کہ مجھے ساتھ لیتے چلو۔ مگر سنتا کون ہے، مجھ بے چاری کی۔ اہمیت ہی کب دی ہے، خود سب کے سب نکل لیے وحید مراد بن کر۔"

فریدہ تائی کا واویلا گھر میں موجود ہر شخص نے سنا تھا۔ خیر سے ان کی آواز تھی ہی اتنی بلند کہ گھر کے ہر کونے تک بخوبی پہنچ جاتی۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ افسوس سے ہاتھ مل رہی تھیں مگر صدمہ تھا کہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا اور سامنے کرسی پر جھولتی فرزانہ سے اپنی مسکراہٹ چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ فیس بک سے نگاہیں ہٹا کر اس نے فریدہ تائی کو دیکھا۔

"ویسے تائی چلی تو آپ ساتھ جاتیں، آخر بڑی ہیں ہمارے اس گینگ کی۔ میرا مطلب ہے خاندان کی۔" توجہ سے اس کی بات سنتی فریدہ تائی کے تاثرات لفظ "گینگ" پر بدلے تو اس نے جملہ بدلا۔

"مگر پھر آپ کو واپس کون لاتا۔ آپ کو دوڑانے کے چکر میں یہ سب بھی پولیس کے ہاتھوں مارے جاتے یا جیل کی ہوا کھا رہے ہوتے۔"

اس کی بات پر ان کا منہ بن گیا حالانکہ اس نے

کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا۔ بھلا اپنے بھاری بھرکم جسم کے ساتھ وہ دوڑ ہی کب سکتی تھیں مگر افسوس تھا تو یہ کہ اس بار ان کے ہاتھ کچھ نہ آسکا تھا چونکہ وہ جلدی میں نقدی اور زیورات کے بیگ وہیں چھوڑ آئے تھے اور اس سب کی قصوروار بھی وہی ٹھہری تھی، جو کمرے میں ان کی گفتگو سنتی گم صم سی بیٹھی تھی۔

''اور رہی وحید مراد کی بات تو وہ چور کی اولاد تو ہرگز نہیں تھا۔'' فرزانہ کے مزے سے کہنے پر اندر آتی، اس کی ماں نے اسے گھورا تو وہ کندھے اچکاتی دوبارہ موبائل میں مصروف ہوگئی مگر بڑبڑانے سے باز نہ آئی۔

''اب جو پیشہ ہے سو ہے۔''

''بھابھی! آپ اس بات پر دھیان دیں کہ آخر اس میں کوتاہی کس کی ہے۔'' راشدہ چچی نے ان کی توجہ کہیں اور مبذول کروانی چاہی۔

''وہ تو میں اچھی طرح سے سمجھ رہی ہوں کہ کس کی لاپروائی اور نیت کا پھل ہے جو ہم کھا رہے ہیں۔'' فریدہ تائی نے کمرے کی طرف منہ کرکے کہا حالانکہ ان کی آواز اندر تک صاف جا رہی تھی۔ بستر پر بیٹھی ریشم اپنی نرم ہتھیلیوں پر ابھری لکیروں کو تکنے لگی۔ آخر کیا تھا ان لکیروں میں، کیا وہی بے بسی جو عرصے سے اس کا مقدر بنی ہوئی تھی؟ کیا یہی اس کا نصیب تھا جس پر اسے راضی ہوجانا چاہیے تھا؟ لاتعداد سوالات تھے اس کے پاس، جن کا جواب وہ ایک عرصے سے تلاش کر رہی تھی۔

اپنی سوچوں میں گم وہ اٹھ کر کمرے کی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ باہر سے آتی آوازیں مدھم ہوئی تھیں یا اس کے دھیان کا پنچھی کہیں اور پرواز کر گیا تھا۔ اس نے سوچنا ضروری نہیں سمجھا کیونکہ سوچیں اسے اس آنگن میں لے گئی تھیں جہاں اس نے اپنے ماں باپ کے درمیان آنکھ کھولی تھی۔ محبتوں اور خوشیوں سے بھرا وہ آنگن ہر دم مہکتا تھا۔ ہر گزرتا پل گویا زندگی کی خوب صورتی پر اس کا ایمان بڑھا دیتا تھا۔

پھر اچانک جیسے کوئی سیلاب آیا تھا جو اس کی ساری خوشیوں اور محبتوں بھرے رشتوں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

وہ میٹرک میں تھی جب اسے اپنے ماں باپ کی حادثاتی موت کا علم ہوا تھا۔ وہ اپنا آخری پرچا دے کر خوش اور مطمئن سی گھر پہنچی تھی، اپنے گھر میں غیر معمولی رش دیکھ کر وہ ٹھٹکی مگر ماں باپ کو کفن میں لپٹے دیکھ کر تو وہ گویا ساکت ہی ہوگئی تھی۔ اس کے باپ کی بائیک کا بس سے — ایکسیڈنٹ ہوا تھا

اس کے باپ کے رشتہ داروں نے اسے اپنے پاس رکھنے سے پہلو تہی کر لی تھی۔ جوان ہوتی لڑکی کی ذمہ داری کوئی بھی اٹھانے کو تیار نہیں تھا۔ ایسے میں ابا کے دور پار کے رشتہ دار جو اتفاقاً یہاں آ نکلے تھے اور جنازے میں شامل ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کی ذمہ داری اٹھانے کی ہامی بھر لی۔ ڈری سہمی معصوم آنکھوں سے اس نے انہیں پہلی بار دیکھا تھا۔

ماں باپ کے انتقال کے تیسرے روز وہ ان کے ساتھ ٹرین پر سوار ہوگئی تھی۔ انہوں نے اسے تسلی دی تھی کہ وہ اس کا بہت خیال رکھیں گے اور اسے ان کے ہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ وہ خاموشی سے اجنبی راستوں پر سفر کرنے لگی تھی۔ اس گھر کے مکینوں نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔

''غضب خدا کا، جوان لڑکی کی ذمہ داری اٹھالی۔ ارے میں پوچھتی ہوں، کون سی حاتم تائی کی اولاد ہو جو یہ سخاوت دکھائی۔'' فریدہ تائی نے انور تایا کو لتاڑا تھا۔

''ہاں تو کوئی بوجھ تھوڑی بنے گی۔ الٹا ہمیں ہی فائدہ پہنچائے گی نیک بخت۔ اس کے باپ کا اپنا مکان ہے، وہ کرائے پر چڑھا دوں گا تو پیسے آتے رہیں گے۔''

اور تائی کی زبان کو گویا تالا لگ گیا تھا۔ رہیں راشدہ چچی تو انہیں بھی کرائے کا سن کر تسلی ہوئی تھی اور باقی بچے فرزانہ اور شہزاد تو فرزانہ اپنے آپ میں مگن سی لڑکی تھی، عمر میں اس سے کچھ چھوٹی تھی مگر مزاج کی نازک اتنی کہ موڈ ہوتا تو ہنس بول لیتی ورنہ سلام تک کرنے کی روادار نہ تھی۔

شہزاد جو اس سے عمر میں چار سال بڑا تھا، اسے

پہلی نظر میں ہی پسند نہیں آیا تھا۔ اس کے دیکھنے کے انداز اور سیٹی کے انداز میں گول ہوئے ہونٹ اسے زہر لگا کرتے تھے۔ کچھ بھی تھا نہ چاہتے ہوئے ہی سہی اسے اپنی نئی زندگی شروع کرنی پڑی تھی۔

فریدہ تائی اور راشدہ چچی کا رویہ بھی اس کے ساتھ ویسا ہی تھا جیسا اپنے بچوں کے ساتھ۔ نہ زیادہ لگاوٹ دکھاتیں، نہ برا رویہ رکھتیں۔ فرزانہ اور شہزاد دونوں ہی کچھ کام چور تھے جس کی وجہ سے انہیں اکثر تائی اور چچی کی جوتیاں کھانی پڑتیں۔ جبکہ اس کے لیے ایسا ماحول خاصا عجیب تھا۔ اس نے تو ماں باپ کو کبھی اونچی آواز میں بات کرتے نہ سنا تھا کجا کہ جوتے مارنا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کرنا۔ کتنے دنوں تک وہ ان مناظر پر حیران ہوتی رہی۔

دوسری حیران کن بات ان سب کا کچھ عرصے بعد شہر اور ٹھکانا تبدیل کرنا تھا اور ایسا ہر چھ سات مہینوں میں ہوتا تھا۔ سال لگا تھا اسے سمجھنے میں اور وہ پھر سے ایک نئی تکلیف سے ہمکنار ہوئی تھی۔

یہ وہ کن لوگوں میں آ گئی تھی جن کا پیشہ لوگوں کے گھروں میں گھسنا، ان کا اعتماد حاصل کرنا اور پھر ان ہی گھروں میں چوری کرنا تھا۔ وہ اپنی قسمت پر نئے سرے سے روئی تھی، ساری عمر اس کو نیکی اور ایمان داری کا سبق دینے والے اس کے ماں باپ جو قبر میں جا سوئے تھے بھلا ان کے پڑھائے سبق وہ کیسے بھول سکتی تھی۔

ایسے میں اسے اپنی پڑھائی کا خیال آیا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے وہ اسی کشمکش میں تھی کہ کیسے اپنی پڑھائی کی بات انور تایا سے کرے۔ مگر اصلیت جاننے کے بعد اسے اپنی پڑھائی ہی نجات دہندہ لگنے لگی اور اس نے ہمت کر کے تایا سے بات کی۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد تایا نے اسے اجازت دے دی تھی کہ وہ پرائیوٹ بی اے کر لے۔ فریدہ تائی نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا مگر تایا نے شاید انہیں کچھ سمجھا دیا تھا جس پر وہ خاموش ہو گئی تھیں۔ یوں بھی اس گھر کے دونوں بچوں کو نہ تو پڑھائی کا شوق تھا نہ کسی نے توجہ دی تھی۔ فرزانہ تو یوں بھی فیشن کی دلدادہ تھی یا پھر ٹی وی دیکھنے کی شوقین۔ پڑھائی کو تو وہ آٹھویں میں ہی خیرباد کہہ چکی تھی اور رہا شہزاد تو اس نے جیسے تیسے میٹرک پاس کر ہی لیا تھا۔

بہرحال اسے اپنے آگے پڑھنے سے کچھ حوصلہ ہو گیا تھا۔ ساتھ میں وہ یہی کوشش کرتی کہ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی رہے تاکہ تائی اور چچی کو کوئی شکایت نہ ہو۔ زندگی کچھ اور آگے بڑھی، اس نے اپنا بی اے مکمل کر لیا۔ وہ بھی امتیازی نمبروں سے، اب اس کا ارادہ ایم اے کرنے کا تھا جس پر فریدہ تائی کو سخت اعتراض تھا اور جس کا وہ اٹھتے بیٹھتے اظہار کرتی تھیں۔ مگر انور تایا کو اس میں کوئی حرج نظر نہیں آ رہا تھا۔

ایسے میں جب فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا تو فریدہ تائی نے شرط رکھی کہ اس بار وہ بھی ان کے ساتھ کام میں شامل ہو گی تب وہ اجازت دیں گی اور اس کا گویا سانس ہی رک گیا تھا۔ اسی سے تو وہ بچنا چاہتی تھی مگر سچ یہی تھا کہ دلدل میں رہتے ہوئے وہ اپنے آپ کو بچا نہیں پائی تھی اور اسے ان کے ساتھ شامل ہونا پڑا تھا۔ مشکل سے ہی سہی اس نے سارے مراحل طے کر لیے تھے مگر عین وقت پر بدحواسی میں وہ سارے بیگ وہیں چھوڑ آئی تھی جو انور تایا نے اس کے سپرد کیے تھے اور جس پر تائی اس سے سخت نالاں تھیں۔

☆☆☆

"یوں ہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو گے تو کھاؤ گے کہاں سے؟" فریدہ تائی کی تیز طنزیہ آواز نے اس کے قدم روکے۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے اور وہ اپنے سر میں اٹھتی درد کی لہر کو بمشکل دبائی چائے بنانے کی غرض سے کچن تک آئی تھی۔

"کتنے طعنے مارے گی۔ ہو گئی غلطی..... اب ڈھونڈ رہا ہوں نا کوئی اور گھر۔ آخر کیا چاہتی ہے، رات کو بھی سکون کا سانس نہ لوں۔" انور تایا کی جھنجلائی ہوئی آواز پر گہرا سانس لیتی وہ کچن میں گھس گئی اور چائے کا پانی رکھنے لگی مگر کان ہنوز لاشعوری طور پر ان کی گفتگو پر لگے تھے۔

"نقصان تو جو ہونا تھا وہ ہو ہی گیا، پر اب اپنی

آنکھیں کھولو اور کچھ عقل کے ناخن لو انور میاں۔"

"کیا مطلب؟" وہ ناسمجھی سے بیوی سے بولے۔

"میں بھی کس سے کہہ رہی ہوں، کل کو عقل سے کام لیا ہوتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔"

"اب منہ سے پھوٹے گی بھی یا نہیں۔" انور تایا کی برداشت جواب دینے لگی، یوں بھی آج پورا دن وہ گھر سے باہر ہی رہے تھے۔

"ارے میں کہتی ہوں اس نقصان سے سبق سیکھو تاکہ کل کو نئی مصیبت نہ گلے پڑ جائے۔" تائی کے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ چائے میں دودھ ڈالتی وہ چونکی۔

"منع کیا تھا کہ اس لڑکی کو اتنا نہ پڑھاؤ۔ اس کی پڑھائی ہمارے کس کام کی پر تم نہ مانے۔ آج جو نقصان ہوا سو ہوا، پر کل کو اس سے بڑا نقصان نہ اٹھانا پڑ جائے۔"

"مجھے کیا خبر تھی، میرا تو خیال تھا کچھ پڑھ لے گی تو ہماری زیادہ اچھی طرح مدد کرے گی۔ کوئی چالاکی ہی سیکھ لے گی۔" تایا کی آواز میں افسوس تھا۔

"جو ہوا سو ہوا، اب میری بات پر دھیان دو۔" فریدہ تائی کا انداز رازدارانہ تھا۔ چائے کپ میں انڈیلتا اس کا ہاتھ لمحے بھر کو کانپا۔

"اب عقل مندی اسی میں ہے کہ اس کو قابو کر لو۔ کل کو ہمیں چکمہ دے کر نکل گئی تو جو پیسہ اس پر لگایا ہے، وہ سارا برباد ہو جائے گا۔"

"اب کیا پہرا لگا دوں اس پر اور پھر جائے گی کہاں۔" تایا کی اکتائی ہوئی آواز پر تائی چٹخیں۔

"بس وقت پر نہ سمجھنا بعد میں نقصان اٹھانا۔"

"تو بتا نا کیا کروں۔"

"پکا کام کرو۔ شہزاد سے اس کا نکاح پڑھا دو۔" تائی کی بات نے گویا اس کی سانسیں تک روک لیں۔

"اس طرح یہ ہمیشہ ہمارے قابو میں رہے گی اور کہیں نکلنے کا تو سوچے گی بھی نہیں۔"

"یہ تو تو نے بہت ہی اچھا حل نکالا ہے۔ دماغ بہت چلتا ہے تیرا۔" انور تایا شاید کچھ اور بھی کہہ رہے تھے مگر اس کے کان گویا سن ہو کر رہ گئے تھے۔

☆☆☆

وہ رات اس نے کانٹوں پر بسر کی تھی۔ جس ڈر اور خوف کا وہ اتنے سالوں سے شکار تھی اور جس سے بھاگنا چاہتی تھی، وہی اس کی شناخت بننے جا رہی تھی۔ یہی سوچ اسے بے چین کیے جا رہی تھی۔ پچھلے کچھ عرصے میں اس نے بہت خوش کن خواب اپنی آنکھوں میں سجا لیے تھے کہ کیسے اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے۔ اسے باعزت طریقے سے سر اٹھا کر جینا تھا۔ وہ جو ہر دم لوگوں سے گھبراتی آئی تھی کہ کوئی اس کے بارے میں جان نہ جائے، وہ جن لوگوں کا حصہ ہے کہیں ان کا حوالہ اس کی پہچان نہ بن جائے اور اب وہ کیسے خود کو بچا پائے گی۔

یہ سوچ اسے پریشان کر رہی تھی اور پھر شہزاد جیسے شخص کا تصور بھی اس کے لیے سوہان روح تھا۔

صبح اس کے بدترین خدشات سچ ثابت ہو گئے جب تائی نے شہزاد اور اس کے رشتے کا اعلان کیا، جہاں اس کا رنگ اڑا تھا وہیں شہزاد کی باچھیں کھل اٹھیں۔

"کل جمعے کے بعد نکاح ہوگا۔" فریدہ تائی نے فیصلہ سنایا جبکہ راشدہ چچی کو یہ فیصلہ کچھ خاص پسند نہیں آیا تھا، یقیناً وہ فرزانہ کے لیے شہزاد کو سوچے ہوئے تھیں۔ مگر فرزانہ گھر میں ایسی تقریب کا سن کر خوش ہو گئی تھی، اسے شہزاد میں چنداں دلچسپی نہ تھی۔

اور وہ جو اپنے دل کو بہلا رہی تھی کہ اتنی جلدی کچھ بھی نہ ہوگا، اسے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا۔ اپنے اندر اٹھتے ابال کو دباتی وہ کچن میں گھس گئی۔ سنک میں پڑے برتن دھونے کے ارادے سے ہاتھ بڑھایا تو اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کے خیال سے چونکی۔ شہزاد دانت نکالتا قریب آیا۔

"دلہنیں کام کرتی اچھی نہیں لگتیں۔"

کاش وہ کہیں غائب ہو سکتی۔ ایک بے بس سوچ نے اس کا دامن پکڑا۔ وہ شخص تو اسے لمحے بھر کو برداشت نہ تھا پھر ساری زندگی اسے کیسے برداشت کر پائے گی۔

وہ سوچوں میں الجھی تھی۔ شہزاد کے چٹکی بجا کر

متوجہ کرنے پر وہ بری طرح چونکی، وہ شاید کچھ کہہ رہا تھا جو وہ سن نہیں سکی تھی۔

''ہائے قسم سے تمہارا یہ گم صم سا انداز تو مجھے مار ہی ڈالتا ہے۔'' اس کے چھچھورے انداز پر اس کا دل چاہا کہ اس کی نظروں سے کہیں دور بھاگ جائے۔

''تم یہاں سے جاؤ گے یا میں چلی جاؤں۔'' وہ تو اسے کبھی بھی برداشت نہیں تھا سو ناپسندیدہ لہجے میں بولی۔

''بس آج کا دن ہے پھر تو تم میرے نام ہو جاؤ گی تو پرمٹ مل جائے گا مجھے۔ مطلب ہر طرح کی آزادی۔''

اس کے بے ہودہ انداز پر اس کا خون کھول اٹھا۔ پیر پٹختی وہ کچن سے نکل گئی مگر اس سے کیا ہونا تھا۔ اسے اپنی زندگی سے کیسے نکالتی۔

یہ سوچ اسے بے چین کیے جا رہی تھی۔ شام تک وہ کمرے میں بے چینی سے چکر کاٹتی رہی۔ تائی نے بھی آج اسے کوئی کام نہ کہا تھا جس پر اس نے شکر کیا۔ ماں باپ کی وفات کے بعد اس نے اس زندگی کو نہ چاہتے ہوئے بھی قبول کر لیا تھا مگر اب جو ہونے جا رہا تھا، اس کا دل اس کو قبول کرنے پر کسی طرح رضامند نہ تھا۔

اس نے کہیں پڑھا تھا کہ انسان چاہے تو اپنی قسمت بدل سکتا ہے اور تب یہ جملہ پڑھ کر وہ کتنی دیر خود پر ہنستی رہی تھی کہ یا تو لکھنے والے نے ایسے حالات ایسی بے بسی محسوس نہیں کی یا پھر اس کا شمار ایسے عظیم انسانوں میں نہیں ہوتا۔ مگر آج اس کا دماغ اسے کچھ ایسا کرنے پر اکسا رہا تھا جو اسے اس صورت حال سے نکال سکے۔

دل کے خوف کے باوجود اس نے وہ فیصلہ کر لیا تھا جو وہ اتنے سالوں میں نہ کر سکی تھی۔ اسے یہاں سے نکلنا ہوگا کیونکہ اب یہی راہ نجات تھی۔ مگر وہ جائے گی کہاں، اس کا تو اس دنیا میں اور کوئی نہ تھا۔ اس سوچ نے اسے ڈگمگا دیا مگر وہ یہاں رہ کر ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی کو اندھے کنویں میں نہیں دھکیل سکتی تھی۔

اس سوچ نے اسے کچھ ہمت دلائی۔ وہ جس محلے میں رہتے تھے، وہاں اس کی ماں کی اپنے پڑوسیوں سے بہت دوستی تھی بلکہ ان آنٹی نے تو امی کو اپنی بیٹی بنا رکھا تھا، اسے وہ یاد آئی تھیں۔ ان دنوں وہ کچھ بیمار تھیں، جب اس کے ماں باپ کی موت ہوئی تھی اور ان کی بہو وہ بھی تو اس کی ماں کی سہیلی تھی تو کیا اسے وہاں جانا چاہیے تھا۔

شام تک فیصلہ ہو گیا تھا اور کوئی اپنا تھا بھی تو نہیں، جس کے پاس وہ جاتی۔ اسے اپنے محلے کا نام یاد تھا اور یہ بھی غنیمت تھا۔ مغرب کی نماز پڑھ کر اس نے اپنا مختصر سا سامان باندھ لیا تھا۔ اپنے آپ کو بمشکل نارمل ظاہر کرتے اس نے رات کا کھانا وقت سے پہلے ہی کھا لیا تھا پھر تائی کو اپنے سونے کا بتا کر وہ کمرے میں آ گئی۔ شہزاد گھر پر نہیں تھا اور وہ اکثر رات میں دیر سے گھر آتا تھا، اسی لیے اس کی طرف سے اسے ڈر نہیں تھا۔

اسے سب کے کمرے میں جانے کا انتظار تھا اور ان کے جاتے ہی وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتی گیٹ تک آئی تھی۔ گیٹ لاک نہیں کیا گیا تھا، وہ شہزاد ہی آ کر کیا کرتا تھا۔ بے آواز کنڈی کھولتے ہوئے اس کا سانس تیزی سے چل رہا تھا اگر اسے کوئی دیکھ لیتا تو اس کی شامت آ جاتی۔ چادر میں اپنا منہ چھپاتی وہ گلی میں نکل آئی۔

ابھی وہ دو چار قدم ہی چلی تھی کہ سامنے سے آتے شہزاد کو دیکھ کر اس کا سانس رکا مگر اس نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ جلدی سے قریب درخت کی اوٹ میں چھپ گئی۔ اس کے جانے کے پانچ منٹ تک وہ وہیں کھڑی رہی۔ یقیناً وہ گیٹ کھلا دیکھ کر حیران ہوا ہوگا۔ کچھ ڈرتی جھجکتی وہ جلدی سے سڑک تک پہنچی۔ اسے ٹرین کے لیے وقت پر پہنچنا تھا۔ رکشہ ملتے ہی اس کا حلق میں اٹکا سانس کچھ بحال ہوا۔

ٹرین سے اپنے شہر تک کا سفر کرتے ہوئے اس کا دل عجیب سے خوف کا شکار تھا۔ اگر ان لوگوں نے اسے سہارا نہ دیا تو وہ کیا کرے گی۔

اور اس سے آگے اس کی سوچوں کا سلسلہ گویا رک جاتا تھا۔ ذہن اتنا ماؤف ہو رہا تھا کہ وہ اس سے زیادہ سوچنے کی خود میں ہمت نہیں پا رہی تھی۔ دل میں

بہت سی دعائیں پڑھتی، وہ رات گیارہ بجے اپنے اسٹیشن تک پہنچی تھی۔

ٹرین کا سفر یوں بھی اس کے لیے نیا نہیں تھا، جب بھی وہ لوگ شہر تبدیل کرتے ٹرین سے ہی سفر کرتے تھے۔

محلے کا نام پتا ہونے کی وجہ سے اسے وہاں پہنچنے میں زیادہ مشکل نہیں پیش آئی تھی، وہاں تک پہنچنے میں۔ ان گلیوں سے گزرتے ہوئے اس پر عجیب سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ اس کا بچپن یہیں تو گزرا تھا۔ ماں کا ہاتھ پکڑے اسکول جاتے وہ سب ہی گھروں کو غور سے دیکھا کرتی تھی اور ماں سے چھوٹے چھوٹے سوالات کیا کرتی تھی۔ ماضی کا ہاتھ تھامے وہ گلیوں سے گزرتی اس گلی تک پہنچ گئی تھی جہاں اس کا گھر تھا۔

اس خاکی گیٹ کے سامنے کتنی دیر وہ سن سی کھڑی رہی تھی۔ کب سوچا تھا کہ پھر سے یہاں آپائے گی۔ اس کا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ اس گیٹ سے اندر چلی جائے اور ان در و دیوار کو نظر بھر کر دیکھے مگر اپنی خواہش پر قابو پاتے، آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرتی وہ ساتھ والے گیٹ کی جانب آ گئی۔

اسٹیشن سے یہاں تک پہنچنے میں اسے گھنٹہ لگ گیا تھا۔ رات کا وقت تھا، اسے یہاں زیادہ دیر کھڑے ہونا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ بیل پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ جانے کیا ہونے والا تھا۔

گیٹ ایک بڑی عمر کے چاچا جی نے کھولا تھا۔

"مجھے گھر کی مالکن سے ملنا ہے۔" اس کے کہنے پر چاچا جی نے اسے اور اس کے سامان کو دیکھا۔

"بی بی وہ لوگ تو گاؤں گئے ہوئے ہیں۔" اور اس کا گویا دل ہی ڈوب گیا۔

"کب تک آئیں گے؟"

"معلوم نہیں کہہ کر تو گئے ہیں کہ زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔"

"آ..... آپ میری ان سے بات کروا سکتے ہیں؟" اس نے امید سے کہا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سر ہلایا۔ پھر موبائل نکال کر نمبر ملایا، چند منٹ بعد نفی میں سر ہلایا۔

"ان کے گاؤں میں سگنل کا مسئلہ ہے۔ دن میں کسی وقت بات ہو پائے گی۔ آپ اب جاؤ، دن میں چکر لگانا میں کوشش کروں گا بات کروا دوں۔"

"مگر میں تو دور سے آئی ہوں چاچا جی! اس وقت کہاں جاؤں گی۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"میں کیا کر سکتا ہوں، گھر والے مجھے چوکیداری پر بٹھا کر گئے ہیں۔ میں ان کی اجازت کے بغیر کسی کو اندر نہیں ٹھہرا سکتا۔"

چاچا جی کے کہنے پر وہ پریشان سی کھڑی رہ گئی۔ بھلا اس شہر میں اس کا تھا ہی کون، جس کے پاس جاتی۔ بیگ قدموں میں رکھے چہرہ چادر میں چھپائے وہ وہیں گیٹ کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت گویا سلب ہو کر رہ گئی تھی، وہ بھلا کب یوں اکیلے کہیں گئی تھی۔ نہ وہ اتنی بہادر تھی، یہ تو بس آگے کی زندگی کا خوف اس پر اس قدر حاوی ہوا تھا کہ وہ اپنی قسمت آزمانے نکل کھڑی ہوئی تھی کہ شاید یوں وہ اپنے آپ کو زندگی بھر کے نقصان سے بچا پائی۔

اسے یہاں کھڑے پون گھنٹہ گزر گیا تھا، جب گیٹ دوبارہ کھلا اور چاچا جی کی صورت نظر آئی۔

"اندر آ جاؤ۔" ان کا ضمیر شاید انہیں چین نہیں لینے دے رہا تھا، جو وہ اسے دیکھنے آ گئے تھے یا انہیں اس پر ترس آ گیا تھا جو بھی تھا وہ ممنون نگاہوں سے انہیں دیکھتی اندر آ گئی۔

"رات بہت ہو گئی ہے، اسی لیے اندر بیٹھنے کی اجازت دے رہا ہوں۔" پلاسٹک کی کرسی اس کے لیے رکھتے چاچا جی نے جتاتے لہجے میں کہا۔

"میں سامنے ہی بیٹھا ہوں، کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔"

انہوں نے اسے دھمکانا ضروری سمجھا پھر وہ خاصے فاصلے پر اپنی کرسی رکھ کر بیٹھ گئے۔ اس کے لیے یہ بھی غنیمت تھا، خوف کچھ کم ہوا تھا۔ ساری رات چاچا جی اس کی چوکیداری کرتے رہے۔ نیند تو اس کی آنکھوں سے بھی دور تھی سو وہ بھی سوچتی رہی کہ اگر صبح

اس کی بات اس گھر کے مکینوں سے نہ ہو سکی تو وہ کہاں جائے گی۔ شاید ایدھی سینٹر..... ہاں اس کے علاوہ اس کے پاس سوچنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

فجر کے قریب چاچا بھی اونگھنے لگے مگر وہ آسمان پر نگاہیں لگائے ہی بیٹھی رہی پھر وہ نماز پڑھنے کے لیے اٹھ گئے۔ ان کے نماز پڑھنے کے بعد اس نے بھی باہر بنے غسل خانے سے وضو کیا اور پھر ان سے جائے نماز لے کر نماز ادا کی۔

چاچا کسی سوچ بچار میں تھے شاید ناشتا کرنے باہر جاتے تھے اور اس کی وجہ سے جا نہیں پا رہے تھے۔ ان کی نگاہیں بار بار گھڑی پر پڑتی تھیں پھر اس پر۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، گاڑی کے ہارن کی آواز پر وہ چونکی، وہیں چاچا جی حیرت و خوشی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''لگتا ہے، گھر والے آ گئے ہیں۔'' اس سے کہتے ہوئے وہ گیٹ کھولنے لگے اور وہ بھی خوش ہوتی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی یقیناً اس کی دعا قبول ہو گئی تھی۔

وہ اس گھر کے مکین ہی تھے جو واپس لوٹ آئے تھے۔ ان بڑی عمر کی خاتون نے اسے حیرت سے دیکھا تھا، ساتھ ان کی بہو بیٹا اور ان کی تین بیٹیاں تھیں جو اس سے کچھ چھوٹی لگ رہی تھیں۔

''آٹھ نو سال پہلے ساتھ والے گھر میں جمال خان رہتے تھے۔ میں ان کی بیٹی ہوں اقصیٰ جمال۔'' اس نے جھجکتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ دل میں خوف سا تھا اگر وہ اسے نہ پہچانے۔

ان خاتون نے اپنا چشمہ درست کر کے اسے بغور دیکھا۔

''تم جمال اور عذرا کی بیٹی ہو۔'' اس نے بے اختیار اثبات میں سر ہلایا۔

''ماشاء اللہ، کتنی بڑی ہو گئی ہو۔ آؤ، اندر آ جاؤ۔''

نادرہ خاتون نے اسے گلے لگاتے ہوئے خوشی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ اسے اپنا خوف کسی قدر کم ہوتا محسوس ہوا تھا۔ ان کی بہو فائزہ بھی خاصی خوش اخلاقی سے ملی تھیں۔ اسے ناشتا کرانے کے ساتھ اس کی ماں کی باتیں کرتی رہیں۔ ناشتے کے بعد انہوں نے اس کے لیے ایک کمرا تیار کر دیا کہ اب وہ آرام کر لے۔

وہ بھی رات کی تھکی ہوئی تھی، اسی لیے ان کی ممنون ہوتی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ چند لمحوں میں ہی نیند کچھ ایسی حاوی ہوئی کہ کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ ملا۔

☆☆☆

وہ سو کر اٹھی تو دوپہر کا وقت تھا۔ فائزہ آنٹی کھانا بنا رہی تھیں۔ نادرہ آنٹی نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ اپنے سفر کا احوال سنا رہی تھیں پھر اچھے ماحول میں ان سب نے کھانا کھایا۔ اپنی بیٹیوں کو کمرے میں بھیج کر فائزہ آنٹی بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئیں۔

دونوں نے اس سے یہاں اکیلے آنے کا مقصد پوچھا تو اس نے ان سے کچھ بھی نہ چھپایا۔ گزرے سالوں کی ساری روداد سنا دی۔ اسے وہ سب بتاتے ہوئے شرمندگی بھی محسوس ہوئی مگر اسے سچ بتانا ہی مناسب لگا۔

اس کے خاموش ہونے پر نادرہ خاتون کچھ دیر کسی سوچ میں غرق رہیں، پھر چشمہ درست کرتی اس سے مخاطب ہوئیں۔

''دیکھو بیٹی! ہمیں تمہیں یہاں رکھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے مگر تمہارے یہاں رہنے سے تمہارے لیے ہی مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ تمہارے ماں باپ کے گھر سے ہماری دیوار ملی ہوئی ہے اور پھر وہ بڑے میاں کرایہ لینے کے لیے آتے ہیں۔ ایسے میں اگر انہوں نے تمہیں کہیں آتے جاتے دیکھ لیا، تم سمجھ رہی ہو نا..... میں کیا کہہ رہی ہوں۔''

''جی، مگر میں کہاں جاؤں گی۔ ایک آپ کے گھر کا ہی تو سوچ کر میں یہاں تک آئی تھی۔'' اقصیٰ کے لہجے سے مایوسی چھلکی۔

''تم پریشان نہ ہو۔ میری ایک پرانی جاننے والی ہیں، میں ان سے بات کرتی ہوں۔ وہ اگر تمہیں اپنے پاس رکھ لیں تو بہت اچھا ہو جائے گا۔'' نادرہ خاتون کے تسلی آمیز لہجے سے اسے خاصا حوصلہ ہوا۔

''آپ ان سے بات کریں، میں سارے کام

کرلوں گی بلکہ کھانا بھی بہت اچھا بنا لیتی ہوں۔"

"خیر کاموں کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے ان کے گھر۔ میں ان سے بات کرتی ہوں، وہ راضی ہو جائیں تو ان کا گھر تمہارے لیے بہت اچھا رہے گا۔ بچے ان کے باہر ہیں۔ خود وہ شوہر کے بعد اکیلے اپنے گھر میں رہتی ہیں۔"

اسے تسلی دیتی، وہ اسے بھی آرام کرنے کا کہہ کر اٹھ گئیں۔ شام میں انہوں نے ان خاتون سے بات کرلی تھی اور اسے صبح کی تیاری کرنے کا کہہ دیا تھا۔ طے یہ ہوا تھا کہ ان کی بہو فائزہ اور بیٹا اسے ان کے پاس پہنچا کر آئیں گے جس پر وہ ان گھر والوں کی ممنون تھی۔

☆☆☆

گیٹ سے اندر قدم رکھتے ہی اس کی نگاہیں شان دار عمارت پر پڑیں جس کی پیشانی پر "ممتاز محل" کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔ ایک سمت کشادہ صحن تھا جس میں خوب صورت پھول پودے گھر کے مکینوں کی خوش ذوقی کو ظاہر کر رہے تھے۔

صحن میں ایک جانب کرسیاں بچھی تھیں جس کے ساتھ اوپر کو جاتی دو سیڑھیاں تھیں جو برآمدے تک جاتی تھیں۔ وہاں پر لکڑی کی خوب صورت کرسیاں رکھی گئی تھیں جن پر شیشے کے کام والی گدیاں رکھی تھیں۔ گملوں میں لگے پودوں اور مختلف بیلوں نے برآمدے کی سجاوٹ کو دوچند کر دیا تھا۔

برآمدے کی بائیں جانب بھی دو سیڑھیاں تھیں جو گیراج میں اترتی تھیں جو کہ اتنا کشادہ تھا کہ اس میں آرام سے چار گاڑیاں کھڑی کی جا سکتی تھیں۔ ان سیڑھیوں سے کچھ آگے جاتے ہی ویسی ہی دو سیڑھیاں تھیں جو دو دروازوں تک جاتی تھیں جو ایک دوسرے سے قدرے فاصلے پر تھے۔ ملازم کے پیچھے وہ ایک دروازے سے اندر داخل ہو گئے تھے۔ وہ ڈرائنگ روم تھا جو اپنی سجاوٹ، نفیس اور خوب صورت فرنیچر کی بدولت بہت اچھا لگ رہا تھا۔ انہیں بٹھا کر ملازم کسی عورت کو ساتھ لے آیا تھا جو خود بھی اس حویلی نما گھر کی ملازمہ ہی لگ رہی تھی۔

"میں سکینہ ہوں۔ بڑی بیگم نے مجھے آپ کے آنے کا بتا دیا تھا۔ انہیں صبح کسی عزیز کی وفات کی خبر ملی تھی، اسی لیے انہیں جانا پڑا۔ آپ چاہیں تو ان کا انتظار کرلیں۔"

ملازمہ نے اپنا تعارف کروانے کے ساتھ انہیں اپنی بیگم صاحبہ کا پیغام بھی دے دیا۔

"نہیں، بس ہم اب چلیں گے۔ ہم نے واپس جانا ہے، آپ ان کو ہمارا سلام کہیے گا۔ ہم بس اس بچی کو چھوڑنے آئے تھے۔"

فائزہ آنٹی نے جواب دیا۔ اتنے میں ایک ملازمہ ٹرالی دھکیلتی آ گئی تو ملازمہ کے اصرار پر وہ کچھ دیر بیٹھ گئے۔ چائے پیتے ہی وہ میاں بیوی اٹھ گئے تھے، انہیں رات تک اپنے شہر واپس بھی پہنچنا تھا۔ وہ دونوں اسے بہت سی تسلیاں دے کر چلے گئے تھے۔

ان کے جاتے ہی ملازمہ اسے اندرونی حصے کی جانب لے گئی جہاں ویسا ہی شان دار لاؤنج تھا۔ ایک جانب کچن تھا جہاں دوسری ملازمہ ٹرالی لیے جا رہی تھی۔ کچھ اور کمروں کے دروازے اور ایک جانب جاتی راہداری بھی تھی جس پر اس کی نگاہ پڑی تھی۔

"بڑی بیگم نے آپ کے لیے کمرا تیار کروایا ہے۔ آپ آرام کرلیں۔" سکینہ نے اس سے کہا پھر دوسری ملازمہ کو آواز دی۔

"نوری۔"

"جی۔" وہ فوراً حاضر ہوئی۔

"جاؤ، ان کو ان کا کمرا دکھا دو۔" وہ سر ہلاتی اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتی، بائیں جانب کی سیڑھیاں چڑھنے لگی تو اس نے بھی اس کی تقلید کی۔

دوسری منزل پر پانچ کمرے تھے اور درمیان میں بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی گئی تھی جہاں صوفے رکھے تھے۔ ایک کمرے کے دروازے پر وہ رک گئی، پھر دروازہ کھول کر اس کا سامان اندر رکھا۔

"میں یہاں رہوں گی۔" اس نے حیرت سے جہازی سائز بیڈ اور دو سنگل قیمتی صوفوں کو دیکھا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک سجا سجایا اور کشادہ کمرا تھا۔

''جی بی بی! آپ کو یہیں ٹھہرانے کا حکم تھا۔ آپ ابھی آرام کرلیں، شام میں، میں آپ کا سامان الماری میں رکھوادوں گی۔'' نوری نے مسکرا کر اپنی خدمات پیش کیں۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ سامان تو میں رکھ لوں گی۔'' اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے، جانے نادرہ خاتون نے اپنی عزیزہ سے اس کے بارے میں کیا کہا تھا کہ اسے اتنی پذیرائی مل رہی تھی۔ حالانکہ اس کا خیال تھا کہ وہ یہاں کوئی کام کرلے گی مگر یہاں تو پہلے سے کام کرنے والوں کی کمی نہ تھی۔ نوری اسے چھوڑ کر چلی گئی تو وہ بھی سر جھٹکتے بیگ سے کپڑے نکالتی نہانے کی غرض سے واش روم میں گھس گئی۔

☆☆☆

شام میں وہ سو کر اٹھی تو نوری دروازے پر دستک دیتی اندر چلی آئی تھی۔

''اچھا ہوا آپ جاگ گئیں، بی جان آپ کا پوچھ رہی تھیں۔''

''بی جان کون؟'' اس نے استفسار کیا۔

''بڑی بیگم صاحبہ، جو اس گھر کی مالکن ہیں۔''

نوری کی وضاحت پر اس نے سر ہلایا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے اٹھ کر بال بنائے پھر دوپٹا درست کرتی باہر نکل آئی۔ پہلی سیڑھی پر قدم دھرتے ہی اسے کسی خاتون کی تیز آواز سنائی دی تھی۔

''غلام بخش! تمہیں معلوم ہے نا' ہم بار بار کی گئی کوتاہی کو معاف کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ اب کی بار وہ ہمیں ممتاز محل کے اندر نظر نہ آئے۔'' لہجے میں اچھی خاصی سختی تھی جس کو محسوس کرتی اقصیٰ دوسرا قدم اٹھانا بھول گئی۔

''بی بی! یہاں کیوں رک گئیں، نیچے آجائیں نا۔'' ہاتھ میں کچھ سامان پکڑے، اوپر آتی نوری نے اسے کھڑے دیکھ کر کہا تو وہ چونکی۔

''یہ کس کی آواز ہے؟''

''یہ تو بی جان کی آواز ہے۔''

''تمہاری بی جان تو بہت غصے والی لگتی ہیں۔''

اس نے خدشے کا اظہار کیا تو نوری مسکرائی۔

''وہ تو بی جان مالی کی نااہلی پر چچا غلام بخش پہ ناراض ہورہی تھیں۔ اصل میں بی جان کا غصہ کچھ تیز ہے مگر آپ گھبرائیں نہیں، اطمینان سے جائیے۔'' اسے حوصلہ دیتی وہ خوش مزاجی سے کہتی آگے بڑھ گئی تو اسے بھی ناچار قدم بڑھانے پڑے۔ چچا غلام بخش کو جاتے دیکھ کر وہ جھجکتی ہوئی اس شخصیت کے سامنے رکی جو ہاتھ میں پکڑی کتاب کی جانب متوجہ تھیں۔

سفید رنگت والے چہرے میں سرخی گھلی ہوئی تھی، جو شاید غصے کے باعث تھی۔ براؤن بال جوڑے میں مقید تھے، سفید غرارہ قمیص انہوں نے زیب تن کر رکھا تھا۔ ساتھ میں ہم رنگ دوپٹا کندھوں پر سلیقے سے ڈال رکھا تھا۔ ایک رعب سا تھا جو ان کی شخصیت سے چھلکتا اقصیٰ کو پوری طرح محسوس ہوا تھا۔ اس کے آہستہ سلام کرنے پر ان کی نگاہیں اٹھیں۔ اسے جواب دیتے، ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کرتے انہوں نے ہاتھ میں پکڑی کتاب اور ناک پر دھرا چشمہ اتار کر قریبی میز پر رکھا۔

''نادرہ خاتون نے ہمیں تمہاری ذمہ داری سونپی ہے، جسے ہم نے بخوشی قبول کیا ہے۔ ان کی بات ہمارے لیے بہت معنی رکھتی ہے۔ آپ کے والدین کا ہمیں افسوس ہے، ہم کوشش کریں گے کہ آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہ ہو۔''

''جی، آپ کا بہت شکریہ۔'' اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ ان کی نظریں خود پر محسوس کرتی وہ نگاہیں جھکا گئی تھی۔

''نادرہ خاتون کو فون کرلیجیے، وہ آپ سے بات کرنا چاہ رہی تھیں۔ فون وہاں رکھا ہے۔''

انہوں نے میز پر رکھے فون کی جانب اشارہ کیا تو وہ سر ہلاتی فون کی جانب بڑھ گئی۔ ساتھ ہی ڈائری کھلی پڑی تھی جس پر نادرہ خاتون کے نام کے ساتھ ان کا نمبر لکھا تھا۔ ایک نظر بی جان پر ڈالی جو اب پھر سے کتاب پڑھنے میں مصروف ہوچکی تھیں، گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے فون کا ریسیور اٹھالیا۔

☆☆☆

ممتاز محل میں آئے اسے تین دن ہو گئے تھے۔ نادرہ خاتون نے اسے بتایا تھا کہ انہوں نے بی جان کو اس کے رشتہ داروں اور ان کے بیٹے کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا اور اسے بھی ذکر کرنے کی ضرورت نہیں اور اس بات نے اسے کسی قدر خائف کر دیا تھا، اسی لیے زیادہ تر وقت وہ اپنے کمرے میں گزارتی۔ ایک نوری تھی جس سے بات کرنا اسے اچھا لگتا تھا مگر وہ بھی اپنے کاموں میں مصروف رہتی تھی۔ بی جان سے ناشتے اور کھانے پر سرسری سی ملاقات ہو جاتی مگر کب تک وہ کمرے تک محدود رہ سکتی تھی۔ یہی سوچ کر وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ نوری جھاڑ پونچھ میں مصروف تھی۔

"بی جان کہاں ہیں؟" اس نے نوری سے دریافت کیا۔

"وہ تو اماں سکینہ کے ساتھ گئی ہیں کسی کام سے، آپ کو کچھ چاہیے۔" نفی میں سر ہلاتی وہ باہر صحن میں نکل آئی۔ صبح کے گیارہ بج رہے تھے اور اچھی خاصی دھوپ تھی۔ کچھ دیر برآمدے میں ٹہلنے کے بعد وہ اندر آ گئی۔ کچن میں جھانکا تو نوری کھانا بنانے کی تیاری کر رہی تھی۔

"کیا بنا رہی ہو؟" اس کے پوچھنے پر وہ متوجہ ہوئی۔

"چکن نکالا ہے۔ سالن بناؤں گی۔ ویسے تو اماں سکینہ میرے سر پر کھڑے ہو کر بنواتی ہیں، مگر آج وہ نہیں ہیں تو میں خود ہی بناؤں گی۔ وہ اس گھر کی پرانی ملازمہ ہیں۔"

"تم کب سے یہاں ہو؟" اسے اچھا لگ رہا تھا کسی سے بات کرنا۔ حالانکہ وہ خود بھی زیادہ نہیں بولتی تھی مگر اتنے دنوں سے کسی سے بات کرنے کو ترس گئی تھی اور پھر نوری سے بات کرنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔

"ہم بھی حویلی والوں کے پرانے نمک خوار ہیں۔ میرے دادا بڑے صاحب کی گاڑی چلایا کرتے تھے اور اماں ابا بھی یہیں کام کرتے تھے۔ اب جب سے اماں سکینہ کے میاں کی وفات ہوئی ہے تو اب ابا ان کی جگہ زمینوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور میری اماں جب سے بیمار ہوئی ہیں تو میں نے ان کی جگہ لے لی ہے۔" نوری نے تفصیل سے بتایا۔

"اچھا تم کوئی اور کام کر لو۔ میں کھانا بناتی ہوں۔" اس کے کہنے پر وہ اچھلی۔

"نہ نہ بی بی! آپ کیوں بنائیں گی میرے ہوتے ہوئے۔"

"سارا دن کچھ نہیں کرتی، تھک جاتی ہوں فارغ رہ رہ کر۔ بس تم چھوڑو۔" اس نے زبردستی اس کے ہاتھ سے پلیٹ میں رکھا چکن لیا جسے وہ اچھی طرح دھو چکی تھی۔

"آپ تو میری شامت بلوا کر رہیں گی۔"

"بی جان چاول پسند کرتی ہیں؟" اس کی بات کو نظر انداز کرتے اس نے پوچھا۔

"جی، چاول تو بہت شوق سے کھاتی ہیں۔" پھر اس کے منع کرنے کے باوجود وہ بریانی کی تیاری کرنے لگی تھی، یوں بھی بریانی وہ بہت اچھی بناتی تھی۔ اتنے دنوں بعد کچھ کرنے کو ملا تھا تو اسے خاصا اچھا محسوس ہو رہا تھا۔

بی جان کی واپسی رات کے کھانے کے قریب ہوئی تھی۔ ان کے فریش ہونے تک کھانا میز پر لگ چکا تھا۔ اماں سکینہ پچھلی طرف بنے اپنے کوارٹر میں جا چکی تھیں۔ نوری ان کے لیے وہیں کھانا لے گئی کہ وہ خاصی تھک چکی تھیں۔

کن اکھیوں سے بی جان کو بریانی کھاتے دیکھ کر اس نے رکا ہوا سانس بحال کیا۔

نوری شاید کوارٹر سے آئی تھی، اس کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے بی جان نے اسے پکارا۔

"جی بی جان۔" وہ کچن سے نکل کر میز تک آئی۔

"بریانی کس نے بنائی ہے؟"

"جی وہ....." اس سے ہوتی نگاہ بی جان پر رکی۔ "اقصیٰ بی بی نے۔" وہ کچھ چوری ہو گئی۔ اقصیٰ کا ہاتھ وہیں رک گیا تھا۔

"کیوں، اس گھر میں کیا پہلے کھانا نہیں پکتا تھا جو آپ نے ان سے کھانا بنوایا۔" وہ سنجیدگی سے

بولیں تو اسے بولنے کی ہمت کرنا پڑی۔

"وہ میں فارغ تھی تو میرا دل چاہ رہا تھا، اسی لیے میں نے کھانا بنالیا ورنہ یہ تو مجھے منع کر رہی تھی۔" وہ خاموش ہوگئیں مگر تاثرات سنجیدہ تھے۔ نوری چپکے سے کچن میں گھس گئی۔

"اس گھر میں ملازمین ہیں اور وہ اپنا کام کرنا جانتے ہیں۔" چند لمحوں بعد وہ مخاطب ہوئیں تو انھی کے حلق میں نوالہ اٹکا۔

"جی بہتر۔" اسے کہنا پڑا، البتہ بی جان کے روشن چہرے پر ہلکی سی سرخی شاید ان کی غصے کی چغلی کھا رہی تھی۔ وہ سر جھکا گئی۔

☆☆☆

فجر کی نماز پڑھ کر وہ جب بھی سونے لگتی تو ایک نظر پردہ ہٹا کر ضرور دیکھا کرتی تھی، یہاں سے طلوع ہوتے سورج کا منظر بہت خوب صورت نظر آتا تھا اور ایسے میں بی جان صحن میں چہل قدمی کرتی بھی نظر آجاتیں۔

ناشتا وہ آٹھ بجے کیا کرتیں مگر دن ان کا فجر کے بعد سے شروع ہوجاتا تھا اور وہ ناشتے کی میز پر پہنچ جایا کرتی تھی کہ اسے کبھی دیر تک سونے کی عادت نہیں تھی۔ بی جان کی دن بھر کی اپنی مصروفیات تھیں۔ ناشتے کے بعد وہ اخبار باقاعدگی سے پڑھتیں پھر حساب کتاب کھول کر بیٹھ جاتیں۔ ہر ہفتے کو نوری کا باپ زمینوں اور باغوں کی تفصیلات کے ساتھ پہنچ جاتا یا پھر ان کا اپنے عزیز رشتہ داروں میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ دوپہر میں وہ سوتی تھیں اور شام میں صحن میں بیٹھ کر اکثر کتاب پڑھتی نظر آتیں۔ شام کی چائے وہ وہیں بیٹھ کر پیتی تھیں۔ اس دوران ان کا موبائل بھی زیادہ تر بجتا ہی رہتا تھا۔

ناشتے کے بعد وہ لاؤنج میں ہی پائی جاتی تھیں مگر آج ان کی غیر حاضری محسوس کرتی وہ نیچے آگئی۔ نوری کہیں نظر نہ آئی تو وہ راہداری کی جانب بڑھ گئی۔ تھوڑا آگے جا کر دائیں جانب ایک دروازہ تھا جبکہ بائیں جانب کو تھوڑا آگے جا کر دوسرا دروازہ تھا۔ جو پچھلی طرف کھلتا تھا، جہاں کوارٹرز بنائے گئے تھے۔

وہ واپس اس دروازے کی جانب آگئی، جو بند تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے اس دروازے پر ہلکے ہاتھ سے دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اس کے سامنے ایک وسیع لائبریری تھی جسے دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی تھی۔ بے حد کشادہ اور شیلفس میں سلیقے سے سجی بے شمار کتابیں جن کا اندازہ اسے شیلفس کی تعداد دیکھ کر ہی ہوگیا تھا۔ وہ شیلفس پر لگے ٹیگو پڑھتی آگے بڑھنے لگی۔ دیکھنے میں وہ خاصی پرانی لائبریری دکھائی دیتی تھی لیکن وہ ایک بڑے ذخیرے کو خود میں سموئے ہوئے تھی۔

ایک شیلف سے اشفاق احمد کی "منچلے کا سودا" اٹھاتی وہ سٹنگ ایریا کی جانب آگئی۔ نگاہیں اٹھیں تو قدم زمین نے جکڑ لیے۔ بی جان ایک صوفے پر براجمان تھیں، ہاتھ میں کتاب تھی۔

"رک کیوں گئیں، آؤ بیٹھو۔" کتاب سے نگاہ اٹھا کر وہ بولیں تو وہ اپنی جگہ شرمندہ سی ہوگئی یقیناً وہ اس کی موجودگی سے پہلے ہی باخبر تھیں اور وہ یوں بغیر اجازت کے یہاں دندناتی پھر رہی تھی۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی وہ ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کتابیں پڑھنے کا شوق ہے؟" ابھی وہ الفاظ تلاش کر رہی تھی کہ انہوں نے پوچھ لیا۔

"جی۔ میں نے بی اے کیا ہے۔ پڑھنے کا بہت شوق ہے مجھے۔"

"اچھی بات ہے۔ اس لائبریری میں بے شمار موضوعات پر کتابیں موجود ہیں۔ آپ یہ پڑھ سکتی ہیں۔ ہمیں خوشی ہوگی۔" ان کے چہرے پر نرمی اور شفیق سا تاثر تھا جو اسے بہت اچھا لگا۔

"شکریہ، میں ضرور پڑھوں گی۔" وہ خوش ہوگئی۔

"بلکہ آپ کو آگے پڑھنے کے متعلق بھی سوچنا چاہیے۔"

"میں تو کب سے آگے پڑھنا چاہ رہی ہوں، اگر آپ کی اجازت ہے تو میں ضرور پڑھوں گی۔" ان

کی بات پر اس کے دل کی کلی کھل اٹھی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ آپ اگر یونی ورسٹی جانا چاہتی ہیں تو ہم آپ کا ایڈمیشن کروا دیتے ہیں، اگلے مہینے سے ایڈمیشن شروع ہیں۔"

اقصیٰ نے جھٹ سے سر اثبات میں ہلایا۔

"ٹھیک ہے پھر آپ مضامین کا انتخاب کر لیجیے گا۔" ان کی نگاہیں واپس کتاب پر مرکوز ہو گئیں۔

"آنٹی میں یہ کتاب لے جاؤں پڑھنے کے لیے۔" اس کے منہ سے نکلا۔

چشمہ اتار کر انہوں نے اس کی جانب دیکھا۔

"ہمارے بچے ہمیں بی جان کہتے ہیں، آپ بھی کہہ سکتی ہیں۔ کتاب ضرور لے جائیے، ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو ہم نے آپ کو اجازت دی ہے۔"

خوب صورت مسکان نے ان کے لبوں کو چھوا۔ اس نے تسلیم کیا کہ وہ خاصی خوب صورت خاتون ہیں۔ یقیناً وہ اپنی جوانی میں بے پناہ حسین رہی ہوں گی۔ اب بھی ان کی شخصیت سے ایک وقار جھلکتا تھا۔

"جی شکریہ، بی جان!" اس کے منہ سے پھسلا۔

وہ جانے کو مڑی تو ان کی آواز نے قدم روکے۔

"بریانی بہت مزے دار تھی۔ آپ کا جب بھی دل چاہے، آپ کچن میں جا سکتی ہیں مگر ہمیں خوشی ہوگی اگر آپ اپنی پڑھائی پر زیادہ توجہ دیں گی۔"

ان کی تعریف پر حیران ہوتی وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

ممتاز محل میں رہتے ہوئے وہ مطمئن تھی۔ وہ جو سمجھتی تھی کہ اب کبھی زندگی میں اس ماحول سے نکل نہیں پائے گی۔ اب اسے یہ سب ایک خواب سا لگتا تھا۔ بی جان سے بھی اس کی ہلکی پھلکی بات چیت ہونے لگی تھی۔ اکثر وہ اس سے کتاب پر تبصرہ کرتی تھیں۔ وہ کتابوں کی بے حد شوقین تھیں۔ گو کہ ان کا رویہ دھوپ چھاؤں کا سا ہوتا تھا مگر اسے وہ بہت اچھی لگنے لگی تھیں۔ اس کا ایڈمیشن بھی ہو گیا تھا اور کچھ جھجکتے ہوئے اس نے جانا بھی شروع کر دیا تھا۔ اسے یوں لگنے لگا تھا جیسے وہ ہر خوف سے آزاد ہو چکی ہے، اب پچھلی زندگی اور وہ لوگ کہیں پیچھے رہ گئے تھے اور اس کی زندگی سے گویا وہ سب مٹ چکا تھا جس کا خوف اسے دنیا سے ڈرائے رکھتا تھا۔

اتوار کا دن تھا اور وہ صبح سے اپنا ٹیسٹ یاد کرنے کے لیے کتابیں لے کر کمرے میں گھسی بیٹھی تھی۔ زیادہ تر وہ کمرے میں ہی پڑھتی تھی، کبھی کبھی لائبریری کا رخ بھی کر لیتی۔ شام کی چائے کے لیے باہر نکلی تو نوری بی جان کے ساتھ والے کمرے کی صفائی کرنے میں مصروف تھی۔

"کوئی آ رہا ہے کیا؟" اسے دیکھ کر وہ مسکرائی۔

"جی، بی جان کے پوتے آ رہے ہیں رات میں اور ان کے اعزاز میں آج اماں سکینہ خود ان کی پسندیدہ کڑھی چاول بنا رہی ہیں۔" نوری نے اطلاع دی۔ "آپ چلیں، بس بی جان بھی چائے کے لیے کمرے سے نکل چکی ہیں۔" وہ سر ہلاتی کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

"کیسی ہیں بی جان؟" وہ لمبا چوڑا شخص آ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔ یہ اس کا مخصوص انداز تھا جو بی جان کو بے حد پسند تھا۔ پیار سے اس کے ماتھے پر بوسہ دیتے بی جان مسکرائیں۔

"آپ آ گئے ہیں تو ہم اور اچھا محسوس کر رہے ہیں۔"

"کچھ مہینوں سے اتنی مصروفیت تھی بی جان کہ چکر ہی نہیں لگا سکا۔" اس کے لہجے میں ندامت تھی۔

"اب آپ آ گئے ہیں تو یہاں کی رونق بڑھ گئی ہے۔"

بی جان کبھی شکایت نہیں کرتی تھیں اور یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

"آپ کے آنے کا سن کر سکینہ بی نے خود کڑھی چاول بنائے ہیں۔ آپ فریش ہو لیں، ہم کھانا

لگواتے ہیں۔" بی جان کے کہنے پر وہ سر ہلاتا، سیڑھیاں چڑھتا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

وہ فریش ہوکر آیا تو بی جان کھانے پر اس کا انتظار کررہی تھیں۔

"عرصہ ہوگیا ہے بی جان! کڑھی چاول کھائے۔" اپنا پسندیدہ کھانا دیکھ کر وہ بولا۔ سکینہ بی! آپ کے کڑھی چاول کی بات ہی اور ہے۔"

پانی کی بوتل رکھتی سکینہ بی سے کہا تو وہ خوش ہوگئیں۔ اسی وقت اقصیٰ آکر بی جان کی بائیں جانب بیٹھ گئی کیونکہ دائیں جانب آج کوئی اور موجود تھا۔

"آیئے، آج تو آپ صبح سے مصروف ہیں۔ تیاری ہوگئی ٹیسٹ کی۔" بی جان نے اسے مخاطب کیا جبکہ سامنے بیٹھے شخص نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔

"جی، تیاری تو بہت اچھی ہوگئی۔"

"ان سے ملیے، یہ ہمارے پوتے ہیں ریان اور ریان! یہ اقصیٰ ہیں۔ ایم اے کررہی ہیں اور ہمارے ساتھ ہی رہتی ہیں۔"

بی جان نے تعارف کرایا جو کہ کچھ نامکمل سا تھا مگر اسے اس لڑکی کے سامنے مزید کریدنا کچھ نامناسب سا لگا تو خاموش رہا۔

کھانے کے دوران دو مرتبہ اسے سامنے بیٹھے شخص کی خود پر پڑتی سنجیدہ نظروں کا احساس ہوا مگر اس کی جانب دیکھنے پر وہ کھانے میں اس قدر محو لگا کہ یہ اسے اپنا وہم لگا۔

کھانے کے بعد وہ صبح جلدی اٹھنے کے بہانے فوراً کمرے میں چلی گئی تھی۔ ایک اجنبی سا احساس تھا جسے وہ نام نہیں دے پارہی تھی۔

"بی جان! یہ لڑکی کون ہے؟" اس کے جانے کے بعد لاؤنج کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ریان نے سنجیدگی سے اس کی بابت پوچھا۔

"میری ایک جاننے والی کی عزیزہ ہیں۔ ماں باپ نہیں ہیں ان کے، ہم نے ان کی سرپرستی کی ذمہ داری اٹھالی ہے۔" بی جان نے اطمینان سے جواب دیا۔

"آپ نے ٹھیک سے تسلی تو کرلی ہے نا بی جان! آج کل یوں کسی کی ذمہ داری لینا بہت بڑی بات ہے اور....."

"آپ پریشان نہ ہوں، ہم نے بہت سوچ سمجھ کر یہ ذمہ داری اٹھائی ہے۔ آپ بتایئے کس کیس کے سلسلے میں یہاں آنا ہوا۔"

بی جان نے بات بدل دی تو وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا پھر انہیں تفصیل سے اپنی اس شہر میں آمد کے متعلق بتانے لگا۔

☆☆☆

آج اسے جلدی یونی ورسٹی پہنچنا تھا اس لیے وہ جلدی ناشتا کررہی تھی۔ بی جان کے ناشتے میں ابھی وقت تھا سو وہ اکیلی ہی ناشتا کررہی تھی۔ گھڑی پر نگاہ ڈالے وہ کھانے میں مصروف تھی جب وہ میز تک آیا۔ ایک سنجیدہ نظر اس پر ڈال کر نوری کو آواز دی۔

"ایک دودھ کا گلاس لادیں۔"

"میں ناشتا بنادیتی ہوں جلدی سے۔" نوری جھٹ بولی۔

"نہیں، مجھے جلدی ہے۔ ناشتا رہنے دیں۔ آپ دودھ لے آئیں۔"

"جی۔" وہ کچن میں چلی گئی۔ اس کا موبائل بجنے لگا تو اس نے اٹھا کر کال ریسیو کی۔

"یس ایس پی ریان۔" اور سامنے بیٹھی اقصیٰ کے حلق میں گویا نوالہ پھنس گیا۔ کھانستے ہوئے اس نے پانی کا گلاس لبوں سے لگایا۔

"یس سر! میں پہنچ چکا ہوں۔ جی جی میں شام تک رپورٹ کرتا ہوں۔"

دوسری جانب کی بات کا جواب دیتے نظریں بے اختیار اس پر جم گئی تھیں جو کچھ گھبرائی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ نوری دودھ کا گلاس لے کر آئی تو جلدی سے گلاس ختم کرتا وہ اٹھ گیا مگر جاتے جاتے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی، جواب آہستہ آہستہ لقمے لے رہی تھی۔

اس کے جاتے ہی اماں سکینہ آئیں اور نوری کو ایک فریم تھما کر خود کچن میں چلی گئیں۔

"یہ دیکھیں بی بی! ہمارے ریان بھائی اپنی وردی میں کیسے جچ رہے ہیں۔" نوری کے مخاطب کرنے پر اس کی نگاہیں بے اختیار اس فریم کی ہوئی تصویر پر پڑیں، پولیس کی وردی میں اس کا سنجیدہ اور شاہانہ انداز، اس کے دماغ میں کلک ہوا تھا۔ وہ لمبا چوڑا شخص وردی میں ملبوس، اجلی رنگت، ہلکی داڑھی اور مونچھوں تلے سنجیدہ لب۔ اسے اپنا سانس رکتا محسوس ہوا تھا۔

"ریان بھائی کی وردی والی تصویر ماما نے آج بھی سنبھال کر رکھی ہے۔" ایک بازگشت نے —— اس پر جیسے خوف سا طاری کر دیا تھا۔

"فریم کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا نا، اب ڈرائیور جڑوا کر لایا ہے تو کیسا نیا نکور لگ رہا ہے۔" نوری اپنی دھن میں بولے جا رہی تھی۔ ایسے میں نہ وہ اس کی خاموشی کو نوٹ کر سکی، نہ ہی اس کی اڑی رنگت کو۔

بے دم ہوتے وجود کے ساتھ وہ گاڑی میں جا بیٹھی۔ یونی میں بھی اس نے بہت مشکل سے دن گزارا تھا۔ ٹیسٹ میں جانے کیا لکھتی رہی تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ آخری پیریڈ فری تھا مگر گھر جانے کے بجائے وہ درخت کے نیچے موجود بنچ پر بیٹھ گئی۔ دوستی تو اس کی کسی سے خاص تھی نہیں، بس سلام دعا تھی اور اب تو اس کی کلاس جا بھی چکی تھی۔ ایک وہ تھی جو گرمی کی پروا کیے بغیر یہاں بیٹھی تھی۔

وہ اسے اچھی طرح پہچان چکی تھی۔ یہ وہی تھا جس کو اس نے مشعل کے گھر دیکھا تھا اور ایک بار جس کی گاڑی میں بھی وہ بیٹھی تھی "ایس پی ریان ملک" اس کا نام بھی اسے یاد آ گیا تھا۔ خوف سے اس کا دل لرز اٹھا تھا۔ اگر اس نے بھی اسے پہچان لیا تو.....

نادرہ آنٹی نے اسے منع کیا تھا کہ وہ یہاں ان لوگوں کا ذکر نہ کرے بلکہ اس زندگی کو بھلا دے اور وہ تو بھول بھی چکی تھی۔ وہ تو سرشار تھی کہ اس نے اپنی قسمت بدلنے کے لیے جو قدم اٹھایا تھا اس نے اس کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا تھا اور اب اس شخص کا سامنا ہونے پر وہ عجیب سے خوف کو اپنے اوپر طاری ہوتا محسوس کر رہی تھی۔

آخر کب تک وہ یہاں بیٹھ سکتی تھی۔ شل ہوتے وجود کے ساتھ وہ واپس آ گئی تھی۔ کھانے سے اس نے منع کر دیا تھا کہ وہ آرام کرنا چاہتی ہے۔ رات کے کھانے پر بی جان کے بلانے پر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے جانا پڑا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔" بی جان اس کی زرد رنگت دیکھ کر پریشان ہوئیں جو اسے موجود پا کر کچھ اور پھیکی پڑ گئی تھی۔

"نہیں، بس یوں ہی طبیعت بوجھل ہو رہی تھی۔" جواب دیتے اس نے سامنے دیکھنے سے گریز کیا اور سر جھکا گئی۔ اس کی نگاہوں کی تپش اسے محسوس ہو رہی تھی۔ بی جان نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"آپ کو تو بخار ہے۔" انہیں تشویش ہوئی۔

"ٹھہریں، ہم آپ کے لیے کچھ ہلکا پھلکا منگواتے ہیں۔"

اس کے منع کرنے کے باوجود بی جان نے اس کے لیے ڈبل روٹی اور دودھ کا گلاس منگوا لیا پھر کھانے کے بعد ریان کو ہدایت کی کہ وہ نوری کے ساتھ اسے ڈاکٹر کے ہاں لے جائے کیونکہ ڈرائیور اپنے گھر جا چکا تھا۔

وہ تو اس کے ساتھ جانے کے خیال سے ہی بدک گئی۔

"نہیں بی جان! میں ٹھیک ہوں۔"

اس نے اتنی بے ساختگی سے انکار کیا کہ وہ اس کا گھبرایا ہوا انداز پوری طرح محسوس کر گیا۔ ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی جو کچھ اور سہم گئی تھی۔ بی جان نے اس کی ایک نہ سنی اور نوری کے ساتھ اسے روانہ کر دیا۔ سارے راستے نوری کا ہاتھ پکڑے وہ اپنی تیز ہوتی دھڑکنوں کو سنتی رہی تھی۔

واپس ممتاز محل پہنچتے ہی وہ جلدی سے گاڑی

سے اتری۔ آگے بڑھنے کی کوشش میں اسے رک جانا پڑا۔ اس کا دوپٹا دروازے میں آ گیا تھا۔

''محترمہ! خاصی جلدی میں ہیں آپ۔'' ریان ملک نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے دروازہ کھول کر اس کا دوپٹا نکالا اور وہ جیسے کن ہو گئی تھی ایک منظر ذہن کے پردے پر لہرا گیا تھا۔

''چلیں بی بی!'' نوری نے دوسری طرف سے آ کر اسے تھاما تو اس کا رکا ہوا سانس گویا بحال ہوا۔ وہ اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

''نہیں میں نے کچھ نہیں کیا۔'' اس کی آواز کانپی۔

''لیکن میں تمہیں پہچان گیا ہوں۔ تم وہی لڑکی ہو۔ تم اس گھر میں چوری کرنا چاہتی تھیں۔ تم ایک چور ہو۔ میں بی جان کو سب بتا دوں گا۔'' اس کی نگاہوں میں نفرت تھی۔

''نہیں میں چور نہیں۔ سچ میں ایک بار میری بات سن لیں۔''

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیسے روکے۔ مگر وہ نہیں رکا تھا اس نے بی جان کو بتا کر دم لیا تھا اور جو اس نے بتایا تھا اس کے بعد بی جان نے اسے اپنی چھت کے نیچے رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔

''میں چور نہیں ہوں۔'' وہ چیخی تھی مگر کوئی اس کی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ قریب آتی پولیس کی گاڑی دیکھ کر اس کا سانس اکھڑنے لگا۔ وہ یک دم جھٹکے سے جاگی تھی۔ باہر بجلی کڑکی تھی اور وہ خوف کے مارے بستر سے اتری۔ بغیر پاؤں میں چپل پہنے وہ بھاگتی ہوئی بی جان کے کمرے میں جا گھسی۔

''مجھے بچا لیں بی جان پلیز۔ مجھے بچا لیں۔'' بی جان نیند سے جاگ چکی تھیں اور اسے یوں ڈری سہمی، بدحواس حالت میں دیکھ کر حیران پریشان تھیں۔

''میں نے کچھ نہیں کیا بی جان! آپ مجھے بچا لیں۔ ان سب سے بچا لیں۔ آ آپ مجھے بچا سکتی ہیں نا۔''

روتے ہوئے اس نے ان کی گود میں سر رکھ لیا تھا اور انہوں نے بھی کچھ پوچھنے کے بجائے اسے اپنی آغوش میں پناہ دے دی تھی۔

''ہم آپ کے پاس ہی ہیں بچے۔ کچھ نہیں ہوگا۔'' وہ سمجھ گئی تھیں کہ شاید اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔

اس کا سر سہلاتے وہ اسے تسلی دے رہی تھیں۔ بہت دیر بعد اس کی ہچکیاں رکی تھیں، ان کی گود میں ایک سکون سا تھا۔

☆☆☆

صبح وہ بی جان کو پاپا کی کال کا بتانے آیا تو دروازے پر دستک دے کر انتظار کیا جب کوئی آواز نہیں آئی تو آہستہ سے دروازہ کھول کر بی جان کو پکارنا چاہا مگر ان کے بستر پر اس لڑکی کو سوتے دیکھ کر چہرے پر ناگواری چھا گئی۔

اسی وقت بی جان واش روم سے نکلیں۔

''بی جان! پاپا آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ آپ انہیں کال کر لیں۔'' ان کے سر ہلانے پر وہ باہر نکل گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو خود کو بی جان کے کمرے میں پایا، ساتھ رات کا واقعہ یاد آیا تو اسے شرمندگی محسوس ہوئی۔ وہ اس قدر خوف زدہ ہو گئی تھی کہ اسے اس وقت کچھ سجھائی ہی نہیں دیا تھا۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ اتنا تو وہ کبھی نہیں سوئی تھی۔ یونی سے بھی چھٹی ہو گئی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ نیچے آئی تو بی جان لاؤنج میں ہی بیٹھی تھیں۔

''کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟'' اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

''جی میں اب ٹھیک ہوں۔ سوری کل میری وجہ سے آپ کی نیند خراب ہوئی۔'' نگاہیں جھکائے وہ ندامت سے بولی۔

''آپ شاید خواب میں ڈر گئی تھیں۔ آپ کا ہمیں اپنا سمجھنا ہمیں بالکل بھی برا نہیں لگا۔ آپ جب چاہیں ہمارے پاس آ سکتی ہیں ہمیں ہرگز برا نہیں

لگے گا۔" وہ مسکرائیں تو اس کے لبوں پر بھی ممنون سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"نوری سے کہیے آپ کا ناشتہ بنا دیں پھر دوا کھا لیجیے گا۔" ان کا فکر کرنا اسے اچھا لگا تھا، سر ہلاتی وہ اٹھ گئی۔

☆☆☆

چھٹی کا دن تھا اور وہ ایک کتاب ختم کرنے کے بعد کوئی دوسری کتاب لینے کے لیے لائبریری میں داخل ہوئی تو سامنے ہی اس کو پا کر وہ یک دم گھبرا گئی اور وہ جو کتاب شیلف سے نکال رہا تھا دروازے کی آواز پر متوجہ ہو چکا تھا۔

"رک کیوں گئیں آ جایئے۔ یقیناً بی جان نے آپ کو یہاں آنے کی اجازت دے رکھی ہوگی۔"

اس کے سنجیدگی سے کہے جملے پر مجبوراً اسے آگے بڑھنا پڑا اور نہ اسے دیکھ کر یہاں مزید ٹھہرنے کا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اسی شیلف کے پاس گئی جہاں وہ کھڑا تھا کیونکہ وہ کتاب وہیں واپس رکھنی تھی۔

"مجھے دیکھ کر جیسے آپ گھبرا جاتی ہیں ویسے تو کوئی مجرم بھی مجھ سے نہیں گھبراتا۔" کتاب شیلف میں رکھتا اس کا ہاتھ کانپ گیا، کتاب گرتے گرتے بچی تھی۔ اس نے جلدی سے کتاب سیٹ کی اور اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"ارے دیکھ کر۔ اتنا خوف ناک نہیں ہوں میں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں آپ سے کیوں گھبراؤں گی۔" ہمت کر کے اس نے آہستہ سے کہا، انداز معمول کے مطابق ہی رکھا ورنہ دل تو بری طرح لرز رہا تھا۔ اس کی سنجیدہ جانچتی نگاہیں اسے ہراساں کرنے کو کافی تھیں۔

"کیا ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔" اس کی آواز پر اس کے مڑتے قدم گویا زمین نے جکڑ لیے تھے۔

"جی نہیں۔" خشک ہوتے ہونٹوں کے ساتھ اسے بولنا پڑا۔ اگرچہ چہرہ اس کی جانب نہیں کیا تھا کہ اس وقت اسے احساس تھا کہ اس کا رنگ اڑ چکا تھا جو اس شخص کی عقابی نگاہیں بھانپ جائیں گی۔

"اچھا! لگتا ہے جیسے کہیں دیکھا ہے پر یاد نہیں آ رہا۔" اس کا عجیب سا انداز اسے بولائے دے رہا تھا۔

"پر میں آپ کو نہیں جانتی۔" یہ کہہ کر وہ جلدی سے وہاں سے نکلی تھی۔ سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا اور ننھا سا دل سینے میں خاصی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ کمرے میں آ کر بھی وہ کتنی دیر پریشانی سے ٹہلتی رہی تھی۔ اپنے پہچان لیے جانے کا خوف اسے کسی پل چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ وہ سب کو کیسے یقین دلا پائے گی کہ اس کا ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے، محض مجبوری کے تحت وہ ان کے ساتھ تھی۔

"نہیں اب مجھے نہیں ڈرنا مجھے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانا ہوگا۔ وہ مجھے نہیں پہچان سکتا۔" اس نے خود کو باور کرایا تھا اور یوں بھی اس کی موجودگی میں اس نے اپنا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا پھر وہ اسے کیسے پہچان سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں مارے گی، اسے اپنے متعلق تجسس میں مبتلا نہیں کرے گی۔ رات میں وہ پانی لینے کمرے سے نکلی تو لاؤنج میں بیٹھے ریان اور بی جان کی آوازیں سن کر سیڑھیوں کے قریب ہی رک گئی۔

"بی جان مجھے یہ لڑکی ٹھیک نہیں لگتی۔ آپ اس کے متعلق پوری طرح جانتی بھی ہیں؟" ریان کی سنجیدہ آواز پر اس نے بے چینی سے لب کاٹے۔

"آپ یونہی پریشان ہو رہے ہیں۔ ہم ان کی جانب سے پوری طرح مطمئن ہیں۔" بی جان کی آواز سنائی دی۔

"اب وہ وقت نہیں ہے بی جان کہ لوگوں پر آرام سے بھروسا کر لیا جائے۔ آپ مجھے ان لوگوں کا پتا دیں، میں خود معلومات کرتا ہوں۔" ریان بضد تھا۔

"ہم آپ سے کہہ رہے ہیں نا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے کچھ سوچ کر ہی انہیں اپنی سرپرستی میں لیا ہے۔"

"مگر بی جان مجھے یہ ٹھیک نہیں لگ رہا اور پھر پاپا بھی سن کر پریشان ہو رہے تھے، ان کا بھی یہی خیال ہے کہ یوں کسی کو گھر کا فرد بنا لینا ٹھیک نہیں ہے۔"

"ہم ممتاز محل کے مالک ہیں اور ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ کس کو یہاں رہنا چاہیے اور کس کو نہیں۔ بہتر ہوگا کہ کوئی ہمارے معاملات میں نہ بولے۔" بی جان کا سخت لہجہ ریان کو خاموش کروا گیا تھا۔ اس نے لب بھینچ لیے۔

"اب ہم آپ کے منہ سے ان کے لیے ایسی کوئی بات نہ سنیں۔ نہ ہی آپ کو اپنے والد سے ایسی کوئی بات کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ لوگوں کو بھولنا نہیں چاہیے کہ ہم آپ کے بڑے ہیں نہ کہ آپ۔" اٹل انداز میں کہتی وہ اٹھ گئیں۔

"رات بہت ہو گئی ہے آپ بھی اب جا کر سو جائیے۔" بی جان کے قدموں کی چاپ سن کر وہ جلدی سے واپس اپنے کمرے میں گھس گئی۔ بی جان کا خود پر اعتماد اس کی آنکھوں میں آنسو لے آیا تھا۔ اسے ان کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچانی تھی۔

اگلے روز وہ لاؤنج میں اپنی کتابیں کھولے بیٹھی تھی جب وہ نیچے آیا تھا۔ ایک تیکھی نگاہ اس پر ڈالی مگر وہ اپنی گھبراہٹ پر کافی حد تک قابو پا چکی تھی سو نارمل رہنے میں کامیاب رہی۔

نوری اس کی آواز سن کر آئی تھی۔ "غلام بخش سے کہنا میرا سامان گاڑی میں رکھوا دے۔ بی جان کہاں ہیں؟" ہدایت دیتے خیال آیا تو پوچھ لیا۔

"جی وہ ایک تقریب میں گئی ہیں بس آنے والی ہوں گی۔"

"ہوں، بی جان کا تو خیر آنا جانا لگا رہتا ہے مگر تم لوگ گھر میں ہوتے ہو تو ذرا نظر رکھا کرو۔ آج کل لوگوں کا کچھ پتا نہیں چلتا۔"

اس کی جانب دیکھے بغیر بھی وہ جانتی تھی وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا اور اس کا اشارہ بھی اس کی جانب تھا۔

"ہمارے گھر بھلا آتا ہی کون ہے بھائی جان! ہم تو یوں بھی پرانے ہیں یہاں پر۔" نوری ناسمجھی سے بولی۔

"پھر بھی گھر کا خیال رکھا کرو اور کوئی مسئلہ ہو تو مجھے فون کر دینا۔"

"ٹھیک ہے بھائی جان۔" نوری باہر کی جانب بڑھ گئی۔

آہستہ چال چلتا وہ اس کی جانب آیا تھا۔ اس نے ہمت کر کے سر اٹھایا۔

"پھر یاد آیا آپ کو کہ ہم کہاں پر ملے ہیں۔" اس کی سنجیدہ آنکھیں اس پر مرکوز تھیں۔

"جی نہیں میں آپ سے پہلے کبھی نہیں ملی۔" لرزتے دل کو سنبھالتے اس نے نارمل انداز میں کہا، لہجہ دھیما تھا۔

"ہو سکتا ہے۔ اگلی ملاقات تک مجھے یاد آ جائے۔ یوں بھی اس بار کی ملاقات تو مختصر رہی ہے۔" اس نے اقصیٰ کی سنہری آنکھوں میں دیکھا تھا۔ اقصیٰ نگاہیں جھکا گئی، اس سے زیادہ وہ اس کی کریدتی، جانچتی نگاہوں کی تاب نہ لا سکی تھی۔

"سی یو سون۔" آنکھوں پر دھوپ والا چشمہ لگاتا وہ تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

بی جان کے پوتا اور پوتی کی شادی تھی اور بی جان نے اسے بھی ساتھ چلنے کو کہا تھا۔ یہ سن کر اسے پہلا خیال یہی آیا تھا کہ یقیناً وہاں پر ریان ملک سے سامنا ہوگا جس کی وجہ سے اس کا اس شادی میں جانے کا قطعاً دل نہیں کر رہا تھا مگر وہ بی جان کو انکار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جو اپنائیت کا رشتہ بی جان سے بن گیا تھا اس کے بعد وہ ان کی خواہش کا احترام کرنے پر خود کو مجبور پاتی تھیں۔ اور یہ تو وہ نوری سے سن ہی چکی تھی کہ ریان ملک کی بہن کی شادی اس کے چچازاد سے ہو رہی تھی یعنی اس سے سامنا ہونا لازمی تھا۔

بی جان خاصی خوش تھیں، اسے اپنے ساتھ بازار بھی لے کر گئی تھیں اور اس کے منع کرنے کے

باوجود قیمتی اور قیمتی جوڑے اسے لے کر دیئے تھے۔ نوری کو بھی انہوں نے کپڑے لے کر دیئے جو کہ ان کے ساتھ اس شادی میں شریک ہونے کے لیے جا رہی تھی۔ شادی کی تقریبات ہفتے کے آخر میں رکھی گئی تھیں مگر وہ دو دن پہلے جا رہے تھے جس کے لیے اقصیٰ نے یونی سے چھٹیاں لی تھیں۔

گاڑی پر چار گھنٹوں کا سفر کر کے وہ دوسرے شہر پہنچے تھے۔ جدید طرز پر بنا وہ بنگلہ ممتاز محل سے بھی کہیں زیادہ خوب صورت تھا۔ پورچ سے لاؤنج تک جاتے وہ لان اور وہاں کی خوب صورتی کی توصیفی نظروں سے دیکھتی رہ گئی تھی۔

یہ بی جان کے بڑے بیٹے روحیل ملک کا گھر تھا جو کہ ایک بزنس مین تھے۔ ان کی تین اولادیں تھیں ریان، فریحہ اور اذان۔ جبکہ ان کے دوسرے بیٹے ریحان ملک بیرون ملک مقیم تھے جن کے دو بیٹے بلال اور عیان تھے اور جو آج کل شادی کے لیے پاکستان آئے ہوئے تھے۔ اور وہ بھی اسی گھر کی اینکسی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اگرچہ کوٹھی کے اندر اچھی خاصی گنجائش تھی کہ وہ رہ پاتے مگر شادی کی وجہ سے انہوں نے اینکسی میں رہنا ہی مناسب خیال کیا تھا جو کہ خاصی کشادہ تھی۔

"یہ لڑکی کون ہے بی جان؟" بیگم روحیل نے اس کی بابت پوچھا۔

"یہ اقصیٰ ہیں۔ ہمارے ساتھ ہی رہتی ہیں، ایم اے کر رہی ہیں۔"

بی جان نے تعارف کروایا جس پر وہ کچھ حیران ہو گئی تھیں۔ پھر فریحہ کے آنے پر خاموش ہو گئیں، بی جان سے مل کر وہ اس کی جانب مڑی تھیں۔

"ارے یہ اتنی پیاری سی لڑکی کون ہے بی جان۔" وہ شرارت سے بولی۔

بی جان نے اس کا تعارف کرایا تو وہ اپنائیت سے ملی۔ پھر کچھ دیر میں اسے اپنے ساتھ کمرے میں لے گئی۔ وہ پرخلوص سی لڑکی تھی جس سے شام تک اس کی اچھی بات چیت ہو گئی تھی۔

رات میں روحیل ملک اور ریحان ملک کو بی جان کے ساتھ بیٹھنے کا موقع ملا تو انہوں نے اقصیٰ کا ذکر چھیڑ دیا، دونوں کو ان کا ایک غیر لڑکی کو گھر کا فرد بنا لینے پر اعتراض تھا جس کی شناخت محض بی جان کی عزیزہ کی جانے والی کے طور پر سامنے آئی تھی۔

"ہم آپ سے زیادہ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔" بی جان نے بات ہی ختم کر دی تھی۔

☆☆☆

اگلے روز شام میں وہ ٹیرس پر بیٹھی تھی جب کوئی دھپ کر کے سامنے رکھی کرسی پر آ کر بیٹھا تھا۔ وہ جو فریحہ کا انتظار کر رہی تھی یک دم گھبرا گئی۔

"ارے گھبرائیے مت۔ مجھ سے ملیے میں اذان ملک ہوں اس گھر کا سب سے چھوٹا بیٹا۔" دوستانہ انداز میں بولتا وہ شکل سے لاابالی سا نوجوان لگ رہا تھا۔

"اور آپ یقیناً وہ مس پری ہیں جن کا ذکر میں کل سے سن رہا ہوں۔"

"جی اور آپ کی پری باجی ہیں۔" فریحہ نے پیچھے سے آ کر اس کا کان مروڑا تھا۔

"اوپس فری آپی! کتنی ظالم ہیں آپ۔" برا سا منہ بناتے اس نے بہن کو گھورا۔

"تم پریشان نہ ہونا یہ ہمارے گھر کا واحد پیس ہے۔"

"ون اینڈ اونلی۔" اذان نے فرضی کالر کھڑے کیے تو وہ اسے دیکھ کر مسکرا دی۔

"ان کے تو سسرال میں بھی سب ہی سنجیدہ مزاج ہیں، مجھ جیسا زندہ دل انسان آپ کو اس پوری فیملی میں نہیں ملے گا۔"

"ہاں بس تعریفیں کروالو اس سے اپنی۔ میرے سسرال والے بھی ڈیسنٹ لوگ ہیں۔" فریحہ نے مذاق اڑایا۔ ان دونوں کی نوک جھوک اسے اچھی لگ رہی تھی۔

"مطلب آپ واحد ہی ہوں گی ان میں۔" شرارتی انداز میں بولتے ہوئے اس نے بات ادھوری

چھوڑی جس پر فریحہ نے اسے گھورا۔

''اور ایک ہمارے بھائی صاحب ہیں ان سے ابھی آپ کی ملاقات ہونا باقی ہے۔'' اس کے ذکر پر اس نے گہرا سانس لیا۔ اس کے سامنے ہونے کے خیال سے وہ یہاں نہیں آنا چاہ رہی تھی مگر دل میں ارادہ کر کے آئی تھی کہ اس سے دور رہنے کی کوشش کرنی ہے۔ صد شکر کہ ابھی تک اس سے سامنا نہیں ہوا تھا۔

مگر یہ اس کی خام خیالی تھی کہ اس سے بات چیت کا موقع ہی نہیں ملے گا۔ رات میں اس کی آمد ہوئی تھی اور اگلے روز وہ فریحہ کے ساتھ ناشتہ کرنے بیٹھی تھی جب وہ اٹھ کر کچن میں گئی تو ریان ملک اس کے سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

''خبر نہیں تھی کہ آپ سے دوسری ملاقات یہاں پر ہوگی۔ مگر شاید اسے دوسری نہیں کہہ سکتے۔''

اس کی بات پر اس کا یہاں سے بھاگ جانے کا دل کیا تھا۔ اس کا پرسکون سا انداز، بولتی نگاہیں اور معنی خیز جملے سامنے والے کا سکون ضرور برباد کر دیتے تھے کم از کم اقصیٰ جمال کو یہی محسوس ہوا تھا۔

''آپ کو بہن کی شادی مبارک ہو۔'' اس نے خود کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

''شکریہ، ہو سکتا ہے اس مبارک موقع پر آپ کو میری صورت یاد آ جائے، یوں بھی خواتین کی یادداشت مردوں کے مقابلے میں زیادہ تیز ہوتی ہے۔'' اس کے دوبارہ سے بات کا رخ پھیرنے پر وہ اچھی خاصی زچ ہوئی تھی۔

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ میری یادداشت حقیقتاً اچھی ہے اسی لیے میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ ہم پہلے کبھی نہیں ملے۔'' اس نے ہمت کر کے کہہ دیا تھا، انداز سنجیدہ تھا۔

''میں کیسے مان لوں آج کل لوگ اوپر سے کچھ ہوتے ہیں اور اندر سے کچھ اور۔'' اس کے سنجیدگی سے کہنے پر اس کو شدید غصہ آیا تھا۔

''آپ بھی مجھے بی جان کے پوتے نہیں لگتے ان جیسی نفیس خاتون سے آپ کا تعلق ہو سکتا ہے تو عین ممکن ہے کہ آپ مجھ میں کسی اور کی مشابہت تلاش کر رہے ہوں۔ کیونکہ میں آپ سے پہلے ہرگز نہیں ملی۔''

غصے کا شدید ابال تھا جس نے اسے بولنے پر مجبور کیا تھا، پھر وہ وہاں رکی نہیں تھی بلکہ کمرے میں جا کر دم لیا جہاں وہ ٹھہری ہوئی تھی۔ ریان بھی اس کا نیا روپ دیکھ کر اپنی جگہ خاصا حیران ہوا تھا۔ کچھ تھا اس کے متعلق جو اسے تجسس میں مبتلا کر رہا تھا۔

کمرے میں کچھ دیر ٹہلتے رہنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ کیا کر آئی تھی۔ مگر وہ افسوس بھی محض چند لمحوں کا تھا۔ اسے بھلا اس سے ڈرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایک تو وہ اسے پہچانتا نہیں تھا دوسرا جب بی جان کو اس پر اعتماد تھا تو اسے گھبرانے اور خوف کھانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

وہ صرف اس کے پہلے پہل خوف زدہ ہو جانے کی وجہ سے اس پر شک کر رہا تھا جس کا موقع اس نے اسے خود فراہم کیا تھا۔ اور اب اسے اپنی غلطی کو خود ہی سدھارنا تھا تاکہ وہ اس کے ماضی میں نہ جھانک سکے جسے وہ بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

☆☆☆

مہندی کی تقریب ایک بڑے ہوٹل کے ہال میں منعقد کی گئی تھی۔ نکاح چونکہ پہلے ہی ہو چکا تھا اس لیے اکٹھے مہندی پر بڑوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ بی جان کا دلایا جوڑا پہنے وہ وقت پر تیار ہو کر بی جان کے سامنے گئی تو وہ اسے دیکھ کر خوش ہوئیں۔ گرین کلر کی موتیوں کے کام والی شاٹ فراک کے نیچے ہم رنگ کھلا ٹراؤزر اور شاکنگ پنک دوپٹہ سلیقے سے اوڑھے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اپنے خوب صورت لمبے بالوں کو اس نے سیدھی مانگ نکال کر کیچر لگا لیا تھا، پشت پر بکھرے بال کچھ گیلے تھے اسی لیے اس نے انہیں یونہی رہنے دیا تھا۔

اس سادہ سے روپ میں بھی وہ دیکھنے لائق لگ رہی تھی۔ اجلی رنگت پر بڑی بڑی سنہری آنکھیں اور

چہرے پر معصوم سا تاثر اسے دوسروں سے منفرد کرتا تھا۔ بی جان نے اسے لپ اسٹک لگانے کے لیے دی تھی کیونکہ میک اپ کے نام پر اس نے کچھ بھی نہیں لگایا ہوا تھا۔ اس نے کب ایسی تقریبات میں شرکت کی تھی۔ کبھی بچپن کا کوئی واقعہ یاد بھی تھا تو وہ اس وقت اتنی چھوٹی تھی کہ محض ماں کو لپ اسٹک لگاتے ہی دیکھ کر خوش ہو جایا کرتی تھی۔

بی جان کے ساتھ ہی وہ ہال پہنچی تھی۔ روشنیوں کا ایک سیلاب تھا جو وہاں اتر آیا تھا۔ اس کے لیے ایسی کسی تقریب کا حصہ بننا خاصا حیران کن تجربہ تھا۔ ان ساری رونقوں کو دیکھتی وہ بی جان کی ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔ یوں بھی اتنے سارے لوگوں میں وہ اجنبی کی حیثیت رکھتی تھی۔ کچھ خواتین بی جان کے پاس آ بیٹھیں تو وہ ان سے گفتگو میں مصروف ہو گئیں۔

فریحہ کو لانے کے بعد اس کی ساری کزنز اسٹیج پر قبضہ کر کے بیٹھ گئی تھیں۔ جب بلال کو لایا گیا تو اسٹیج پر چڑھنے تک کی جگہ نہیں تھی۔

"چلیں شاباش آپ سب آپیاں باجیاں آگے سے ہٹ جائیں کیونکہ ہمارے دولہا بھائی آ گئے ہیں۔" اذان نے شوخی سے اپنے سے بڑی ان ساری کزنز سے کہا تھا جو اس کے آپیاں، باجیاں کہنے پر مزید بگڑ گئی تھیں۔

"ننھے شہزادے ہم آپ سے یہی کہہ رہے ہیں کہ آپ اوپر نہیں آ سکتے جب تک دولہا بھائی اپنی جیب نہیں خالی کر لیتے۔" ایک کزن نے کہا۔

"ارے واہ یونہی جیب خالی کر دیں۔" اذان نے آنکھیں نکالیں۔ "چلیں ڈیل کر لیتے ہیں کہیں ہمارے بھائی تک نہ جائیں۔" عیان نے معاملہ سلجھانے کے خیال سے کہا جس پر لڑکیاں خوش ہو گئیں۔

"ڈالرز دیں گے، تب بات بنے گی۔" وہ بھی پھیل گئیں۔ اذان نے تو خوب شور مچایا مگر کچھ دے دلا کر ہی گلو خلاصی ہوئی۔ اسٹیج پر جگہ ملنے کے بعد وہ اسے ڈھونڈتا ہوا ان کی ٹیبل تک آیا تھا، وہ جو بی جان کی ساتھ بیٹھی تھی اس کے بلانے پر چونکی۔

"آپ یہاں کیا کر رہی ہیں چلیں آ میں وہاں آپ کی سخت ضرورت ہے۔" اس کے بچوں کی طرح کہنے پر حیران ہوئی۔ "میری بھلا کیا ضرورت پڑ گئی۔"

"کمال ہے ہماری پارٹی کو ضرورت ہے اور آپ کو خبر ہی نہیں آخر آپ کی نئی نویلی دوست کی شادی ہے چلیں بس جلدی سے۔" خود ہی رشتہ جوڑے وہ مزے سے بولا تو بی جان مسکرا دیں۔

"جایئے بھائی کہہ رہے ہیں تو چلی جایئے، آپ بھی یہاں بیٹھی بور ہو رہی ہیں۔" بی جان کے کہنے پر وہ اٹھ کر اس کے ساتھ اسٹیج پر چلی آئی۔

"چلیں بھئی ہماری پارٹی کا ایک اور فرد آ گیا ہے۔ میں، عیان اور ہماری نئی ممبر اب ہم کوئی خرچا پانی نہیں دیں گے۔" اذان نے انہیں تاؤ دلایا جو دودھ پلائی کے پیسوں پر بحث کر رہی تھیں۔ وہ بھی خاموشی سے وہاں کھڑی ہو گئی۔

"شرم کرو لڑکے، تمہاری بہن کی شادی ہے اور تم لڑکے والوں کی طرف سے بول رہے ہو۔" گود میں بچہ اٹھائے ایک کزن نے شرم دلائی چاہی مگر وہاں پروا کسے تھی۔

"چچا زاد ہیں میرے تو کیا انہیں اکیلا چھوڑ دوں تاکہ آپ لوگ لوٹ لیں۔ آپ لوگوں کو تو جہاں فائدہ نظر آئے گا وہیں رشتہ داری بنا لیں گے۔"

"آپ کی خاموش ممبر تو کچھ بول ہی نہیں رہیں۔" کسی نے توجہ دلائی۔ "ان کی موجودگی ہی کافی ہے۔" اذان کی بات پر وہ مسکرا دی مگر دوسرے لمحے سامنے نظر پڑی تو اس کا چہرہ دیکھ کر وہ سر جھکا گئی۔ "لیں پولیس بھی آ گئی۔" شوخ آوازیں ایک ساتھ گونجیں۔

"ایس پی صاحب بھتہ خوروں سے بچائیں آ کر۔" اذان کی شرارت پر بھی محظوظ ہوئے۔ اس کے سنجیدہ لبوں پر بھی مسکراہٹ آ ٹھہری۔

کچھ دیر اذان بڑھ چڑھ کر بولتا رہا پھر معاملہ حل

کرایا گیا۔

اسٹیج پر خاصا رش ہو چکا تھا وہ جگہ بناتی بمشکل اتر کر بی جان کے پاس پہنچی تھی۔ تب ہی ریان ملک بی جان کے پاس آ کھڑا ہوا۔

"وہ آپ کا دوست عباس اور ان کی فیملی نہیں نظر آ رہے، بارات پر تو آئیں گے نا۔"

بی جان کے استفسار پر اس کا گویا سانس رکا تھا۔ مگر اپنے تاثرات پر قابو پاتے ہوئے اس نے نا محسوس انداز میں اپنا رخ موڑا جیسے وہ اطراف میں پھیلے ہجوم کو دیکھنے میں مگن ہو۔

"آنٹی انکل تو عمرے کے بعد کینیڈا چلے گئے تھے ابھی تک واپسی نہیں ہوئی، فون آیا تھا معذرت کر رہے تھے۔ مشعل بھی دبئی شفٹ ہو گئی ہے۔ البتہ عباس کل آئے گا۔"

ریان کے جواب پر بی جان نے سر ہلایا تو وہ واپس مڑ گیا۔ انصیٰ کے سہمے ہوئے دل کو کچھ تسلی ہوئی۔ یہ اس کے لیے غیبی مدد ہی تھی کہ وہ لوگ ملک سے باہر تھے اور جہاں تک عباس کی بات تھی تو چونکہ آج کی تقریب میں مردوں کا الگ پورشن تھا تو یقیناً باقی کی تقریبات بھی یونہی ہوں گی اور یہ سوچ کر اس نے خود کو پرسکون کیا۔

☆☆☆

پرپل رنگ کی لمبی کامدار فراک پہنے، بالوں کا خوب صورت جوڑا جو کہ فریحہ کی ایک کزن لاریب نے زبردستی بنا دیا تھا، وہ بہت اچھی اور مختلف لگ رہی تھی۔ میک اپ کے نام پر آج بھی اس نے لپ اسٹک ہی لگا رکھی تھی اور اس کی وجہ وقت کی کمی تھی، لاریب کی بیٹی تنگ نہ کرتی تو وہ اس کا میک اپ بھی کر دیتی۔

ہال میں وہ بی جان کے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔

"یہ فہمیدہ یہاں کیا کر رہی ہیں۔" بی جان نے ایک عورت کو دور سے دیکھ کر اپنی بڑی بہو سے دریافت کیا۔ لہجے میں واضح ناپسندیدگی تھی۔

"بی جان! وہ ردجیل کا کہنا تھا کہ اب پرانی ناراضیوں کو بھلا دینا چاہیے اسی لیے انہیں بھی بلا لیا۔" وہ جھجک کر بولیں۔

"جو بیج بویا جاتا ہے وہی کاٹا جاتا ہے اور پھر بھول گئے کتنا فساد کھڑا کیا تھا انہوں نے اور ان کی والدہ نے۔" بی جان کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

"جی بی جان! مگر ہیں تو وہ ردجیل کی پھوپھو ہی نا اور پھر فہمیدہ کے میاں کی زمینوں کے ساتھ ہماری زمینیں جڑی ہیں، واسطہ تو پڑتا ہی ہے۔"

بی جان نے لب بھینچ لیے۔ کچھ دیر بعد وہ خاتون قریب آئیں تو بی جان کو دیکھ کر اس جانب آ گئیں۔ اور اس وقت انصیٰ نے بی جان کے چہرے کو سرخ پڑتے دیکھا تھا البتہ وہ اپنے تاثرات پر قابو پا چکی تھیں۔

"بی جان کیسی ہیں آپ۔ آپ سے ملاقات ہوئے تو ایک عرصہ ہو گیا۔"

"ہم ٹھیک ہیں۔" ان کا لہجہ کسی بھی اپنائیت سے محروم تھا۔

"مبارک ہو آپ کو پوتا پوتی کی شادی کی۔" وہ خوامخواہ مسکرائیں۔

"خیر مبارک۔ آپ نے بھی بڑا حوصلہ کیا جو پچھلی باتوں کے باوجود چلی آئیں۔" بی جان کے کہنے پر وہ ہنسیں۔

"بس بی جان ماموں کا خیال آ گیا۔ وہ تو چلے گئے اب ہم کیا لڑائیاں ڈالے بیٹھے رہتے۔"

"بہت جلدی خیال آ گیا آپ کو۔" کچھ تھا بی جان کے لہجے میں جو سمجھ کر وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"اب ماموں جیسی قسم تو نہ کھائی تھی کہ رشتہ ہی توڑ بیٹھے۔"

"جائیے کھانا لگ گیا ہے۔ کھانا کھائیے۔ مہمان ہمارے ہاں سے کھانا کھائے بغیر جائیں، ہمیں پسند نہیں۔"

بی جان نے اپنے مخصوص شاہانہ لہجے میں کہا البتہ ان کے چہرے پر غصے کی لکیریں اب واضح ہو

چکی تھیں جس کو اقصیٰ نے پوری طرح محسوس کیا تھا۔ دور جاتی ان خاتون کی پشت کو اس نے غور سے دیکھا تھا وہ اسے کچھ عجیب لگی تھیں۔

☆☆☆

ولیمے کا فنکشن رات کا تھا اور بی جان نے اس کے لیے پنک کلر کا جوڑا بنوایا تھا۔ بالوں کو اس نے چٹیا میں باندھ لیا تھا جبکہ آج لاریب نے اس کا ہلکا سا میک اپ کر دیا تھا جس سے اس کے نقوش مزید نکھر گئے تھے۔ وہ تیار ہو کر تیزی سے کمرے سے نکلی تو سامنے سے آتے ریان ملک سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

"دیکھ کر چلیے ورنہ آپ نقصان کرا بیٹھیں گی۔" اپنے مخصوص سنجیدہ لہجے میں وہ اس سے مخاطب ہوا۔ اس دن کے بعد آج وہ اس سے ہمکلام ہوا تھا۔

"ویسے خاصی گھل مل گئی ہیں آپ سب سے۔" وہ جو قدم بڑھانے لگی تھی۔ رک گئی۔ اس کے کھوجتے رویے سے چڑ ہو گئی تھی اسے۔

"آپ کو اعتراض ہے کوئی تو بی جان سے بات کریں کیونکہ وہی مجھے اپنے ساتھ لائی ہیں۔" بی جان کے بل پر وہ اسے جواب تو دے ہی سکتی تھی سو اس نے بھی کیا۔

"خدا کرے کہ بی جان سے بات کرنے کی نوبت نہ ہی آئے۔"

"آپ کا مسئلہ یہ ہے کہ آپ سب کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اب اگر آپ نے مجھ سے ایسی کوئی بات کی تو میں بی جان سے آپ کی شکایت کر دوں گی۔" اس نے اسے دھمکایا تھا اور تیزی سے سائیڈ سے نکل گئی تھی۔

"ضرور۔" زیر لب بولتا وہ آگے بڑھ گیا۔

کتنی دیر وہ اس کے جملے یاد کر کے کڑھتی رہی تھی آخر وہ اس کا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتا تھا۔

"کیا نام ہے آپ کا۔" وہ کھانا لے کر پلٹ رہی تھی کہ فہمیدہ نے اسے روک لیا۔

"پڑھتی ہیں آپ؟" وہ انہیں بتا کر بڑھنے لگی تھی کہ انہوں نے سلسلہ کلام آگے بڑھایا۔ "بی جان بتا رہی تھیں کہ آپ پڑھ رہی ہو۔"

"جی میں ایم اے کر رہی ہوں۔"

"بہت اچھی بات ہے، میری بیٹی کو بھی پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ کہتی ہے بھائی کی طرح باہر سے پڑھ کر آؤں گی۔"

ان کی میٹھی نظروں سے وہ الجھن کا شکار ہوئی تھی۔

"میرا بیٹا یو کے سے پڑھ کر آیا ہے۔ اب باپ کا کاروبار سنبھالے گا۔"

"جی اچھی بات ہے۔" بھلا اس کا کیا لینا دینا تھا جو کوئی تبصرہ کرتی۔ بی جان کے کام کا بتا کر وہ آگے بڑھ گئی۔

بی جان ایک رشتہ دار خاتون سے محو گفتگو تھیں۔ جب فہمیدہ سلام کرتی دوسری کرسی پر آ بیٹھیں۔ وہ خاتون اٹھ کر چلی گئیں تو فہمیدہ کو بولنے کا موقع مل گیا حالانکہ بی جان انہیں لفٹ کرانے کے موڈ میں نہیں تھیں۔

اتنے میں رافیہ بھی انہیں ڈھونڈتی قریب آ بیٹھیں۔

"بی جان! آپ کا قیام مزید کتنے روز کا ہے؟"

"بس کل ہماری روانگی ہے ہم مزید نہیں رک سکیں گے۔"

"کتنی جلدی جا رہی ہیں بی جان، ہمیں بھی تو اپنی خدمت کا کچھ موقع دیں۔" فہمیدہ بولیں۔

"ٹھیک کہہ رہی ہیں فہمیدہ! میں بھی آپ کو گھر آنے کی دعوت دینا چاہ رہی تھی۔"

"اس بار تو مشکل ہے پھر کبھی سہی۔" بی جان نے معذرت کی۔

"یہ بچی جو آپ کے ساتھ ہے، اس کی کہیں بات وات ہوئی ہے۔" رافیہ کے پوچھنے پر اٹھ کر جاتی فہمیدہ واپس بیٹھ گئی۔

"نہیں، ابھی تک تو ایسا کوئی سلسلہ نہیں ہوا۔" بی جان کے کہنے پر وہ خوش ہوئیں۔

"کہیں آپ اپنے ظہیر کے لیے تو نہیں پوچھ رہیں۔" فہمیدہ ان کا اشتیاق بھانپ گئی تھیں۔

"اتنی اچھی لڑکی ہے، صورت اور سیرت دونوں میں خوب ہے کوئی بھی پوچھ سکتا ہے۔" وہ ہلکے پھلکے لہجے میں بولیں۔

"صورت کا کیا ہے، ہم تو یہ جانتے ہیں کہ انسان کی بڈی دیکھی جاتی ہے، خاندان اور نسل کے بغیر شکل و عقل کا کیا کرنا۔" فہمیدہ کا انداز طنزیہ تھا، بی جان کے چہرے پر ناگواری پھیلی۔

"اور پھر بی جان نے ترس کھا کر لڑکی کو رکھ لیا تو تم نے رشتہ ہی ڈال دیا۔ بڑی بھولی ہو تم بھی رافیہ۔ پہلے ماں باپ اور شجرہ نسب تو پوچھ لیتیں۔ اس لائق ہے بھی یا....."

"بہتر یہی ہوگا فہمیدہ کہ آپ ان کے بارے میں بات کرنے سے گریز کریں۔ رہی بات خاندان کی تو وہ بہت اچھے خاندان سے ہیں اور ہمارے لیے ہماری بیٹی ہیں اور ان کی یہ حیثیت آپ سب کو یاد رکھنی چاہیے۔" بی جان نے تحمل سے کہا۔

ان کی میز کے قریب آتی اقصیٰ باتیں سنتی وہیں رک گئی تھی۔ اور بی جان کے جواب نے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر دیے تھے۔

"رہنے دیں بی جان، جو رشتہ آپ کے پاس ہے نہیں اسے خود سے بنانے کی کوشش نہ کریں۔ آپ کے کہہ دینے سے کوئی اس لڑکی کو آپ کی بیٹی نہیں مان لے گا۔ اگر اس کا خاندان اتنا ہی اعلا ہے تو بتائیے نا اس کے بارے میں ہم بھی تو سنیں۔" فہمیدہ کا انداز چبھتا ہوا تھا۔

"ہمیں آپ کو تفصیلات بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔" بی جان نے ناگواری سے کہا۔

"مطلب آپ صاف پہلو تہی کر رہی ہیں۔" ان کی میز پر ہوتی گرما گرمی کی خبر بیگم روحیل تک پہنچ گئی تھی وہ تیزی سے وہاں تک آئیں۔

"آپ لوگ کیا بحث لے کر بیٹھ گئے ہیں وہ بھی پرائی لڑکی کے لیے۔" انہوں نے معاملہ رفع دفع کرنا چاہا۔

"پرائی کہاں رہی بی جان اسے اپنی بیٹی قرار دے رہی ہیں تو پھر بتائیے نا بی جان کس خاندان سے ہے آخر رافیہ کو بھی تو جاننے میں دلچسپی ہوگی نا۔"

فہمیدہ کسی طرح خاموش نہیں ہو رہی تھیں اور ان کا انداز اور الفاظ بی جان کو غصہ دلا رہے تھے۔ اقصیٰ لب کاٹتی بت کی مانند ایک جگہ جم کر کھڑی تھی۔

اس وقت کسی کام سے ماں کو تلاش کرتا ریان ملک قریب آیا تھا مگر وہاں ہوتی گرما گرمی پر ماں کو مخاطب کرنا بھول گیا۔

"لیں لڑکی بھی آ گئی بتائیے بی جان! اس کا شجرہ نصب۔ ہمارے خاندانوں میں بھلا چھوٹی ذات والوں سے رشتہ جوڑنے کا رواج کب ہے۔" ان کا انداز سراسر تذلیل کرنے والا تھا اور بی جان کے چہرے پر پھیلا غصہ اور ان کی خاموشی انہیں شاید مزا دے رہی تھی جو وہ خاموش ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ اقصیٰ کا سر جھک گیا تھا۔

"خاندان تو بی جان ضروری ہوتا ہے آپ بتا دیں تو اچھا ہے۔" رافیہ منمنائیں، انہیں بہرحال بی جان کا لحاظ تھا۔

"کوئی خاندان ہے بھی یا....."

فہمیدہ کی ادھوری بات پر بی جان کو گویا آگ ہی لگ گئی تھی۔

"شرم آنی چاہیے آپ کو ایسی گری ہوئی بات کرنے پر اور جہاں تک خاندان کی بات ہے تو نا صرف ان کا خون اچھا ہے بلکہ یہ نیک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ خاندان کے نام کے پیچھے چھپے منافقوں کی اولاد نہیں ہیں یہ اور آج ہم سب کے سامنے کہہ رہے ہیں کہ یہ ہماری بیٹی ہیں اور ان کی حیثیت یہ ہے کہ ہم ان کی شادی اپنے اس پوتے سے بھی کر سکتے ہیں۔"

بھڑک کر کہتے ہوئے بی جان نے سامنے کھڑے ریان کی جانب اشارہ کیا تھا۔ جو محض خاموش کھڑا تھا اور اپنے لیے بی جان کی بات سنتی

انصی کی آنکھوں میں مچلتے آنسو بہنا بھول گئے تھے۔ جبکہ بیگم روحیل جز بز ہو کر رہ گئی تھیں۔

"مبارک ہو تمہیں تو بہو مل گئی اور ہماری مہمان نوازی بھی بی جان نے خوب کر لی۔" فہمیدہ آگ لگانے کے بعد اٹھ کر چل دیں۔

ولیمے کے بعد روحیل ملک اور ریحان ملک کو اس گرما گرمی کی خبر ہوئی تو وہ بی جان کے پاس آئے۔

"بی جان اس اجنبی لڑکی کے لیے بات بڑھانے کی کیا ضرورت تھی۔ برسوں بعد تو ہمارے تعلقات میں سدھار آیا تھا۔"

"بی جان یہ مصلحت کا تقاضا تھا۔" ریحان ملک کو بھی بولنا پڑا۔

"آپ اپنے تقاضے نبھائیے اور ہمیں اپنے نبھانے دیجیے۔"

"مگر بی جان یوں اس لڑکی کے لیے لڑائی کر لینا ٹھیک نہیں تھا۔"

"مجھے اچھا تو نہیں لگ رہا اس معاملے میں بولنا مگر بی جان حق بجانب ہیں۔ فہمیدہ آنٹی کو کوئی حق نہیں تھا کہ وہ ایک لڑکی کی تذلیل کرتیں۔ کسی بھی لڑکی کی عزت کو یوں اچھالنا انہیں زیب نہیں دیتا۔ پھر اور کچھ نہیں تو بی جان کی حیثیت اور مرتبے کا ہی لحاظ کر لیتیں اور معاف کیجیے گا ہم بھی بی جان سے ایسا سوال کرنے کا حق نہیں رکھتے۔"

ریان نرم لہجے میں احترام سے بولا اور کمرے میں بیٹھی انصی اس کی باتیں سنتی حیران رہ گئی تھی۔ اس سے ایسے الفاظ کی توقع کب تھی اسے۔

بی جان نے محبت سے اپنے پوتے کو دیکھا جبکہ روحیل ملک اور ریحان ملک کچھ خفیف سے ہو گئے تھے۔

☆☆☆

ولیمے سے اگلے روز وہ واپس آ گئے تھے۔ اس کی یونی ورسٹی پھر سے شروع ہو گئی تھی اور بی جان سے اس کی اپنائیت اور وابستگی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

اس روز بھی وہ یونی سے آ کر بی جان کو تلاش کرتی لائبریری تک آئی تھی مگر وہاں بی جان کو بے ہوش دیکھ کر اس کی گویا جان پر بن آئی، اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتی وہ باہر بھاگی، پھر وہ لوگ جلد بی جان کو ہسپتال لے گئے تھے۔ بی جان کو انجائنا کا اٹیک ہوا تھا اور اماں سکینہ کی ہدایت پر اس نے ریان ملک کو کال کی تھی تاکہ وہ روحیل ملک اور ریحان ملک تک یہ خبر پہنچا دے۔ اور یہ خبر سننے کی دیر تھی وہ کچھ دیر میں ہسپتال پہنچ گیا تھا۔

وہ راہداری میں جائے نماز بچھائے نوافل ادا کر رہی تھی جب وہ اس کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ خود اصرار کر کے یہاں رکی تھی۔ اماں سکینہ کو اس نے گھر بھیج دیا تھا اور نوری کو بھی آنے سے منع کر دیا تھا۔ وہ بی جان کے پاس رکنا چاہتی تھی۔

"اب کیسی ہیں بی جان؟" اس کے سلام پھیرنے پر اس نے پوچھا۔ لہجے میں فکرمندی تھی۔

"ڈاکٹرز کہہ رہے ہیں کہ وہ اب بہت بہتر ہیں آپ صبح ڈاکٹرز سے مل لیجیے گا۔ بی جان ابھی سکون آور گولیوں کے زیر اثر سو رہی ہیں۔" جائے نماز لپیٹتے ہوئے اس نے بتایا۔

"آپ آرام سے گھر چلے جائیں، میں ہوں بی جان کے پاس۔"

اس نے جھجکتے ہوئے کہا تو وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر بی جان کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ وہ اندر جانے کا سوچ رہی تھی۔ جب وہ کچھ دیر کے بعد باہر نکل آیا اور خدا حافظ کہتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا آگے بڑھ گیا۔ اس کی پشت کو دیکھتی وہ کمرے میں گھس گئی۔

ڈاکٹر کے انتظار میں وہ راہداری میں ٹہل رہا تھا جس سے اس کی بے چینی ظاہر ہو رہی تھی۔ انصی کافی مرتبہ کمرے سے جھانک کر اسے دیکھ چکی تھی نرس کے آتے جاتے اس کی نگاہ باہر بھٹک جاتی۔

وہ ڈاکٹر سے مل کر آیا تو بی جان جاگ چکی تھیں۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی شفیق مسکراہٹ ان کے

چہرے پر پھیلی۔

"اب ہم ٹھیک ہیں آپ دونوں بھی پریشان مت ہوئیے۔" ریان کی نگاہ بی جان کے دوسری جانب کھڑی اقصیٰ سے ملی تو وہ نگاہ جھکا گئی۔

"انجائنا کا اٹیک ہوا ہے بی جان!، یہ چھوٹی بات نہیں ہے۔ اگر کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتایئے آخر ہم کس لیے ہیں۔" اس کے نرم لہجے میں محبت تھی۔

"ایسی کوئی بات ہوئی تو آپ سے ضرور کہیں گے۔"

بی جان نے جواباً کہا تو اس نے محبت سے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

"آپ ہمیں بہت عزیز ہیں بی جان۔" اس کے چہرے پر پھیلی نرمی کتنی بھلی لگ رہی تھی۔ اقصیٰ نے اس کے بدلے ہوئے روپ کو بغور دیکھا۔ ایسے میں ریان نے اس کی جانب دیکھا تو وہ نادم سی نگاہ پھیر گئی۔

شام تک روحیل ملک اور ریحان ملک بھی فیملیز سمیت پہنچ گئے تھے۔ سب کا یہی اصرار تھا کہ بی جان ان کے ساتھ چلیں مگر بی جان یہ ماننے کو تیار نہ تھیں۔ کچھ دن ہسپتال میں رہنے کے بعد بی جان گھر منتقل ہو گئیں اور اس سارے عرصے میں وہ بی جان کے ساتھ ہی رہی تھی۔

ان کے گھر آنے کے دوسرے دن ان کی بہو بیٹے واپس چلے گئے تھے۔ ریان بیچ میں گیا تھا اور کام نبٹا کر واپس آ گیا تھا اسے بی جان کی بہت فکر تھی۔

"کہا نا کہ اب ہم ٹھیک ہیں۔" وہ اندر آئی تو بی جان ریان سے مخاطب تھیں۔

"آپ اب اپنی ڈیوٹی پر جایئے، زیادہ چھٹیاں مت کریں اور آپ بھی کل سے یونی ورسٹی جائیں گی آپ کی پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔" اس پر نظر پڑتے ہی بی جان نے کہا۔

"مگر بی جان۔" اس نے بولنے کی کوشش کی مگر بی جان کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرا دیا۔

"ہم نے کہہ دیا نا، اب کوئی بات نہیں ہو گی۔"

"جی۔" اس نے سر ہلایا۔ اگلے روز وہ یونی کے لیے تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچی تو وہ اپنا سامان گاڑی میں رکھوا رہا تھا۔ پھر اس کے پاس آ کر رکا تو وہ اس کی جانب دیکھنے پر مجبور ہوئی۔

"میں بی جان کا خیال رکھوں گی۔ آپ بے فکر ہو کے جایئے۔" اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے کہہ دیا۔ اسے اس کی پریشانی کا احساس تھا۔

"وہ تو آپ رکھتی ہی ہیں اور یقیناً رکھیں گی۔ میں بس یہ چاہتا ہوں کہ آپ بی جان کی طبیعت کا مجھے بتاتی رہیے گا۔ ان کی ذرا سی بھی طبیعت خراب ہو تو مجھے فوراً فون کیجیے گا۔"

اس کے سر ہلانے پر وہ جانے لگا پھر کچھ یاد آنے پر مڑا۔

"بی جان نے آپ سے کسی پریشانی کا ذکر کیا کبھی؟"

"نہیں ایسا تو کچھ نہیں کہا انہوں نے۔"

"ٹھیک ہے اگر کوئی بات ہو تو مجھے بتایئے گا۔"

"جی ضرور۔" اس نے ہامی بھری۔ اس کے جانے کے بعد وہ اس کی بات کے متعلق سوچتی رہی۔

"بی جان کو کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔" وہ سوچ رہی تھی جب ناشتہ رکھتی نوری بول پڑی۔

"ریان بھائی کا تو جانے کا دل نہیں تھا۔ پر کیا کریں مجبوری ہے ان کی۔ پر مانیں نہ مانیں یہ جو فہمیدہ بیگم ہیں نا یہی فساد کی اصل جڑ ہیں۔ ان کی ماں بھی ہمیشہ بی جان کو پریشان ہی کرتی تھی اور اب یہ بھی شادی پر آ کر بی جان کو تنگ کر کے گئی ہیں۔ ہماری بی جان کو تو بس نظر ہی لگ گئی ہے۔" نوری کی کہی آخری بات پر وہ مسکرائی اور ناشتہ کرنے لگی۔

☆☆☆

بی جان کی طبیعت کافی بہتر تھی۔ اب وہ پڑھائی کے بعد زیادہ وقت بی جان کے ساتھ ہی گزارتی تھی۔ چھٹی والے دن اپنے ہاتھ سے ان کے لیے کھانا بھی بناتی تھی۔ ریان سے بھی اکثر اس کی بات

ہوتی رہتی۔ بی جان کے لیے وہ خاصا حساس تھا اور یہ بات اسے بی جان کی بیماری کے بعد معلوم ہوئی تھی۔

زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی کہ ایک روز اس کے سامنے وہ چہرہ آ گیا جسے وہ کبھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ شہزاد کو دیکھ کر وہ سانس لینا بھول گئی تھی۔ یونی سے واپسی پر گھر کے قریب اس نے اسے دیکھا تھا برا ہوا جو وہ بھی اسے دیکھ چکا تھا۔ گاڑی کے گیراج میں اترتے ہی وہ کانپتی ٹانگوں سے نیچے اتری تھی۔ مڑ کر دیکھا تو بند ہوتے گیٹ کے پار اس کا وہم نہیں بلکہ حقیقتاً شہزاد ہی تھا۔ اس کی نگاہوں سے گھبراتی وہ بے جان قدموں سے اندر آئی تھی۔ زندگی کے جس حصے کو وہ خواب سمجھ کر بھلا چکی تھی، اب وہ بھیانک حقیقت بن کر اس کے سامنے کھڑا تھا۔

اب کیا ہوگا؟ کا سوالیہ نشان اس کے ذہن پر عذاب بن کر اترا تھا۔ بی جان کے سامنے اس نے بمشکل خود کو سنبھالا تھا۔ اگلے روز وہ اسے کہیں نظر نہیں آیا تو وہ کچھ پرسکون ہوئی تھی مگر تیسرے روز اسے یونی ورسٹی کے باہر کھڑا دیکھ کر اس کی روح فنا ہوئی تھی۔

''بہت اونچا ہاتھ مار لیا ہے۔'' وہ اس کے قریب آیا تھا۔

''مجھ سے دور رہو، تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔'' لوگوں کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے اقصیٰ نے اسے دھمکایا۔ اور گاڑی کی جانب بڑھ گئی۔ مگر دل بری طرح لرز رہا تھا۔ گھر آ کر بھی سکون نہیں مل رہا تھا۔ شام تک اسے خبر ہوگئی کہ شہزاد سامنے والوں کے ہاں ملازم تھا یعنی ایک اور چوری اور ان کا کام ہی کیا تھا۔ پریشانی نے اس کی بھوک پیاس اڑا دی تھی۔ بی جان بھی اس کی طبیعت کا پوچھ چکی تھی۔ کاش وہ انہیں کچھ بتا سکتی۔ اگر وہ انہیں بتاتی تو اس کی کیا عزت رہ جاتی یہی سوچ کر وہ چپ رہی۔

پتا نہیں کیسے اس نے اس کا نمبر بھی حاصل کر لیا تھا اور فون کر کے اسے ڈرانے لگا تھا۔ ''بس تیاری کر لو اب کوچ کرنے کی۔ تمہیں تو میں ساتھ لے کر ہی جاؤں گا۔''

اس کے میسجز نے اس کی راتوں کی نیندیں اڑا رکھی تھیں۔ طبیعت کا بہانا کر کے دو دن یونی سے بھی چھٹی کر لی تھی مگر کب تک تیسرے روز اسے جانا ہی پڑا تھا اور واپسی پر وہ یونی کے باہر کھڑا اسے ہراساں کر رہا تھا۔

ایک شام ریان ملک بی جان سے ملنے کے لیے آ گیا۔ وہ لاؤنج میں کتابیں کھولے بیٹھی تھی۔ بی جان نماز پڑھنے گئی تھیں۔ ریان کے کھنکھارنے پر وہ بری طرح چونکی۔

''آپ.....''

''کیسی ہیں آپ اور بی جان کہاں ہیں۔'' اس نے سوال کیا۔

''نماز پڑھ رہی ہیں۔''

''طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟'' وہ اسے خاصی کمزور لگ رہی تھی۔

''جی ٹھیک ہوں۔'' غائب دماغی سے بولتی کتابیں الٹ پلٹ کرنے لگی۔ اسی وقت بی جان آ گئیں تو وہ باتوں میں لگ گئے۔

رات میں دل گھبرایا تو وہ باہر لان میں نکل آئی۔ ٹہل رہی تھی جب یک دم اسے سامنے دیکھ کر ڈر گئی۔

''آپ کو میرے آنے کی خبر نہیں ہوئی۔''

''میں اپنے دھیان میں تھی۔'' وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ موسم بدل رہا تھا اور ہوا میں خنکی تھی۔

''دوسروں کا خیال رکھنا اچھی بات ہے مگر اپنا خیال بھی انسان کو خود رکھنا پڑتا ہے۔'' اس نے اس کے سنجیدہ چہرے کو دیکھا۔

کیا اسے اس کی فکر تھی۔ کیوں ہو رہا تھا وہ اس پر مہربان۔

''کیا میں اس پر اعتبار کر سکتی ہوں۔'' دل میں اٹھتی آوازوں کو اس کی آواز نے روکا۔

''بی جان کو آپ کی بہت فکر ہے۔''

تو بی جان کی وجہ سے وہ ایسا کہہ رہا تھا۔ وہ

خاموشی سے جانے کے لیے آگے بڑھی تو اس کی بات نے قدم روکے۔

"کوئی مسئلہ ہے تو بتایئے۔"

"بی جان کو میری وجہ سے کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔" وہ مڑی تھی۔

"مجھے لگا آپ کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"مجھے کچھ نہیں کہنا۔" گہرا سانس لیتی وہ مڑ گئی۔ وہ بھلا اس کا کون تھا جو وہ اسے اپنی پریشانی میں حصہ دار بناتی، ہوسکتا ہے یہ بات سن کر وہ اسے بھی مجرم ٹھہراتا۔

اگلی صبح وہ واپس چلا گیا تھا۔ مگر پورا ہفتہ اس کا پریشانی میں ہی گزرا تھا۔ شہزاد نے اس کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔ وہ اسے روز باور کراتا تھا کہ وہ اسے یہاں رہنے نہیں دے گا۔

اس رات وہ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی نیند تو یوں بھی کم ہی آتی تھی۔ موبائل بجنے پر اس نے دیکھا چوکیدار کی کال تھی۔ اس کے اٹھانے پر فون بند ہو گیا۔ اس نے نمبر ملایا مگر اٹھایا نہیں گیا تو کچھ سوچ کر وہ کمرے سے نکلی۔ بی جان کے کمرے میں جھانکا تو وہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ سیڑھیاں اترتی نیچے آ گئی۔

باہر جھانکا تو چوکیدار گیٹ کے پاس کرسی پر بیٹھا نظر آیا۔ وہ آگے بڑھ آئی۔ قریب پہنچنے پر اسے دھچکا لگا چوکیدار کرسی پر بے ہوش پڑا تھا اسے کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا مگر دیر ہو چکی تھی وہ مڑی تو سامنے شہزاد کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بول پاتی اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر کھینچ لیا۔

"مجھے چھوڑو۔" گیٹ سے نکلتے ہی اس نے مزاحمت کی مگر اسی وقت قریب کھڑی گاڑی کا دروازہ کھلا اور راشدہ تائی کا چہرہ نظر آیا۔ لمحوں کا کھیل تھا اس کے بولنے سے بھی پہلے انہوں نے اسے اندر کھینچ لیا تھا۔

☆☆☆

کس نے اسے کیا کہا تھا اسے کچھ ہوش نہیں تھا اسے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا تھا۔ وہ خاموش تھی اور چھوٹے سے گھر کو دیکھ رہی تھی جس میں اسے لایا گیا تھا۔ وہ سب نکلنے کی تیاری کر رہے تھے اور وہ چپ بیٹھی تھی۔

پھر راشدہ تائی نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا اور وہ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ٹرین اسٹیشن پر وہ رکے تھے۔ ٹرین کے آنے کا انتظار کرتے وہ بینچ پر بیٹھ گئے۔ فری اس کے قریب آ بیٹھی۔

"ویسے اچھا نہیں ہوا تمہارے ساتھ، اپنی طرف سے تو تم اپنی جان چھڑا چکی تھیں ہم سے۔" اس نے گویا مزا لیا۔

"بس پہنچتے ہی جب شہزاد سے نکاح ہو گا تو خود ہی سمجھ میں آ جائے گا کہ یہی اس کی اصل جگہ ہے۔" جواب راشدہ تائی کی جانب سے آیا تھا۔

"مبارک ہو۔" فری ہنسی تھی اور اس نے بے بسی سے سر جھکایا تھا۔ تو یہی اس کی قسمت تھی۔ ٹرین کی آواز آنا شروع ہو گئی تھی۔ اور اس کے اندر ایک جنگ جاری تھی۔

☆☆☆

گھر کے قریب گاڑی روکتے ہی اسے غیر معمولی پن کا احساس ہوا تھا۔ چند لمحے ہی لگے تھے اسے سمجھنے میں۔ گیٹ کھلا ہوا تھا اور اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر بے ہوش پڑے چوکیدار پر پڑی تھی۔ اس کی نبض دیکھ کر وہ تیزی سے اندر کی جانب بڑھا تھا۔ بی جان کو اپنے کمرے میں صحیح سلامت دیکھ کر اس کی بے چینی کو قرار آیا۔ بی جان رات کے وقت اچانک اسے دیکھ کر حیران تھیں۔ ان کو صورت حال سمجھاتا وہ دوبارہ نیچے آیا۔ بی جان نے سرونٹ کوارٹر سے غلام بخش، سکینہ بی اور نوری کو بھی بلا لیا تھا۔

"اقصیٰ کہاں ہیں؟" ریان چوکیدار کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا ایسے میں لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی بی جان کو خیال آیا۔ نوری ان کی ہدایت پر اقصیٰ کو دیکھنے چلی گئی۔ کچھ دیر میں وہ حواس باختہ سی نیچے اتری۔

"بی بی تو اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔" بی جان

نے پریشانی سے دیکھا۔ چوکیدار کو ہوش آ چکا تھا۔
''میں تو جی گیٹ کے پاس بیٹھا تھا کہ سامنے والوں کا ملازم آ گیا پھر اس نے فون کرنے کے لیے مجھ سے میرا موبائل مانگا اور اس کے بعد اچانک ہی میرے منہ پر کپڑا رکھ دیا۔'' ریان کے کہنے پر اس نے تفصیل سنائی۔
''ریان! آپ اقصیٰ کو تلاش کیجیے، وہ کہاں چلی گئیں۔'' بی جان پریشانی سے بولیں۔
''سارا گھر چیک کر لیں پھر دیکھتے ہیں۔'' چوکیدار کا موبائل چیک کرتے اس نے سنجیدگی سے کہا۔ نوری اور غلام بخش پورا گھر دیکھ آئے تھے مگر وہ کہیں نہیں تھی۔
''اس فون سے اقصیٰ کو کال ملائی گئی ہے۔ میری مانیں پہلے گھر کی ساری قیمتی چیزیں چیک کر لیں۔'' ریان نے بی جان کی جانب دیکھا۔
''اس گھر سے کچھ گیا ہوتا تو ہمیں معلوم ہوتا۔ آپ سب چھوڑیں اور اقصیٰ کو تلاش کریں۔ ہم انہیں جانتے ہیں۔ ان کی گواہی دے سکتے ہیں۔ بس آپ دیر مت کریں۔'' بی جان کے چہرے پر پریشانی تھی۔
''پہلے تسلی کر لیں بی جان! اسے تو ہم ڈھونڈیں گے ہی آپ.....''
''ہم آپ سے جو کہہ رہے ہیں وہ کریں۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا ہم خود کو کبھی معاف نہیں کر سکیں گے۔''
بی جان کے لہجے میں تکلیف تھی۔ ''اچھا آپ پریشان نہ ہوں آپ کی طبیعت کے لیے اچھا نہیں ہے۔'' ریان نے انہیں اطمینان دلایا۔
''آپ ہمیں چھوڑیں، دیر ہو گئی اور کوئی نقصان ہو گیا تو۔ نہیں ہماری بیٹی کو اس بار کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ وہ اسے لے گئے ہیں۔ وہ اسے دور لے جائیں گے۔''
بی جان کی باتیں اسے الجھا رہی تھیں۔
''ریلیکس بی جان۔ جذباتی مت ہوں وہ لڑکی، میرا مطلب ہے اگر اس کی حقیقت کچھ اور ہوئی تو آپ کو تکلیف ہو گی۔'' ریان نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔
''اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ہماری عذرا کی نشانی ہے اس کی بیٹی۔'' بی جان تڑپ اٹھی تھیں، آنکھوں سے آنسو ابل پڑے تھے۔
''عذرا پھوپھو کی بیٹی۔'' ریان حیرت زدہ تھا۔
''ہمیں ہماری بیٹی لا دیں۔'' بی جان بلک رہی تھیں۔ باقی سب بھی حیرت زدہ سے کھڑے تھے۔
ریان نے بی جان کا ہاتھ دبایا۔ اسے اقصیٰ کو تلاش کرنا تھا کسی بھی قیمت پر۔ بی جان کچھ بتا رہی تھیں اور وہ خاموش سن رہا تھا۔

☆☆☆

وہ ٹرین میں سوار ہونے لگی جب اسے ایک عورت کا دھکا لگا تھا۔ اور جیسے ساری منفی سوچوں کو بریک لگا تھا۔ ایک نظر اس نے راشدہ تائی کے ہاتھ پر ڈالی تھی جس میں اس کا ہاتھ دبا تھا اور آگے بڑھتے ان کی گرفت ڈھیلی ہوئی تھی اور لمحہ لگا تھا اسے فیصلہ کرنے میں۔ آج پھر اسے اپنے لیے ہمت کرنی تھی، زندگی بدلنے کی ہمت۔ اپنا ہاتھ چھڑاتے اس نے دوڑ لگا دی تھی۔ رات کا وقت تھا مگر مسافروں کا رش تھا جس سے بے نیاز وہ بھاگ رہی تھی۔ بہت سا شور اور آوازیں اسے اپنے پیچھے سنائی دی تھیں مگر وہ بھاگتی جا رہی تھی۔ سر پر اوڑھی چادر ڈھلک کر کندھوں تک آ گئی تھی۔ اپنے پیچھے اسے بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی تھی۔ اس کا تنفس تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔
یک دم پیچھے سے کسی نے روکنے کی کوشش کی اور وہ گرتے گرتے بچی تھی اور نیچے بیٹھ گئی تھی۔ بال کھل کر بکھر گئے تھے۔ ہاتھ سے انہیں ہٹاتے ہوئے اس نے ان پولیس والوں کو دیکھا تھا۔ وہ اپنی تیزی سے چلتی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی جب کوئی قریب آیا تھا۔
''سر! یہ لڑکی سرپٹ بھاگتی ہوئی پکڑی گئی ہے ہو سکتا ہے، اسی گینگ کی ہو۔''
''تم فکر نہ کرو مجرموں کو میں ہرگز نہیں بخشتا۔'' ریان ملک سفید شلوار سوٹ میں اس کے سامنے کھڑا

تھا۔اس کی سانس گویا وہیں تھم گئی تھی۔

''اب خود اٹھنا پسند کریں گی یا اس کا بھی انتظام کرنا پڑے گا۔'' اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔اسی وقت گاڑی قریب آ کر رکی تھی اور وردی والا ایک شخص اترا۔ریان نے اس کے ہاتھ سے چابی پکڑی۔

''ایس پی صاحب! لگتا ہے آپ کا مسئلہ حل ہوگیا ہے۔''

''بالکل آپ کے تعاون کا شکریہ۔'' دونوں نے ہاتھ ملایا۔''اینی ٹائم ایس پی۔اسی بہانے ہم نے ایک گینگ پکڑ لیا۔'' وہ مسکرا کر بولا پھر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتا وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔وہ چپ چاپ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

''تم نے کیا سمجھ لیا تھا ہم تمہیں فرار ہونے دیں گے۔'' ریان ملک کی بات پر وہ چونکی۔

''میں نے کوئی جرم نہیں کیا جو مجھے فرار ہونا پڑے۔''

''مجرم کب آسانی سے مانتے ہیں۔تم اس گینگ کا حصہ ہو اور اس کی خبر مجھے ہو چکی ہے۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا۔'' اسے غصہ آیا تھا۔

''مجرم تو تم ہو۔پہلے تمہیں لی جان کی عدالت میں پیش کروں گا پھر فیصلہ کریں گے کہ کیا سزا دینی چاہیے۔'' اس کا لہجہ سخت تھا۔انصٰی نے ہونٹ بھینچ لیے۔

☆☆☆

ملک جلال کا تعلق امیر اور با اثر گھرانے سے تھا۔ان کے چھوٹے بھائی کی موت بچپن میں سانپ کے ڈسنے سے ہوئی تھی اور اس کے بعد وہ اور ان کی بڑی بہن رہ گئے تھے۔بہن کی شادی کے بعد ان کے والد نے اس کا حصہ اسے دے دیا تھا اور باقی ساری جائداد کے وہ اکیلے وارث تھے۔ان کی زمینیں سونا اگلتی تھیں، جس نے ان کی شان و شوکت کو کچھ اور بڑھا دیا تھا۔ان کی تین اولادیں تھیں ملک روحیل، ملک ریحان اور عذرا ملک۔

عذرا میٹرک میں تھی تب سے ہی ان کی بہن نے اس کا رشتہ مانگنا شروع کر دیا تھا۔ممتاز بیگم کو یہ بات بالکل بھی پسند نہیں آئی تھی۔ایک تو وہ ان کے تیکھے مزاج سے خائف رہتی تھیں دوسرا ان کا بیٹا انہیں بالکل بھی پسند نہیں تھا۔اسی لیے انہوں نے عذرا کی پڑھائی تک شادی کے ذکر کو چھیڑنے سے منع کر دیا تھا اور ملک جلال بھی اس پر رضامند تھے۔بہن کو انہوں نے ٹال رکھا تھا مگر انہیں یہ رشتہ بیٹی کے لیے مناسب لگتا تھا۔

عذرا یونیورسٹی میں تھی جب ان کی بہن نے پھر سے دست سوال دراز کیا تھا۔ممتاز بیگم کے انکار کے باوجود وہ اقرار کرنا چاہتے تھے مگر ایسے میں عادل کی عیاش فطرت کے متعلق معلوم ہونے پر وہ اس سے خاصے بدظن ہو گئے تھے اور بہن کو صاف انکار کر آئے تھے۔

اس کے بعد وہ بہت بار منانے کے لیے آئی تھیں مگر ان کا انکار اقرار میں نہ بدلا۔عادل کو بھی ماموں کے انکار پر بہت غصہ تھا، یوں بھی عذرا اسے بالکل بھی لفٹ نہیں کرواتی تھی۔ایک تو وہ کتابوں کی دنیا میں رہنے والی لڑکی تھی۔دوسرا اسے عادل اپنی حرکتوں اور گستاخ نگاہوں کی وجہ سے زہر لگتا تھا۔اور جب وہ خود اس سے رشتے کی بات کرنے آیا تو اس نے اسے تلخی سے انکار کر دیا تھا۔

ملک جلال کے ملازم کا بیٹا جمال اسکالرشپ پر باہر سے پڑھ کر آیا تھا۔وہ خاصا قابل تھا اس لیے انہوں نے اسے فیکٹری میں اچھی پوسٹ پر رکھ لیا تھا۔ان ہی دنوں روحیل بھی پڑھائی مکمل کر کے فیکٹری آنے لگا تھا اور اس کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ایسے میں کچھ کام انہوں نے جمال کے سپرد بھی کر دیے تھے کہ وہ اعتماد والا تھا اور اس کے والد بھی خاصے پرانے ملازم تھے۔

گھر کے اندر اس کا آنا جانا رہتا تھا۔عذرا سے ایک ملاقات میں اسے اس کے کتابوں کے شوق اور اس کی لائبریری کا علم ہوا تو اس نے جھجکتے ہوئے چند

کتابیں پڑھنے کے لیے مانگ لیں۔ عذرا خاصی خوش ہوئی اور بخوشی اسے کتابیں دے دیں۔ پھر ان کے درمیان کتابوں کے موضوعات پر بات ہونے لگی۔ مگر دونوں نے مالک اور ملازم کی حد کو کبھی پھلانگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ نہ ہی کوئی ایسی بات ان کے ذہن میں آئی تھی۔ بس وہ ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے۔ مگر عادل کو عذرا کا یوں اس سے بات چیت کرنا سخت برا لگتا تھا اور اس سے بدلہ لینے کو اس نے روحیل کی مہندی والے دن ان دونوں کو بہانے سے کمرے میں بلا کر بند کر دیا تھا۔ پھر تو ممتاز محل میں گویا قیامت ہی آ گئی تھی۔ کسی نے ان کا یقین نہیں کیا تھا۔ ایسے میں اس کی پھوپھو، فہمیدہ اور عادل نے خوب آگ لگائی تھی۔

روحیل اور ریحان کا خون ابل رہا تھا۔ مگر ملک جلال انہیں روکے ہوئے تھے۔ ممتاز بیگم کو اپنی معصوم بیٹی پر اعتبار تھا مگر کوئی سننے کو تیار نہ تھا۔

ملک جلال نے فوری فیصلہ کر کے اس کا جمال کے ساتھ نکاح پڑھا کر اپنی زندگی سے بے دخل کر دیا تھا۔ ممتاز بیگم کی کسی نے نہیں سنی تھی۔ کتنے سال وہ بیٹی کے لیے تڑپتی رہی تھیں مگر ملک جلال نے اس کا نام لینے پر بھی پابندی لگا رکھی تھی۔ ان کی موت کے بعد ممتاز بیگم نے ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر عذرا کو تلاش کرنا شروع کیا تھا۔ ان کے بیٹے اس سے لاعلم تھے۔ جمال کے خاندان کا کسی کو نہیں پتا تھا کہ وہ کہاں چلے گئے۔

ایک سال کی تلاش کے بعد انہیں خبر ملی تھی کہ ان کی عذرا اب اس دنیا میں نہیں رہی تھی اور اس کا شوہر بھی ساتھ ہی اس جہان فانی سے کوچ کر چکا تھا۔ بس ایک بیٹی تھی جسے کچھ دور کے رشتہ دار اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

وہ خود عذرا کے گھر گئی تھیں اور ان کی ملاقات نادرہ خاتون سے ہوئی تھی۔ پھر ان لوگوں نے بھی پتا لگانے کی بہت کوشش کی تھی مگر ان کے ٹھکانے کا پتا نہیں چل رہا تھا اور ایسے میں اقصیٰ کا خود سے نادرہ خاتون کے گھر آنا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ نادرہ خاتون نے اس کی ساری کہانی ان کو سنا دی تھی اور اسے ان کے پاس بھیج دیا تھا۔

وہ خوش تھیں کہ عذرا کی بیٹی ان کے پاس آ گئی تھی مگر اس کی حقیقت اپنی اولاد کو بتانے سے وہ ڈرتی تھیں۔ اور پھر عذرا کے نام کے ساتھ جڑی بدنامی کہیں اس کی بیٹی کی زندگی کے لیے نقصان کا باعث نہ بنے۔ بس انہی باتوں نے ان کی زبان بند کر رکھی تھی۔ پھر فریحہ اور بلال کی شادی میں فہمیدہ کی باتوں نے انہیں نئی پریشانی سے دوچار کر دیا تھا کہ آخر وہ اس کی اصلیت کیسے چھپا پائیں گی۔

☆☆☆

اس نئی خبر نے اس کو عجیب سی بے یقینی میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس نے کب سوچا تھا کہ بی جان سے اس کا اتنا گہرا اور قریبی تعلق نکل آئے گا۔ کچھ وقت لگا تھا اسے یقین کرنے میں۔ خوشی کے ایک نئے احساس سے وہ آشنا ہوئی تھی۔ بی جان سے تو یوں بھی اسے ممتا کی خوشبو آتی تھی۔ اب جبکہ حقیقتاً وہ اس کی نانی تھیں تو اسے اپنی ماں خود سے کچھ اور قریب محسوس ہونے لگی تھی۔ بی جان کا التفات بھی بڑھ گیا تھا۔ اب جب بھی دل چاہتا وہ بے جھجک بی جان کے پاس جا کر لیٹ جاتی، ان کی گود میں سر رکھ لیتی۔ ماں باپ کی کمی کو وہ انہی کی محبت سے پورا کرنا چاہتی تھی۔

ریحان ملک تو واپس جا چکے تھے مگر یہ اطلاع ملتے ہی روحیل ملک اور بیگم روحیل بی جان کے پاس آئے تھے۔

''عذرا کی بیٹی ہمارے پاس ہی رہے گی اگر کسی کو یہ بات پسند نہ بھی آئے تو ہمیں فرق نہیں پڑتا۔'' بی جان نے ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی واضح کر دیا تھا۔

''ہم شرمندہ ہیں بی جان! اپنی بہن کی بے گناہی کا اعتبار بھی نہ کر سکے۔'' بی جان نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔ یہ کیا کہہ رہے تھے وہ۔

''چار دن پہلی عادل کا بہت برا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ تیسرے دن اسے ہوش آیا تو میں اس کے پاس

گیا اور مرنے سے پہلے اس نے اعتراف کیا کہ اس نے عذرا سے بدلہ لینے کی خاطر جمال اور عذرا پر الزام لگایا تھا۔"

روحیل کے لہجے میں ندامت اور افسردگی تھی۔ افسوس تو یہ تھا کہ بہن اب اس دنیا میں نہیں تھی کہ اس سے معافی مانگ لیتے۔

پھر انہوں نے بڑی محبت سے اقصیٰ کے سر پر پیار کیا تھا۔ اسے پہلی بار سگے رشتوں کی اپنائیت اور محبت ملی تھی جس پر اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

اس کی یونی سے چار چھٹیاں تھیں تو وہ بی جان کے ساتھ ملک روحیل کے گھر آ گئی تھی۔ بیگم روحیل بھی اب بہت اپنائیت سے ملتی تھیں اور ان سے اچھی بات چیت بھی ہو گئی تھی اور اذان تو تھا ہی بہت چلبلا اور نئے رشتے کے تحت اس نے اسے اپنی آپی بھی بنا لیا تھا۔ خاندان بھر میں اس کا تعارف عذرا کی بیٹی کی حیثیت سے ہو رہا تھا اور اب عادل کے اعتراف جرم نے اس کی ماں کے کردار پر لگے داغ بھی دھو ڈالے تھے۔

رافیہ کو بھی علم ہوا تو وہ اپنے بیٹے کے لیے پھر سے سوالی بن کر آ گئیں اور خاصی لگاوٹ سے اس سے ملیں۔ مگر اسے الجھن ہی ہوتی رہی اور اسی وقت ریان ملک کی آمد نے کچھ اور خفیف سا کر دیا۔ رات میں وہ بی جان کے پاس گئی۔

"مجھے ان کے بیٹے سے شادی نہیں کرنی بی جان اور پھر ابھی تو میں آپ کے پاس آئی ہوں۔ مجھے آپ کے پاس ہی رہنا ہے۔" اس کی پریشان صورت دیکھ کر بی جان مسکرائیں۔

"اپنی بی جان کے ہوتے ہوئے کیوں فکر کرتی ہیں آپ۔ آپ کی مرضی نہیں ہے تو نہیں کریں گے۔"

"آپ بس ہمیشہ مجھے اپنے پاس ہی رکھیے گا مجھے کہیں نہیں جانا۔ ابھی تو ملی ہوں آپ سے، کہیں نہیں جانا مجھے۔"

وہ بی جان کے سینے سے لگی بیٹھی تھی۔ وہ مسکرائیں ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو روحیل اور ان کی بہو نے اقصیٰ کو ریان کے لیے مانگا تھا۔ جس پر وہ بے حد خوش تھیں۔ ریان دستک دے کر اندر آیا تو نانی نواسی ایک دوسرے سے الگ ہوئیں۔

اسے دیکھ کر وہ سونے کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس روز کے بعد ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

وہ بالکنی میں بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی جب اذان دھپ سے آ کر سامنے والی کرسی پر گرا۔ اس نے چونک کر اسے گھورا۔ "ڈرا دیا۔"

"بس اب ڈرنے گھبرانے کے دن گئے۔ اب آپ کی زندگی میں ایسا دھماکا ہونے والا ہے جس کے بعد آپ کو دور دور تک ان چیزوں کا نام و نشان اپنی زندگی میں نظر نہیں آئے گا۔" اذان اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

"ایسا بھی کیا ہونے جا رہا ہے۔" اس کی نگاہیں کتاب پر تھیں۔

"اندر آپ کی منگنی شادی کی باتیں ہو رہی ہیں اور آپ کی نظریں کتاب سے نہیں ہٹ رہیں۔" کتاب اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی تھی۔

"تم مذاق کر رہے ہو نا۔" امید سے اسے دیکھا۔

"سو فیصد سچ کہہ رہا ہوں۔ محترم ایس پی ریان ملک کسی دھماکے کی طرح آپ کی زندگی میں شامل بلکہ نازل ہونے والے ہیں۔"

اذان شوخی سے بولا مگر وہ حیرت کی تصویر بنی بیٹھی رہی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا، شادی اور وہ بھی ریان ملک سے۔ اس کا دماغ اس بات کو قبول نہیں کر پا رہا تھا۔ رات تک وہ یہی بات سوچتی رہی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد وہ لان میں ٹہل رہی تھی جب یک دم وہ سامنے آ گیا۔

"لگتا ہے پھر سے فرار ہونے کا ارادہ ہے۔" اس کے مخصوص انداز پر وہ تپی تھی۔

''جی نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ آپ پولیس والوں کو ہر کسی پر چوبیس گھنٹے شک ہی رہتا ہے۔''

''مگر آپ پر تو یقین تھا مجھے کہ آپ کی کوئی کہانی ہے۔ بہت پہلے ہی میں پہچان گیا تھا کہ آپ عباس کے گھر والی لڑکی ریشم ہیں اور اس کے لیے آپ کی ایک جھلک ہی کافی تھی۔'' اس نے پچھلی بات کا حوالہ دیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی۔

''پھر آپ نے مجھے چھوڑ کیسے دیا۔''

''آپ پر نظر تھی میری کہ آپ ایسی ویسی حرکت کریں تو کوئی ایکشن لوں اور پھر بی جان آپ کے متعلق کچھ سننے پر بھی تو راضی نہیں تھیں، ان کو مطمئن کرنا بھی ضروری تھا۔''

''سزا تو آپ کو ملنی ہی چاہیے۔'' اسے خاموش دیکھ کر وہ بولا تو وہ فوراً بول پڑی۔

''میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔''

''اگر اتنا یقین تھا تو آپ کو بی جان کو یا مجھے بتا دینا چاہیے تھا بجائے خود پریشان ہونے کے۔'' ریان سنجیدگی سے بولا۔

''یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ جیسی زندگی میں نے گزاری ہے اس کے بعد اتنی جلدی اعتبار نہیں آتا نہ لوگوں پر نہ ہی حالات پر۔''

''اب خوش ہیں آپ نئی زندگی اور نئے فیصلوں سے۔'' اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو اسے یاد آیا، جھجک کر بولی۔

''آپ کو بڑوں کے فیصلے کا علم ہے۔'' شاید اسے معلوم ہی نہ ہو اس نے سوچا تھا۔

''بالکل۔۔۔''

''تو آپ نے انکار کیوں نہیں کیا۔ مطلب میں اور آپ بہت مختلف ہیں ایک دوسرے سے۔''

''اب کیا کریں' بی جان کا بوجھ بھی تو کم کرنا ہے نا اور پھر آپ نے خود ہی تو بی جان سے کہا ہے کہ آپ کو اپنے پاس ہی رکھ لیں۔'' اس کا انداز اسے غصہ دلا گیا تھا۔ ''جی نہیں' میں بی جان پر بوجھ نہیں ہوں اور میری بات کا مطلب کچھ اور تھا' آپ اسے غلط رنگ نہ دیں۔''

''پولیس والے تو بات کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں' ویسے آپ کہہ بھی دیتیں کہ اپنے پوتے سے شادی کرا دیں تب بھی بی جان برا نہ مانتیں۔'' اس نے محظوظ ہو کر کہا۔

''مجھے آپ سے شادی کا کوئی شوق نہیں اور میں ابھی جا کر بی جان کو منع کرتی ہوں۔ یوں بھی آپ مجھے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔'' اس کے منہ سے نکلا۔ وہ آگے بڑھنا چاہتی تھی کہ اس نے ہاتھ آگے کر کے راستہ روکا۔

''ایس پی ریان ملک پر ایسا الزام آپ نہیں لگا سکتیں۔''

''آپ نے ہمیشہ مجھ پر شک کیا ہے۔'' وہ ہنوز ناراض تھی۔

''یہ تو میں تمہیں تپانے کے لیے یوں ہی کہہ رہا تھا۔ میں دل سے تمہاری عزت کرتا ہوں' کسی رشتے کے بغیر جس طرح تم نے بی جان کا خیال رکھا اور پھر جب ساری کہانی معلوم ہوئی تو یہ عزت کچھ اور بڑھ گئی۔ تم نے برائی کی روش اختیار کرنے کے بجائے ہمیشہ اس سے بچنے کی کوشش کی۔ اس سب کو اپنی قسمت سمجھ کر قبول نہیں کیا بلکہ حالات سے لڑیں اور یہ عمل قابل ستائش ہے۔'' اس کے نرم لہجے اور آنکھوں میں کچھ ایسا تھا کہ اس کی نگاہیں جھک گئیں۔

''چلو پھر بتاؤ تمہیں یہ شکی مزاج ایس پی قبول ہے۔'' اس کی خاموشی پر وہ مسکراتے لہجے میں بولا۔

''بی جان کا فیصلہ ہے۔ قبول تو کرنا پڑے گا۔''

سر اٹھا کر وہ کچھ ایسے بولی تھی کہ ریان زور سے ہنس پڑا۔ وہ بھی مسکرا دی۔ اس کا یہ اپنائیت بھرا روپ اسے بہت بھلا لگ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی زندگی سے وہ بھیانک باب نکل چکا تھا اور ریان ملک کے سنگ اسے اب زندگی کی خوشیاں سمیٹنی تھیں، جو کہ اس کی اچھی نیت اور ارادے کا انعام تھا۔

آفتاب صاحب اور راشدہ بیگم کے چہیتے بیٹے کی آج دعوت ولیمہ تھی۔ آفتاب صاحب تو کب کے مرد مہمانوں کے ہمراہ شادی ہال روانہ ہو چکے تھے جبکہ راشدہ بیگم خواتین مہمانوں کو شادی ہال بھجوا کر، ملازمہ کی مدد سے گھر سمیٹ کر اب بڑی فرصت سے اپنے بیڈ روم میں تیار ہو رہی تھیں۔

سنہری کام دار سوٹ میں ملبوس، زیورات سے لدی پھندی۔ آج تو ان کی سج دھج قابل دید تھی۔ وہ دیوار گیر آئینے کے سامنے کھڑی اپنا جوڑا سیٹ کر رہی تھیں، جب اچانک ارم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

"ارے واہ اماں! آج تو آپ کی بڑی ٹور ہے۔" اس نے ماں کے سجے سنورے سراپے کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"چل ہٹ، شریر کہیں کی۔" وہ ذرا شرمائیں۔

حمیرا شفیع

بھیا کی شادی

"یہ ذرا میرا دوپٹا تو سیٹ کرنا۔"

"اماں وہ میں آپ سے یہ کہنے آئی تھی کہ میں دلہن بھابھی کو پارلر سے تیار کروا کر اسٹیج پر بٹھا آئی ہوں۔ مگر بھیا ابھی تک نہیں پہنچے ہیں۔" وہ ان کا دوپٹا سیٹ کرتے ہوئے بولی۔

"بیٹا! وہ تیار ہو رہا ہوگا۔ تمہیں پتا نہیں، آج کل کے دولہا تیار ہونے میں دلہن سے زیادہ ٹائم لگاتے ہیں۔"

"مگر اماں! کیا دلہن بھابھی اتنی دیر تک اسٹیج پر اکیلی بیٹھی رہیں گی۔" ارم کو نئی نویلی بھابھی سے بہت ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔

"چلو پھر چل کر دیکھتے ہیں کہ اسد ابھی تک تیار ہوا ہے یا نہیں۔" انہوں نے آخری بار آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور ارم کے ہمراہ کمرے سے باہر چل دیں۔

جب وہ دونوں اسد کے سجے سجائے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ بیڈ پر روٹھا روٹھا سا بیٹھا تھا۔ کپڑے بھی وہی رات والے پہن رکھے تھے، جن پر شکنیں واضح نظر آ رہی تھیں۔

"ارے میرے چاند! تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔" راشدہ بیگم اس کو دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

"بھیا! دیر ہو رہی ہے۔ آپ جلدی سے تیار ہو جائیں۔" ارم بھی پریشانی سے بولی۔

"آپ دونوں چلی جائیں۔ میں نہیں جا رہا

ولیمے پر۔" اس نے گویا ان دونوں کے سر پر بم پھوڑا۔

"ہائے میرے اللہ..... کیوں نہیں جا رہے۔" راشدہ بیگم اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولیں۔

"بس میں نہیں جاؤں گا....." اس نے دوٹوک انکار کیا۔

"بھیا! آپ شاید بھول رہے ہیں کہ یہ کسی اور کا نہیں، خود آپ کا اپنا ولیمہ ہے۔" ارم نے روہانسی ہو کر اسے یاد دلایا۔

"مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ یہ میرا ولیمہ ہے مگر آپ لوگ شاید بھول گئے تھے۔ خود تو اتنے اہتمام سے تیار ہیں۔"

اس نے ان دونوں کے لشکارتے مارتے وجود کو طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور میرے کپڑوں کا یہ حشر ہے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے الماری کھول کر اپنی وائٹ شرٹ نکالی اور ان کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔

یہ شرٹ اس نے فنکشن میں پہننی تھی مگر یہ دیکھ کر ارم اور راشدہ بیگم دونوں کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا کہ اس شرٹ کے دائیں طرف ایک ہلکا سا جامنی رنگ کا دھبہ نظر آ رہا تھا۔ اب احتیاط سے الماری میں لٹکائی اس شرٹ پر وہ داغ نجانے کیسے لگ گیا تھا۔

مگر اسد کے کپڑوں پر داغ لگ جانے کا مطلب وہ دونوں بخوبی جانتی تھیں۔

"اماں! میں اس کو جلدی سے دھو کر سکھاتی ہوں۔" ارم نے اپنے حواس بحال کرتے ہوئے پھرتی کا مظاہرہ کرنا چاہا۔

"بیٹا! پہلے ہی اتنی دیر ہو چکی ہے۔ کب دھلے گی اور کب سوکھے گی۔ پھر اگر دھلنے پر بھی داغ نہ اترا تو....." وہ پریشانی سے بولیں۔

"بھیا! اس شرٹ کے اوپر تو آپ نے کوٹ پہن لینا ہے، پھر داغ کہاں نظر آئے گا۔" ارم کو اچانک یاد آیا مگر اس کی اس بات پر اسد نے اسے ایسی کھا جانے والی نظروں سے گھورا کہ وہ گڑبڑا کر جلدی سے بولی۔

"شادی کے اور بہت سے نئے جوڑے رکھے ہیں۔ میں ان میں سے کوئی تیار کر دیتی ہوں۔"

مگر اسد نے اس کی اس تجویز پر بھی کوئی ردعمل نہ دیا اور بڑے سکون سے بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔

بیگم راشدہ اچھی طرح سے جانتی تھیں کہ اب نہ تو وہ پہلی والی شرٹ پہنے گا اور نہ ہی کوئی اور سوٹ.....

اتنے میں نومی ان سب کو ڈھونڈتا ہوا وہاں آ پہنچا۔

"آپ سب ابھی تک تیار ہو کر ہال میں کیوں نہیں پہنچے۔ تمام مہمان پوچھ رہے ہیں۔ ابا کا پارہ بھی بہت ہائی ہو رہا ہے۔"

"بیٹا! یہ اسد کی شرٹ پر داغ لگ گیا ہے۔" راشدہ بیگم بے بسی سے بولیں۔

"اگر تمہاری کوئی نئی شرٹ رکھی ہے تو بھیا کو دے دو۔" ارم نے جلدی سے کہا۔

"میری نئی شرٹ ہے مگر وہ بھیا کے کہاں آئے گی۔" اس نے اس کے موٹے تازے وجود کو مایوسی سے دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔

"اچھا میں دس منٹ میں بازار سے نئی خرید لاتا ہوں۔ بھیا آپ جلدی سے تیار ہونا شروع کریں۔"

"ہائے، جلدی کرو بیٹا!" راشدہ بیگم اور ارم کی جان میں جان آئی۔

پھر نومی نے راکٹ کی طرح موٹر سائیکل بھگائی۔ مگر بدقسمتی سے اتوار کا دن تھا اور ایک بھی دکان نہیں کھلی تھی۔ اس کو اچانک یاد آیا کہ اسد کے ایک اپنے دوست کی گارمنٹس کی دکان تھی۔ مگر وہ دوست تو خود شادی ہال میں دولہا کا انتظار کر رہا تھا۔ نومی نے اسے علیحدہ لے جا کر ساری صورت حال بتائی۔ خوبی قسمت چابی اس کی جیب میں تھی۔ بس پھر کیا تھا، ہنگامی بنیادوں پر دکان کھولی گئی اور نئی وائٹ

شرٹ اسد تک پہنچائی گئی۔

اتنے میں آفتاب صاحب کا غصے سے برا حال تھا۔ وہ فون پر راشدہ بیگم کو بے بھاؤ کی سنا رہے تھے جبکہ دولہا خود تو اپنا فون بند کر کے تیار ہو رہا تھا۔

ارم نے کمال فہم و فراست کا مظاہرہ کرتے ہوئے بے چین مہمان خواتین تک ملازمہ کے ذریعے یہ پیغام پہنچا دیا کہ اچانک راشدہ بیگم کی طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے دیر ہو رہی ہے۔ ان کی حالت سنبھلتے ہی وہ ہال آئیں گے۔

پھر اس نے پکڑ دھکڑ کر راشدہ بیگم کا میک اپ کم کیا۔ زیورات ہلکے کیے تاکہ ان کی سج دھج میں کچھ کمی آئے۔ پھر بیمار دکھانے کے لیے آنکھوں کے نیچے مصنوعی حلقے بنائے۔

اس طرح جب وہ کچھ بیمار ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے ہال میں داخل ہوئیں تو تمام مہمان خواتین ان کی عیادت کے لیے لپک کر آئیں۔ اب ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی فرضی بیماری کی کیا کہانی بیان کریں اور اندر ہی اندر یہ ملال بھی ہو رہا تھا کہ اب ویسے کی تصویروں میں وہ ذرا بھی اچھی نہیں آئیں گی۔

ان کو کتنا شوق تھا کہ عورتیں ان کو دیکھ کر سرگوشیاں کریں کہ دولہا کی اماں تو اس کی بڑی بہن معلوم ہوتی ہے۔ ہائے یہ اولاد بھی والدین کے ارمانوں پر کیسے مٹی ڈال دیتی ہے۔

☆☆☆

اسد، آفتاب صاحب اور راشدہ بیگم کا پہلوٹی کا بیٹا، بلا کا نفاست پسند تھا۔ بچپن میں بھی اگر یونیفارم پہنے اسکول جانے کے لیے کھڑا ہوتا تو کہیں سے کوئی چھینٹا اڑ کر کپڑوں پر آ گرتا تو ایک ہنگامہ برپا کر دیتا۔ اس لیے راشدہ بیگم اس کے دو تین یونیفارم تیار حالت میں رکھتی تھیں۔ اس کے کپڑوں پر داغ دھبا لگ جانے کا مطلب تھا کہ مانو قیامت آ گئی۔

جوں جوں بڑا ہوتا گیا ——— نفاست پسندی گھر والوں کے لیے آزمائش بنتی گئی۔ چھوٹے بہن بھائی کی تو جرأت نہیں تھی کہ اس کے کمرے کی دیوار پر انگلی تک پھیر دیں۔

راشدہ بیگم خود اپنی نگرانی میں اس کے کمرے کی صفائی کرواتیں۔ روز صاف بیڈ شیٹ بچھتی، جالے اتارے جاتے، پردے بدلے جاتے۔ ابا اکثر کہتے۔

"اس بے چھے بیل کو تو اس کی بیوی ہی آ کر کنٹرول کرے گی۔" جبکہ باقی اہل خانہ کا خیال تھا کہ بیوی کنٹرول نہیں کرے گی بلکہ بے چاری خود کنٹرول میں رہے گی۔

مگر راشدہ بیگم کے نزدیک تو اس کے لیے بیوی کے انتخاب کا ہی مرحلہ پہاڑ کی چوڑی سر کرنے کے برابر لگ رہا تھا۔

بیٹوں کی مائیں چندے آفتاب، چندے ماہتاب ڈھونڈتی ہیں۔ لذیذ کھانے بنانے والی ڈھونڈتی ہیں جبکہ وہ صفائی دھلائی میں ماہر لڑکی ڈھونڈ رہی تھیں۔ ایک رشتہ کروانے والی نے تو چڑ کر کہہ دیا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو کسی ماسی کا رشتہ لے آئے کیونکہ آج کل گھروں میں یہ کام ماسیاں ہی کرتی ہیں۔ لڑکیوں کو کہاں صفائی دھلائی کا شوق ہوتا ہے۔

پھر قسمت ان پر مہربان ہو ہی گئی، جب وہ ایک دن رشتے کروانے والی کے ساتھ اچانک ایک گھر میں داخل ہوئیں تو سامنے لڑکی کام والی کے ساتھ صحن دھلوانے میں مصروف تھی۔ وہ بکھرے بالوں کے ساتھ، پائنچے چڑھائے، بڑی جانفشانی سے جھاڑو پکڑے فرش چمکا رہی تھی۔ ان کی آمد سے بے خبر وہ دل جمعی سے جٹی ہوئی تھی۔

بس پھر کیا تھا، انہوں نے نہ دیکھی لڑکی کی شکل صورت اور نہ دیکھا گھر بار۔ جھٹ رشتہ ڈال دیا۔ گھر والے تو گھر والے لڑکی خود ششدر رہ گئی کہ ایسے سر جھاڑ منہ پہاڑ حلیے میں لڑکے کی ماں نے اسے نہ صرف پسند کر لیا تھا اور اب رشتہ بھی پکا کرنے چلی

تھیں۔

☆☆☆

عائکہ گھر میں ایک خوش گوار اضافہ ثابت ہوئی تھی۔ وہ ایک خوش باش اور پُراعتماد شخصیت کی مالک تھی۔ اسد کی نفاست پسندی اپنی جگہ قائم تھی۔ عائکہ خیال بھی بہت رکھتی تھی مگر اگر کوئی کمی بیشی ہو بھی جاتی تو ارم اور اماں کی طرح بدحواس ہونے کے بجائے ڈٹ کر مقابلہ کرتی تھی۔ بھیا کے کمرے سے بھی اب شاذ و نادر ہی چیخنے چنگھاڑنے کی آوازیں آتی تھیں۔ پتا نہیں اب یہ رویے کا بدلاؤ تھا یا پھر کوئی مصلحت پسندی۔

جاتی سردیوں کے دن تھے۔ فضا میں بس خوش گوار سی ٹھنڈک رہ گئی تھی۔ کراچی میں تو ویسے بھی سردی زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ اس بار تو کچھ زیادہ ہی مختصر رہی تھی۔ کمبل اور لحاف سمیٹے جا چکے تھے۔ خال خال ہی کوئی کمزور جان سوئٹر جرسی پہنے نظر آتا تھا۔

صبح کا حسین سماں تھا۔ عائکہ صاحبہ کچن میں پراٹھے بنا رہی تھیں۔ اماں ابا ٹی وی لاؤنج میں براجمان تھے۔ ارم کالج جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ اسد کے آفس کی ایک اور برانچ کھل رہی تھی۔ آج اس کی افتتاح تقریب منعقد ہو رہی تھی جس میں باقی اسٹاف ممبران کے ساتھ وہ بھی مدعو تھا۔ لازمی آج تیاری بھی خاص تھی۔ نوی موٹر سائیکل صاف کر رہا تھا۔

اتنے میں اسد بھی تیار ہو کر کمرے سے نکلا۔ وائٹ شلوار سوٹ پر ہلکا براؤن سوئٹر پہنا ہوا تھا۔ وہ تو شدید سردی میں بھی اماں ابا کے بے حد اصرار پر کوٹ وغیرہ پہنا کرتا تھا۔ اس لیے آج خلاف معمول سوئٹر پہنا دیکھ کر اماں کو بے حد تشویش ہوئی۔

"کیا بات ہے بیٹا! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔" وہ پوچھے بنا نہ رہ پائیں۔

"جی اماں! بس کچھ کچھ زکام کے آثار لگ رہے تھے۔ اس لیے سوئٹر پہن لیا ہے۔" اسد نے مسکرا کر جواب دیا اور آفس کے لیے نکل گیا۔

☆☆☆

ارم کالج سے واپس آئی تو عائکہ ڈھیروں کپڑے دھو چکی تھی۔ اب ان کو سمیٹنے کی باری تھی۔ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ بھی ان کی مدد کے خیال سے ان کے کمرے میں چلی آئی۔

ابھی وہ دونوں فارغ ہوئی تھیں کہ اسد آفس سے واپس آ گیا۔ ابھی تک سوئٹر پہنا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے؟ آج آپ نے دوپہر میں بھی سوئٹر نہیں اتارا۔ اب تو اچھی خاصی گرمی محسوس ہوتی ہے۔" عائکہ پوچھنے لگی۔

"مت پوچھو بیگم! میرے ساتھ صبح بہت برا ہوا۔ جب یہ سوٹ پہننے لگا تو دیکھو یہ کیا ہوا۔" (اس کے ساتھ ہی اسد نے اپنا سوئٹر اتار دیا۔ بائیں کندھے کے پاس ایک بڑا سا سیاہ داغ نظر آ رہا تھا) "یہ داغ نجانے کیسے لگ گیا تھا۔ اب دوسرا کوئی سوٹ پریس نہ تھا۔ تم سب مصروف تھے۔ ٹائم بھی کم تھا۔ اس لیے میرے ذہن میں ترکیب آئی کہ سوئٹر پہن لیا جائے۔ داغ بھی چھپ گیا اور تقریب بھی نمٹ گئی۔"

وہ وضاحت کرتے ہوئے واش روم میں چلا گیا جبکہ ارم اپنی جگہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ بھائی کی شرٹ پر داغ لگ گیا..... نہ کوئی قیامت آئی، نہ کوئی ہنگامہ برپا ہوا.....

اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی دعوت ولیمہ کا منظر گھوم گیا۔ جب اس نے اپنی شرٹ پر داغ لگ جانے پر اتنا تماشا کھڑا کیا تھا۔

آج اس کے رویے میں اتنی لچک، اتنا ٹھہراؤ..... یقیناً اس کا کریڈٹ صرف اور صرف عائکہ کو جاتا تھا۔

ابا ٹھیک کہتے تھے کہ اگر بیوی چاہے تو اکھڑ سے اکھڑ اور کرخت مزاج شوہر کو بھی رام کر سکتی ہے۔

اس نے عائکہ کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر شرمگیں مسکراہٹ تھی۔ اس نے اپنی دو انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنایا۔ بھابھی سے نظریں چار ہوئیں اور پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

☆

فرح بخاری

وہ نازنین

ناولٹ

عبدالواسع کوئٹہ میں وکالت کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اپنے باغ کے حصول نے واسع کو وکالت کی طرف مائل کیا ہے۔ واسع کی بہن رباب پھوپھی زاد نصیر سے محبت کرتی ہے، لیکن گلشن پھپھو دونوں کی شادی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ ان کے ہاں بناوٹے سٹے کے شادیاں نہیں کی جاتی تھیں۔ سیف اور نغمہ کی شادی کو چھ برس بیت چکے ہیں لیکن ان کی کبھی ایک دوسرے سے نہیں بنی۔ پشمینہ سیف کی بہن ہے، وہ رئیس کی بچپن کی منگ تھی لیکن چھ برس پہلے ایک واقعے نے ان کے راستے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیے تھے۔ نازنین کوئٹہ شہر میں اپنے بابا کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کے بابا کسی بیوہ عورت سے چوری چھپے شادی کر چکے ہیں اور اس کا رشتہ اپنے ایک رنڈوے دوست کے ساتھ طے کر دیتے ہیں۔ نازنین عین نکاح کے وقت شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ دولہا والے دلہن کو زبردستی اٹھا لے جاتے ہیں۔ ادھر واسع کوئٹہ سے گھر واپس جا رہا ہے۔ بس میں ایک مسافر لڑکی تمام راستہ روتی ہوئی ملی، واسع کو شبہ گزرا کے اس کی ساتھی عورت اسے اغوا کر کے لے جا رہی ہے لیکن وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر پایا۔ اگلے روز اسے اپنے کمرے میں اچانک سامنے پا کر واسع کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ معلوم ہوا وہ لڑکی اس کے چچازاد سیف اللہ کی سالی نازنین ہے اور اب یہیں رہنے والی ہے۔ نازنین کو اس کی بہن نغمہ نے مصیبت سے نکالا تھا۔

اب آگے پڑھیے۔

پانچویں قسط

تو یہ ہے وہ محبت جو بیک وقت خوف اور بہادری سے دوچار کرتی ہے۔ گھبراہٹ سے آغاز لے کر جرأت تک جاتی ہے، آغاز سکھ شانتی کی لہروں پہ تیرتا سا لگتا ہے تو انتہا میں انتہا کا درد ہے۔ اُس کے اوکیں احساس میں ایک اضطراب آگیں عجلت ہے تو انجام میں نہ ختم ہونے والے سراب سا ادھورا پن۔ ٹھنڈی آگ کے شرر کا دوسرا نام۔ محبت۔

وہ دونوں اپنی اپنی چھت پر قریب بارہ پندرہ فٹ کے فاصلے پر کھڑے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ واسع اپنے دونوں ہاتھوں میں کتابوں کا ڈھیر اُٹھائے ابھی ابھی چھت پر آیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ نازنین بھی اس وقت بالکل اسی کے انداز میں سامنے گردن تک کتابیں اُٹھائے عین اسی وقت اوپر آئی تھی۔

نازنین کی حیرت کا باعث اگر کتابیں تھیں تو واسع اس کے اکیلے ہونے پر ساکت ہوا تھا۔ معلوم نہیں کتنے دنوں سے ایسے کسی لمحے کا تصور باندھ رکھا تھا جب وہ دوبارہ اسے اکیلی ملے گی۔ اس نے تو نازنین سے بہت کچھ پوچھنا بھی تھا۔ واسع مسکرایا تو چونک کر سیدھا ہوتے وہ اندر بڑھ گئی۔ واسع نے اتنے وقت کو غنیمت جانتے فوراً اندر جا کر کتابیں بستر پر پھینکیں اور اُلٹے قدموں واپس آیا۔ قدم دوبارہ وہیں آکر رُکے جہاں سے چلے تھے۔ نازنین کی کوشش البتہ نکلنے کی لگ رہی تھی۔

''پشمینہ کہاں ہے؟'' عام لب و لہجے میں اس نے یوں استفسار کیا جیسے واقعتاً اسی کے متعلق جاننا چاہتا ہے۔

''وہ تو نیچے۔'' نازنین اس کے مخاطب ہونے کے خیال سے ہی اتنی نروس تھی۔ گھبرا کر پلکیں لمحے کو اٹھائیں پھر گرا دیں۔ واسع کی شرارتی مسکراہٹ کبھی رُکتی ہی نہ تھی۔

''رُکو نا۔ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''
وہ چھوٹی دیوار کے نزدیک آیا لیکن نازنین بجائے جواب دینے کے کبھی اپنی جانب والی سیڑھیوں کو کبھی واسع کی پیچھے والی اُن کی سیڑھیوں کو دیکھ رہی تھی۔

''مرد نہیں۔ کوئی نہیں آتا۔'' وہ غصہ ہوا۔

''کیا کہنا ہے؟'' وہ بھی جھنجھلائی۔

''ایسے کیسے کہوں۔ تم تو بھاگنے کو تیار کھڑی ہو۔''

''ہاں تو کوئی آگیا تو بھاگوں گی نا۔'' وہ دبے دبے چلائی تو واسع ہنس پڑا۔

''چلو، بعد میں بتاؤں گا۔ اب تو میں یہاں شفٹ ہو گیا ہوں اُوپر۔''

''آپ۔ یہاں شفٹ ہو گئے ہیں۔ کیوں؟''
نازنین کا احتجاج نہایت پُرزور لیکن لہجہ مجبوراً دھیما تھا۔ واسع نے خفا ہو کر ابرو چڑھائے۔

''میری اپنی چھت ہے، کیوں شفٹ نہیں ہو سکتا۔''

''ارے لیکن۔ کسی کو پتا چلا تو..... تو.....'' وہ آگے بول ہی نہیں پائی۔

''تو وہ ہم دونوں پہ شک کرے گا۔'' وہ بے ساختہ زور سے ہنسا۔

نازنین نے غصے سے۔ گھورا۔ چند سیکنڈز پہلے تک یہی ارادہ تھا کہ بنا اس کی کوئی بھی بات سنے یہاں سے چلی جائے گی لیکن اس کے ارادے اور عمل اب رکنے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ اس کی دیکھا دیکھی چھت پہ آن ٹپکا تھا۔ سیف لالہ ویسے بھی خفا تھے۔ کسی کو شک ہو گیا تو.....

''دیکھیں، میں صاف صاف بتا رہی ہوں، اگر آپ چھت سے نہ گئے تو میں نیچے چلی جاؤں گی۔'' نازنین نے گھبراہٹ کو یک لخت سائیڈ پہ رکھا۔ معاملہ نہایت گمبھیر تھا۔ وہ اس لڑکے کو ہرگز ڈھیل نہیں دے سکتی تھی۔ بھلے وہ اسے سیدھا اور شریف لگا تھا لیکن..... نہیں نہیں۔ یہ لگنا وگنا تو صاف

نظر کا دھوکا ہوتا ہے۔

"کچھ دنوں کے لیے آیا ہوں کم عقلے! تم دو منٹ میری بھی سن لو۔" واسع کا بس نہیں چلا ورنہ آگے بڑھ کر اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیتا۔ دو ہی منٹ میں جس بے وقوف کی رنگت اُڑ چکی تھی۔ اوسان خطا تھے۔

"شبنم باجی کی شادی شروع ہو رہی ہے۔ کل صبح میری دونوں بہنیں اپنے بچوں سمیت یہاں آ رہی ہیں۔ میرے اگلے ہفتے سے امتحان شروع ہو رہے ہیں۔ میں تیاری کرنے گھر آیا ہوں اور اب شادی کی وجہ سے نیچے پڑھنا مشکل ہے تو اماں نے ہی اوپر بھیجا ہے۔"

واسع نے اس کے انداز دیکھتے جلدی جلدی سارا معاملہ سامنے رکھا اور دورانِ گفتگو ہی نازنین کے تیور درست ہونے لگے۔

"آخری خوشی کی خبر یہ ہے کہ یہ پورا ہفتہ میں تمہاری آنکھوں کے سامنے رہوں گا۔" واسع نے ذرا سی گردن جھکا کر خاکساری کا تاثر دیا جس پر نازنین کی ہنسی نکل گئی۔ یہ تسلی ہوتے ہی کہ اچھا لڑکا اس کی وجہ سے یہاں شفٹ نہیں ہوا تھا۔ اس کے دل سے کدورت کی تہیں ہٹنے لگیں۔

"یہ گڈ نیوز ہے؟" وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

"دیکھو نا۔ کتنی خوشی ہوئی تمہیں۔" وہ اس کی ہنسی کی جانب متوجہ تھا۔

"تو آپ بھی سن لیں ایک گڈ نیوز کہ میں یہ پورا ہفتہ نیچے جا رہی ہوں۔"

"ہوں۔" واسع نے پرسوچ ہنکارا بھرا۔ "پھر تو ضرور شک ہو جائے گا سب کو۔ چلو تمہاری مرضی۔"

"نہیں ہوگا کسی کو شک۔" وہ سنجیدگی کے پیچھے چھپی اس کی شرارت کو بخوبی سمجھ رہی تھی۔

"اچھا وہ میری ضروری بات۔"

"بس ایسے ہی خوامخواہ۔" وہ مسکراہٹ دبائے سیڑھیوں کے قریب پہنچی۔

"سچی، اپنی قسم۔ بہت ضروری بات ہے۔" وہ دھیمی آواز میں کہے گیا۔ نازنین نے پلٹ کر خفگی سے دیکھا۔

"اپنی قسم نہیں کھایا کرتے۔"

"کیوں؟ وہ تو نہ خود جانا چاہتا تھا نہ اسے جانے دینا چاہتا تھا۔

"قسمیں کھانا کوئی اچھی بات ہے۔" وہ ہلکی سی سائیڈ لیے کھڑی تھی اور اس کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی۔

"تعلق میں بھروسے کی فضا قائم ہو جائے، پھر کوئی قسم نہیں۔" لہجے میں کیا رسان تھا۔ نازنین اپنا جواب منہ میں دبا کر رہ گئی۔

"ہاں ہاں۔ اب کہہ دو۔ کیسا تعلق، کون سا بھروسا؟" وہ جتاتے انداز میں کہے گیا اور نازنین کو بھی ہنسی آ گئی۔ یہی تو کہنا چاہ رہی تھی۔

"اور میری وہ ضروری بات۔ کیا کسی چاندنی رات میں سننے کا پروگرام بنایا ہے؟" وہ خود بھی دبے دبے مسکرا رہا تھا جانتا تھا۔ وہ رُک کر پلان کر کے کبھی ٹائم دینے والی نہیں، ابھی بھی آخری جملے پر زبردستی مسکراہٹ روکتے تیز قدموں سے اتر گئی تھی۔

تو عبدالواسع کسی حسین اتفاق کی راہ دیکھیں۔ یا شاید..... کوئی انہونی۔ دماغ میں نجانے کیوں خیال سا لہرایا اور اس نے سر جھٹک کر ذہن ہٹایا، اس کی سوچیں کبھی منفی نہیں رہی تھیں۔ پتا نہیں کیوں پھر۔ شاید محبت وہمی کرنے لگتی ہے۔ وہ چھوٹی دیوار پہ اپنی چھت کی طرف رُخ کیے بیٹھا تھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ہی اپنا موبائل اوپن کر لیا۔

وہ دیکھتا ہے تو نظریں سنائی دیتی ہیں
وہ بولتا ہے تو باتیں دکھائی دیتی ہیں

"ہاہاہا....." واسع کا بے ساختہ قہقہہ اُمڈا۔ فیس بک آن کرتے ہی شاعری کے گروپ میں پہلا شعر ہی ایسا نظر آیا۔

خود سے اقرار محبت بھی غضب ہے یعنی ساری دنیا کم بخت اب کیا اسی دائرے کے گرد گول گول گھومے گی۔

☆☆☆

"چلوناں دادی! وہاں سب راہ دیکھتے ہوں گے۔ باری بھی باہر موٹر سائیکل لیے کھڑا ہے۔"

رباب اپنی چپلوں کو کپڑے سے رگڑ کر صاف کرتے اب چادر اوڑھ رہی تھی۔ شبنم کی مہندی کا فنکشن اگلے روز تھا۔ آج سے جہیز والے کمرے کی سجاوٹ شروع ہو رہی تھی اور نگار چاچی نے کہلوایا تھا کہ دادی ہی کے ہاتھوں کام کی بسم اللہ ہوگی۔ یوں تو جبار چاچا کا گھر دو گلیاں چھوڑ کر ہی تھا لیکن دادی سے اتنا بھی چلنا مشکل تھا۔ اس لیے باری رئیس سے اس کی بائیک مانگ لایا تھا۔ رباب نے دادی کو سہارا دے کر باری کے پیچھے بٹھایا اور اُن دونوں کے روانہ ہوتے ہی خود پیدل پیچھے آنے لگی۔ دادی نے اب شادی ختم ہونے تک وہیں رہنا تھا۔ نیلم نے اُسے بھی بلا لیا تھا کہ ایسے موقعوں پر اکٹھا ہونے کا بھی اپنا مزا تھا۔ وہ چادر سے چہرا چھپائے چلتی ہوئی جس وقت جبار چاچا کے گیٹ پر پہنچی، نصیر اسی وقت ماں کو لیے بائیک پر وہاں پہنچا۔ رباب نے گلشن پھوپھی کو سلام کر کے راستہ دیا اور نصیر بھی مسکراتا ہوا پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔

اندر صحن میں سب دادی سے مل رہے تھے۔

"اللہ پاک نصیب اچھے کرے، دادی تو دعائیں ہی دے سکتی ہے بچے۔" وہ شبنم کو ساتھ لپٹائے اس کا ماتھا چوم رہی تھیں جس کی آنکھیں اس جذباتی منظر نے پھر سے نمناک کر دی تھیں۔

"دیکھو ناں اماں! ہر وقت روتی رہتی ہے۔" نگار نے بمشکل خود پر قابو پایا، شبنم کے آنسوان سے بھی دیکھے کہاں جاتے تھے۔

"لے دیکھ۔ دلہنوں کو کبھی روتے نہیں دیکھا کیا۔" گلشن نے نگار کے اعتراض پہ اعتراض اُٹھا دیا، رباب نے آگے بڑھ کر شبنم کو دادی سے الگ کیا اور مسکراتے ہوئے اس کا چہرا اونچا کیا۔

"تم بس مسکراتی اچھی لگتی ہو۔" اور اُن دونوں کی طرف مکمل متوجہ گلشن رباب کے مسکراتے حسین چہرے اور اپنے بیٹے کی وارفتگی کو دیکھ کر سلگ ہی اُٹھی۔ مسکراتے ہوئے کون اس وقت قیامت ڈھا رہا تھا صاف دکھائی دے رہا تھا اور باقی سب سے جان بوجھ کر پیچھے کھڑا ان کا بیٹا رباب کی موجودگی میں کسی اور جانب توجہ دے ہی نہیں پاتا تھا۔ اور گلشن کو یہ توجہ کہیں اور ہٹانی تھی۔

"یہ دیکھو، میری ہنستی مسکراتی بیٹی تو اب آئی ہے۔" گلشن نے قریب آتی نیلم کو دادی سے ملنے بھی نہیں دیا اور جھٹ اپنے گلے سے لگا لیا۔

"مہ کوا پھوپھو۔ میری ہنسی کی دشمن بالکل آپ کے ساتھ کھڑی ہے۔" نیلم نے پھوپھو کے گلے ملتے ایک چور نظر اپنی ماں پر ڈالی تو وہاں موجود سب ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ نیلم یونہی بے ساختہ بولتی تھی اور بڑا ہی سیدھا وار کرتی۔

"کیوں بے چاری کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔ تم جانتی ہو نا، نیلم میری بیٹی ہے۔" وہ اسے خود سے چپکائے ناراض نظروں سے نگار بھابی کو دیکھ رہی تھیں اور میری بیٹی کہنے پر جس طرح رباب اور نصیر نے بے ساختہ ایک دوسرے کو دیکھا تھا، وہ معنی خیزی نیلم سے چھپی نہ رہ سکی۔

"نصیر اور رباب۔ اچھا؟" اس نے ہنس کر سوچا اور سر جھٹک کر پھوپھو سے الگ ہو گئی۔

☆☆☆

"اے مینے۔ سو گئیں کیا؟" نازنین نے اندھیرے میں ہلکی سی آواز نکالی تاکہ اگر وہ سچ مچ سو چکی ہے تو اونچی آواز سے ڈر نہ جائے۔

"نہ مڑے۔ جب تک کوئی ہزار داستان نہ چھیڑ لیں، نیند بھی کہاں آتی ہے۔" خمار آلود لہجے میں کہتے اس نے کروٹ بدلی تو نازنین کا قہقہہ گھنکا۔

سائیڈ ٹیبل پہ رکھے موبائل میں وقت دیکھا، ابھی رات کے دس بجے تھے۔

"تم ہی سناؤ کچھ۔ سنتے سنتے نیند بھی آنے لگے گی۔" نازنین نے اکسایا۔

"میری تو گلے ایک ہی کہانی تھی جو من وعن تجھے سنادی، اب کیا اسی کو مرچ مسالہ لگاؤں؟" اندھیرے میں پشمینہ کی ہنسی سنائی دی۔

"وہ۔۔۔ اُس روز تم رباب لوگوں کے باغ کی بات بتا رہی تھیں۔ تم نے کہا تھا تفصیلی جواب ہے۔ وہ کیا قصہ ہے بھلا؟"

نازنین کے اندر تب سے تجسس بن کر اٹکی تھی وہ ایک بات۔ نجانے واسع لوگوں کا باغ کیوں نہیں تھا، پھر پشمینہ کی مبہم تشبیہ، بات کچھ خاص تو ضرور تھی۔

"آں۔ داسے (اچھا وہ بات)۔" پشمینہ نے یاد آنے کے انداز میں دہرایا۔

"تمہیں یاد ہے، میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ باغ بھی جبار چچا کا ہے اور اس سے اگلا بھی۔"

"ہاں یاد ہے۔"

"تو تم نے سوچا نہیں کہ باقی سب کا ایک ایک باغ اور جبار چچا کے دو کیوں؟"

"نہ نہ۔ اس پر کیا سوچنا، یہ دنیا بھی ترازو کے تول سے کہاں چلتی ہے، کسی کے پاس کل جہان، کسی کے پاس تنکا بھی نہیں۔ یہ تو ریت ہے نا اس دنیا کی۔" وہ اپنے اُلٹے ہاتھ پہ ٹھوڑی جمائے سائیڈ کر کے لیٹی تھی۔ کھلے بال پیچھے سرہانے پہ بکھرے تھے۔

"ہاں یہ تو ہے۔" پشمینہ نے گہری آہ بھری۔

"اور یہی تو ہوا ہے واسع لوگوں کے ساتھ۔"

"اچھا۔" نازنین کا دل دھڑکا، نیم روشنی میں پشمینہ سیدھی لیٹی چھت کو گھورتی آج جیسے حبیب چاچا کے غم میں ڈوبی تھی۔ نازنین بھی ہمہ تن توجہ تھی۔

"مجھے زیادہ یاد تو نہیں جب یہ سب کچھ پیش آیا لیکن بات اتنی زیادہ پرانی بھی نہیں۔ یہی کوئی آٹھ نو سال پہلے کی ہوگی۔ وہی اسکول میں پڑھنے کھیلنے کے دن تھے جب نازیہ باجی اور جبین باجی کی ایک ساتھ شادی ہوئی۔ ہم نے تو ویسے اماں سے یہ ساری باتیں سن رکھی ہیں یا کبھی بابا اور سیف لالہ گھر میں تذکرہ آنے پر یاد کر بیٹھتے ہیں۔

چاچا حبیب الرحمن بڑے ہی کھلے دل والے، نیک اور فیاض طبیعت کے تھے۔ کسی کی ہمدردی میں بنا سوچے کسی بھی حد تک چلے جاتے تھے۔ سنا ہے ان کے کسی دوست کو کاروبار شروع کرنے کے لیے رقم چاہیے تھی تو انہوں نے اپنی دو دکانیں بیچنے کا ارادہ کیا۔

حبیب چاچا نے دوست کی مشکل دیکھتے دکانیں خرید لیں۔ شاید جتنا کچھ بچا رکھا تھا سب لگ گیا۔ لیکن تقدیر دیکھو کہ دکانیں خریدے ابھی تھوڑا

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور تحفہ

دستِ کوزہ گر

فوزیہ یاسمین

قیمت -/750 روپے

منگوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

ہی ٹائم گزرا تھا کہ نازیہ اور جبین باجی کا ایک ساتھ بڑے غیر متوقع طور پر نہ صرف رشتہ بلکہ شادی بھی تیار ہوگئی۔ چاچا نے پہلے تو وہی خریدی ہوئی زمین ہی دوبارہ بیچنے کی کوشش کی لیکن کہیں سودا طے نہیں پایا۔ پھر وہ جبار چاچا کے پاس آئے۔ بھائیوں میں تب بھی خوش حال وہی تھے۔ انہیں کاروبار کی سوجھ بوجھ باقی بھائیوں کی نسبت ہمیشہ سے زیادہ رہی ہے۔ حبیب چاچا نے ان سے بھی دوکانیں خریدنے کی بات کی لیکن وہ انٹرسٹڈ نہیں تھے۔ پھر شاید چاچا نے ادھار رقم کی بات کی لیکن رقم بھی ظاہر ہے کہ ہزاروں میں نہیں تھی، دو بیٹیوں کے جہیز، زیور، شادی کا خرچا انہیں بھی تو لاکھوں چاہیے تھے۔ لیکن جبار چاچا ادھار دینے کو تیار نہ ہوئے، انہوں نے صاف الفاظ میں بڑے بھائی سے کہہ دیا کہ آپ تو نوکری والے ہیں۔ باغ کا زیادہ خیال بھی رکھ نہیں پاتے، آپ یہ باغ ہی چند سال کے لیے میرے حوالے کردیں، میں مطلوبہ رقم خود ہی پھلوں کی فروخت سے نکال لوں گا۔

حبیب چاچا کو بھی رقم کی اتنی ضرورت تھی کہ جولباً کسی بحث میں پڑنے کے بجائے ہامی بھر لی۔ سنا ہے تین سال کے پھل کی بات ہوئی تھی۔ تو خیر ڈیل طے ہونے کے بعد حبیب چاچا نے نہ صرف باغ ان کے حوالے کردیا بلکہ اپنے ڈیرے پر بیٹھنا بھی چھوڑ دیا کیونکہ یہاں سب ہی کے حجرے، ڈیرے باغوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ ادھر نازیہ اور جبین کی شادیاں ہوگئیں اور ادھر جبار چاچا نے دنوں میں ہی باغ کو کیا سے کیا بنا دیا۔ پہلے جس باغ میں صرف سیب اور آڑو ہوا کرتے تھے وہاں خوبانی، انگور اور آلو بخارا کے پودے لگ گئے اور بیٹیوں کی شادی کے کچھ دو سال بعد حبیب چاچا بھی فوت ہوگئے۔

اب معلوم نہیں، جبار چاچا کی نیت بھائی کی وفات کی وجہ سے بدلی یا کچھ اور بات تھی لیکن وہ ملنے ملانے والوں سے یہی کہنے لگے تھے کہ حبیب لالہ نے باغ انہیں بیچ دیا تھا۔ جمیلہ چاچی شوہر کی وصیت پر عمل کرتے تین سال پورے ہونے پر باغ واپس لینے بھی گئی تھیں۔ انہیں حبیب چاچا کہہ گئے تھے کہ تین سال کی بات ہوئی ہے لیکن جبار چاچا نے انہیں بھی مایوس لوٹا دیا۔"

"لیکن دادی تو زندہ ہیں ابھی۔ گھر کے ایسے گمبھیر مسئلے کو سلجھانے میں تو وہ بھی مدد کرسکتی ہیں؟"

"ہاں، انہوں نے بھی بہت زور لگایا، انہیں تو حبیب چاچا ہی اپنی پوری اولاد میں سب سے زیادہ پیارے لگتے تھے۔ جبار چاچا کو انہوں نے یتیم بچوں، مرحوم بھائی آخرت کا خوف، اللہ کا ڈر۔ کیا کچھ نہیں سمجھایا لیکن پھر تھک ہار کر چپ ہی ہوگئیں۔ ویسے میرے بابا کہتے ہیں، حبیب الرحمن کو چاہیے تھا جب جبار سے معاملہ طے کیا تب باقی بھائیوں کو بیچ میں بٹھاتا، تاکہ کوئی شک شبہ باقی نہ رہتا لیکن ان کی سادگی تھی کہ بھائی پہ اندھا اعتماد کیا۔ پھر زندگی بھی دیکھو تو کیسے دغا دے گئی۔"

"تو پھر..... ہوگا کیا؟ حبیب چاچا نے باغ بیچا تو نہیں تھا۔" نازنین کو رباب، باری، واسع اور جمیلہ چاچی کی مجبور بے بس صورتیں ایک ایک کرکے ذہن میں پھرنے لگیں۔ کسی اپنے کی ایسی ڈھٹائی اور بے حسی بھی کتنی تکلیف دہ ہوا کرتی ہے خصوصاً جب آپ سمجھانے میں بھی مکمل ناکام رہیں۔

"پتا نہیں۔" پشمینہ نے پھر ایک آہ بھری۔ "واسع کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ اپنا حق لینے کے لیے ہی وہ قانون کی تعلیم حاصل کررہا ہے، دیکھیں پھر کیا بنتا ہے۔"

پشمینہ نے اپنی طرف سے بات ختم کرکے کروٹ بدل لی اور نازنین اسی حالت میں لیٹے لیٹے واسع کے متعلق سوچ گئی۔ بظاہر بہت بے فکرا سا لگتا تھا۔ ہنسنے ہنسانے والا، ایک دم لاپرواسا۔ کیا وہ اتنا گہرا ہے اندر سے اور کیا وہ کامیاب ہوجائے گا اپنے مقصد میں؟

"اگر تم سچے ہو حق پر ہو واسع! تو آج سے میری دعائیں بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ اللہ پاک

تمہیں سرخرو فرمائے۔ آمین۔"

وہ ایک گہری آہ بھرتے سیدھی ہوئی، ارادہ اور کوشش سونے کی تھی لیکن یہ بیتی گزری کہانیاں اس کا نیا نیا درد بننے لگتیں۔ انسان جس کے قریب رہتا ہے، اسے دھیرے دھیرے اپنا بھی سمجھنے لگتا ہے۔ کسی کے لیے جذبات معمول کی اپنائیت لیے ہوتے ہیں تو کسی کے لیے بہت خاص۔ وہ بس میں ہمدردی سے پیش آنے والا، اس کی تکلیف پہ بے چینی محسوس کرنے والا آج تک کبھی غلط نہیں لگا تھا۔ اس کی سچی، بے ریا ہنسی بہت اندر سے پھوٹتی اس خوشی کا اظہار کرتی جو وہ نازنین کو سامنے پا کر محسوس کرتا تھا۔ شاید وہ بھی جان گیا تھا جو نازنین کے دل میں اس کے لیے تھا۔

"کوئی اتنا سیانا بھی نہ ہو۔" اس نے گھبرا کر آنچل منہ پہ لیا اور اپنی ہی سوچ پر شرم سے ہنسی آ گئی۔

☆☆☆

"آج تو اتنے کام پڑے ہیں اللہ توبہ، رات جو لائٹ نہیں تھی اتنے گھنٹے۔ کپڑے بھی استری نہیں ہو سکے، اب تو راکٹ کی طرح اسپیڈ پکڑنی ہوگی۔"

پائنتی کی طرف چادریں تہہ کر کے رکھتے پشمینہ کی زبان مسلسل اور لگاتار چل رہی تھی۔ نازنین جو میز سے برتن سمیٹ کر اب نیچے جانے کی نیت رکھتی تھی واپس پلٹی۔

"اتنے ہی کام پڑے ہیں بی بی! تو یہاں کھڑی بستر کیوں سیٹ کر رہی ہو، تمہاری باتوں میں ہو سکتا ہے دوبارہ لائٹ چلی جائے۔"

"ہاں کہنہ، لائٹ کا کچھ بھروسا نہیں۔ لیکن میرا ارادہ تھا۔ آج پہلے کمرا سیٹ کروں گی۔ دیکھو، دو دن سے صفائی نہیں ہوئی۔"

"یہ میں کر لیتی ہوں۔ تم نیچے جاؤ شاباش، ورنہ خالہ سے ڈانٹ کھاؤ گی۔"

"اچھا جاتی ہوں۔ لیکن ہاں وہ۔ تم بھی تو چلو گی نا ہمارے ساتھ؟"

"ہاں، نغمہ باجی کہہ تو رہی تھیں کہ ابھی دن کو جہیز سیٹ کرنے جانا ہے اور شام کو مہندی کا فنکشن ہے۔"

"چلو پھر تم ابھی کا ڈریس اور شام والا دونوں نکال دو۔ میں وہ بھی استری کر دوں۔"

"میں تمہیں دکھاتی ہوں سب کپڑے، تم ہی مشورہ دو کچھ۔"

نازنین نے چارپائی کے نیچے سے اپنا سوٹ کیس نکالا۔ دونوں نے کچھ دیر باہمی صلاح مشورے سے کچھ لباس منتخب کیے اور پشمینہ انہیں لیے نیچے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد نازنین نے پہلے کمرا صاف کیا پھر برآمدے کی صفائی شروع کی۔

واسع ایک لمبی سی جمائی لے کر بالوں کو انگلیوں سے سیٹ کرتے اپنے کمرے سے باہر نکلا تو پہلی نظر ہی نازنین پر پڑی، دوپٹے کو سختی سے ناک منہ پر لپیٹے فرش کی جھاڑو میں لگی تھی۔ اس نے پھر اپنی مسکراہٹ کو روکا، سر کھجا کر کچھ دیر سوچا۔

"پشمینہ؟" آواز کو ذرا اونچا کر کے بڑے ہی عام انداز میں آواز لگائی، گویا پشمینہ سے نہایت ضروری کام پڑ گیا ہو۔

"یہ اچھا بہانا ہے۔ کام وام کچھ ہوتا نہیں پشمینہ سے۔ بس ——" وہ اسے ایک نظر دیکھ کر کچرا سائیڈ پہ جمع کرتے منہ ہی منہ میں بڑبڑائی اور جھاڑو جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب اسے نیچے جانا تھا۔ بنا واسع کی طرف دیکھے صحن میں آ کر چھوٹی دیوار کے ساتھ رکھے ڈسٹ بن میں کچرا ڈالا، جھاڑو دیوار سے ٹکائی اور رخ سیڑھیوں کی طرف کیا۔ واسع اس دوران تھوڑا دیوار کے نزدیک آ گیا تھا۔

"تو کہاں ہے وہ بہانا۔ جس کو میں بلاوجہ آواز دیا کرتا ہوں؟" واسع نے اس کی بڑبڑاہٹ کو یقیناً اچھی طرح سمجھا تھا، اسی لیے نہایت ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے اقرار بھی کر لیا اور اس کا یہی صاف سیدھا انداز، نازنین کو سنجیدہ نہیں رہنے دیتا تھا۔ زبردستی مسکراہٹ روکتے وہ بنا جواب دیے آگے بڑھنے لگی۔

"میری بات بھی نہیں سنی تم نے۔" اب وہ

دھیمے لہجے میں بول رہا تھا۔

"ممکن نہیں ہے۔ وہ اسے روکنے کے لیے یوں تو تفصیلی جواب دینا چاہتی تھی، لیکن اس کے لیے بھی تو رکنا پڑتا اور وہ اتنی گنجائش کے حق میں بھی نہیں تھی۔

"میں سمجھ سکتا ہوں، یہاں کے ماحول میں بہت سی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔" واسع کا لہجہ ایک دم نہایت سنجیدہ ہوا تھا۔ "میں تمہیں راہوں میں روکنا نہیں چاہتا نازنین! نہ ہی خدانخواستہ تمہاری عزت کا دشمن ہوں۔ لیکن اگر میرے کہے پر بھروسا کرسکتی ہو تو اتنا کہوں گا، میری بات واقعی سنجیدہ اور ضروری ہے۔ تم سے پوچھتا ہوں، کیا کوئی طریقہ ایسا ہے کہ ــــ"

"میں بتادوں گی۔" اس نے نظریں جھکائے اسے بغور سنا اور فوراً نیچے اتر گئی۔

☆☆☆

جبار چاچا کا گھر اس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ گھر کیا تھا، پورا بنگلہ تھا۔ بڑے بڑے لانوں والا خوب ماڈرن نقشے پر بنا ڈیڑھ دو کنال کے رقبے پر پھیلا۔

مہمان ابھی زیادہ تو نہیں آئے تھے، مہندی کا فنکشن بھی شام کو ہونا تھا۔ اس وقت صرف قریبی رشتہ دار جمع تھے۔ نگار چاچی کی ایک بہن اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ شاید مستونگ سے آئی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ سب ہی کزنز یہیں کی تھیں۔ نیلم اور شبنم سے بھی نازنین کی پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ زمرد بھی آئی ہوئی تھی۔ جبین باجی سے بھی وہ پہلے مل چکی تھی۔

رباب نے اپنی بڑی باجی نازیہ سے اسے ملوایا۔ نیلم انہیں جہیز کا کمرا دکھانے لے آئی۔ جہیز کیا تھا دنیا جہان کی ہر نعمت سے پُر ایک دنیا تھی۔ ایک کمرے میں تو سمایا ہی نہیں اس لیے دو کمرے سیٹ کرنا پڑ گئے۔ لڑکیاں ہنسی مذاق کے ماحول میں برتنوں، کپڑوں، جیولری اور دیگر سامان کو ترتیب دینے میں لگی تھیں۔ نگار چاچی کو کچن میں کسی کی مدد درکار تھی۔ انہوں نے سامنے کھڑی پشمینہ کو آواز دی تو وہ نازنین کو ساتھ لیے ان کے پیچھے کچن میں آ گئی۔

"مینہ بچے! تم ذرا چائے کا دھیان رکھو، کام والی ساری عورتیں پیچھے صحن میں آگ پر کھانا پکا رہی ہیں۔ مجھے ان کے پاس جانا ہے۔"

"آپ جائیں چاچی۔ میں یہاں سب کو چائے دے دوں گی۔"

"شاباش گلے۔ ادھر الماری میں بسکٹ، نمکو رکھے ہیں، وہ بھی پلیٹوں میں ڈال لینا۔ اور ہاں۔" وہ جاتے جاتے پلٹیں۔ "چائے کے دو تھرموس باہر حجرے میں بھی دینے ہیں۔ وہ الگ سے ڈال لینا۔"

"ٹھیک ہے چاچی۔ ہم کرلیں گے۔" پشمینہ اور نازنین نے ہدایات بغور سنیں اور ان کے جاتے ہی کام کی طرف دھیان دیا۔ ایک بڑا دیگچا چولہے پہ چائے کا چڑھا تھا۔ دونوں نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ٹرے، پیالیاں اور تھرموس نکالے۔ پلیٹوں میں کھانے کا سامان سجایا۔ پشمینہ ایک ٹرے لے کر اندر خواتین میں چلی گئی اور نازنین نے باقی تھرماسوں میں چائے ڈالنا شروع کی۔

"چائے بن گئی؟" پشت پہ ایک اجنبی مردانہ آواز سن کر نازنین کا ہاتھ دیگچی پہ رُکا۔ دل کی دھڑکن بے اختیار تیز ہوئی۔ دوپٹہ وہ پہلے ہی اچھے سے اوڑھے ہوئے تھی۔ پرائے گھر میں یوں بھی ایسی باتوں کا دھیان رکھنا پڑتا ہے کہ کوئی بھی اچانک کہیں سے آسکتا ہے۔

"جی۔" اس نے بنا پلٹے مختصر جواب دیا لیکن کسی مرد کی ایسی غیر متوقع آمد پر وہ واقعی بہت گھبرا گئی تھی۔ ذکاء نجانے ایک اجنبی آواز پر چونکا یا اس لڑکی کے پلٹ کر نہ دیکھنے پر کہ قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔ تھرموس کے ہینڈل پہ رکھا سفید مرمریں ہاتھ بتا رہا تھا کہ کوئی لڑکی ہے۔ اور چہرا دیکھنے کا اشتیاق اسے آگے بڑھنے پہ مجبور کر رہا تھا۔ ادھر نازنین کی اس

ادراک نے مزید حالت غیر کردی کہ آنے والا مزید قریب ہو رہا ہے۔

"سلام لالہ۔" پشمینہ کی آواز پیچھے دروازے سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سی نازنین کے کانوں سے ٹکرائی اور اس نے کب کی رُکی گھٹن بھری سانس نہایت سکون سے باہر نکالی۔

"ہاں۔ وسلام۔ اماں کہاں ہیں؟" وہ کچھ سٹپٹا کر دہیں رُکا تھا۔ پشمینہ کی آمد قطعی غیر متوقع تھی۔ وہ تو بس اس چہرے کو دیکھنے ہی والا تھا۔ ایک چور نگاہ دوبارہ ادھر ڈالی لیکن وہ بھی جیسے قسم کھائے کھڑی تھی رخ زیبا نہ دکھانے کی۔ اور پشمینہ کے آنے پر پہلی بار ذکا کا خیال اس باغ والی کی طرف گیا۔ تو یہ وہی ہے جس کے حسنِ بلاخیز نے دل کو دھیمی آنچ پہ سلگایا تھا۔ آج اسے قریب سے دیکھنے کا یہ موقع پشمینہ کی وجہ سے ضائع جا رہا تھا اور وہ خود۔ وہ بھی ہرگز سامنا کرنے کو تیار نہ تھی تب ہی پشمینہ جب چائے اٹھانے لگی تو اس نے اپنا چہرا بجائے ادھر موڑنے کے دیوار کی جانب کرلیا تھا اور اس حرکت نے ذکا کے شوق کو کچھ اور بھڑکا دیا۔

"آپ شاید چائے لینے آئے تھے۔ یہ لیں۔" پشمینہ نے اس کے ہاتھوں میں دو تھرموس تھما دیے۔

"ہوں۔" اس نے چائے لیتے ایک ٹیڑھی نظر اس جانب ڈالی۔

"تمہیں تو دیکھ کر ہی جاؤں گا، ذکی کو اگر تم جانتی ہوتیں تو یہ کوشش کبھی نہ کرتیں۔"

وہ اپنی شرارتی مسکراہٹ لبوں میں بھینچے کچن سے باہر نکلا اور بجائے سامنے جانے کے بائیں ہاتھ کو مڑ کر کچن کی دیوار کے ساتھ چلتا اُس کھڑکی کے آگے سے گزرا جس کی طرف کچھ دیر پہلے نازنین نے منہ کیا تھا۔ کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ پشمینہ دور پیٹھ موڑے کسی کام میں بزی تھی اور اور نازنین اسی جانب چہرا کیے دوپٹہ درست کر رہی تھی۔ اور وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مخالف سمت کے دروازے سے باہر نکلنے والا لڑکا یوں اچانک سامنے آ کھڑا ہوگا۔ حیرت سے نازنین کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور ذکی جتاتے انداز میں ابرو اٹھا کر مسکراتے ہوئے سامنے سے گزر گیا جیسے کہتا ہو "اور چھپو مجھ سے۔"

نازنین بے یقینی اور افسوس کی کیفیت لیے کھڑی رہ گئی۔ بھلا کسی لڑکی کے لحاظ اور جھجک سے پیٹھ کیے رہنے کو بھی ضد کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے کہ اس طرح جتا کر بے حیائی کی جائے۔ غصے کا اُبال سا سرخی بن کر نازنین کے چہرے پر لہرایا اور وہ فوراً پلٹی۔

"اندر چلیں پشمینہ؟"

"ہاں، بس یہ کھانے کی چیزیں سنبھال رہی تھی۔ چلو۔" وہ بھی ہاتھ جھاڑتے جانے کو تیار ہوئی اور دونوں کمرے میں آ گئیں۔ نغمہ باجی اور شمیم خالہ نے گھر چلنے کا کہا اب ان سب کو تیار ہو کے شام کو یہاں آنا تھا۔

نازنین چادر اوڑھ کر بھاری بوجھل دل لیے وہاں سے روانہ ہوگئی۔ طبیعت ایک دم مکدر ہوگئی۔

☆☆☆

"پارا سفی۔ مین سوئچ آف کردو، لان کی کچھ لائٹس کام نہیں کر رہیں، پہلے ان کو دیکھ لیں۔"

ذکا نے ہاتھ لہرا کر اونچی آواز میں اسفند کو پکارا۔ میوزک کی وجہ سے کچھ بھی سمجھانا محال تھا۔ اسفند نے بھی جواباً ہاتھ لہرا دیا۔ مہندی کا فنکشن شروع ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ ذکا بجائے مردوں میں رہنے کے مسلسل خواتین کی سائیڈ پہ منڈلا رہا تھا۔ ایک تو عادت سے مجبور۔ اوپر سے آج تو اپنے گھر کا فنکشن تھا۔ بہانے بہانے سے تانکا جھانکی جیسے جائز حق تصور ہو رہا تھا۔

لان کا ایک حصہ شامیانے لگا کر عورتوں کے بیٹھنے کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ وہ باہر سے دو تین بجھے بلب دیکھ کر ایک نیا جوازلیے دیوار پہ چڑھ بیٹھا، اسفند البتہ نیچے مین سوئچ بورڈ کے ساتھ باہر کھڑا اس کی ہدایات سن رہا تھا۔ بظاہر بلب کے ہولڈر سے

چھیڑ چھاڑ کرتے بھی دھیان خواتین کی طرف لگا تھا۔ اور اسی کوشش میں ذکا کو پھر نازنین نظر آ گئی۔

وہ قنات سے نکل کر اکیلی اندر برآمدے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ذکا نے بس لمحہ لیا سوچنے میں اور دیوار سے پھلانگ کر اپنے بنگلے کی چھوٹی گلی سے اس کمرے میں پہنچا جس کی طرف نازنین کو بڑھتے دیکھا تھا۔ سفید موتیوں والے آف وائٹ سوبر سے لباس میں دوپٹے کو حجاب کے انداز میں چہرے کے گرد لپیٹے وہ بڑے مگن انداز میں کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے سب ہی لڑکیاں اسی کمرے میں تو بیٹھی تھیں۔ پھر نغمہ باجی نے کال کر کے معیزہ کو لے جانے کو کہا تو وہ بے فکری سے یہیں آ گئی لیکن اب وہاں وہ لڑکا کھڑا تھا جسے کچھ دیر پہلے اس نے دیوار پہ بیٹھے لائٹس ٹھیک کرتے دیکھا تھا۔

اور اب وہ اچھی طرح اس کا چہرا پہچان چکی تھی۔ باغ میں بھی اسی کی نظروں نے پریشان کیا تھا اور کچن کی کھڑکی سے جھانکتی پرشوق نظر بھی یہی تھی جس نے نازنین کا موڈ خراب کیا تھا۔ معلوم نہیں اتنی سی دیر میں بندر کی طرح وہ دیوار سے اچھل کر کمرے میں کیسے آن ٹپکا تھا۔ وہ سخت بیزاری محسوس کرتے فوراً واپس پلٹی

"کچھ کام تھا آپ کو۔ بتائیے میں ہیلپ کر دوں۔" وہ بھی تیزی سے سامنے آ گیا۔ نازنین نے نظر انداز کر کے سائیڈ سے نکلنے کی کوشش کی، ذکاء نے اس کے چہرے پہ پھیلی ناپسندیدگی کو غور سے دیکھا اور اپنا نظر انداز کیا جانا تو اس سے بھی برداشت ہی نہیں ہوتا تھا۔ بے ساختہ ہاتھ چوکھٹ پہ رکھ کر راستہ روکا۔

"دور بھاگ کر مزید اپنی جانب کھینچ رہی ہو۔ خدایا یہ کشش ذکا کو مار نہ ڈالے۔" وہ اپنی چمکتی آنکھیں اس کے چہرے پہ گاڑے عجیب بے ہودہ سا ہو رہا تھا۔ نازنین نے اپنے کانپتے ہاتھ سے خوب زور لگا کر اس کا بازو جھٹکتے راہ بنائی اور تقریباً بھاگ کر اس جگہ سے دور آ گئی۔ مارے خفت اور گھبراہٹ کے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اب وہ کہیں ادھر اُدھر اکیلی نہیں نکلے گی۔

ہمیشہ میں ہی کیوں کسی غلط جگہ میں گھس جاتی ہوں۔ جتنا خود کو ریزرو رکھنے کی کوشش کرتی ہوں، کیوں کچھ نہ کچھ ایسا ہو جاتا ہے۔

آنکھوں کی نمی کو بدقت سب سے چھپاتے بظاہر سب کے بیچ ہوتے وہ خود کو یکا و تنہا کھڑا محسوس کرنے لگی۔ اسے ہر قدم پر اپنا خیال آپ ہی رکھنا تھا۔ وہ سچ مچ اس دیار میں تنہا ہی تھی۔ کسی انہونی کے بعد تو یہ خیال اور بھی شدت سے جاگزیں ہونے لگتا تھا۔

آج اُسے واسع کے حوالے سے بھی اپنے خیالات کی ڈھیل اپنی غلطی تصور ہو رہی تھی۔ اسے صرف ذکا ہی نہیں واسع کے معاملے میں بھی بہت احتیاط سے چلنا تھا۔ وہ بھلا اس کا کیا لگتا تھا کہ رُک کر اس کی بات سنی جائے۔ مرد کے دل میں کیا ہے، ظاہرا سمجھنا بہت مشکل ہے، پھر جسے اس کے سگے باپ سے چوٹ پہنچی ہو، اُسے کم از کم کسی مرد کو سہارے کے طور پر ڈھونڈنے کی قطعی گنجائش نہیں نکلتی۔

"یہیں رُک جاؤ نازنین! کہ تمہارے مستقبل کی ذمہ داری تمہاری بہن نے اپنے کندھوں پر لی ہے۔ تمہارا اچھا برا سوچنا اب وہی جانے۔ مخلص ہمیشہ سیدھی راہ سے چل کر آتا ہے۔ سچے خیر خواہ کو اندھیرا ہونے کا انتظار نہیں ہوتا، اُسے دن کی مکمل کھلی روشنی میں دیکھا جاتا ہے۔"

☆☆☆

آج شبنم کا نکاح اور رخصتی تھی۔ تیاریاں سہ پہر ہوتے ہی شروع ہو گئیں کہ یہاں رخصتی جلدی کر دی جاتی تھی، خصوصاً جب دلہن نے دور جانا ہو تو مغرب سے پہلے پہلے رخصتی کو یقینی بنایا جاتا۔

رباب نے تیاری شروع کرتے ہی نصیر کو میسج کر دیا تھا۔ پچھلی شام وہ بہت خفا ہوا کہ کہاں تو مجھے

شبنم کی شادی میں چھٹی لے کر آنے کے لیے مجبور کر رہی تھیں اور اب پورا فنکشن مہندی کا گزر گیا اور اپنی جھلک تک نہیں دکھائی۔

رباب نے سوچا، آج نکلنے سے پہلے اسے اپنے گھر ہی بلا لے۔ یہاں کے ماحول میں مردانہ زنانہ بالکل الگ رکھا جاتا اور پردے کی پابندی بھی بہت کی جاتی، بلکہ دیگر معاملات کے ساتھ ساتھ یہ دیکھنا بھی نہایت ضروری ہوتا کہ پردے کے معاملے میں کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔

"تم لوگ ابھی تک گھر میں کھڑی ہو، ادھر بارات بھی پہنچ گئی۔"

باری دروازے سے ہی بولتا ہوا اندر آیا۔ رباب کی امیدوں پر مزید اوس پڑ گئی۔ وہ تو سمجھی تھی نصیر آیا ہوگا۔ نازیہ اور جبین باجی پہلے ہی بچوں کو لے کر روانہ ہو گئی تھیں۔ وہ اماں کے ساتھ گھر بند کرنے کے بہانے رُک گئی لیکن بارات کا سن کر تو رکنا اب مشکل لگ رہا تھا۔ اماں نے بھی فوراً برقع اوڑھ لیا تھا۔ ناچار اس نے میسج کر کے نصیر کو گھر آنے سے منع کر دیا۔

☆☆☆

نازنین جس وقت نغمہ باجی اور خالہ شمیم کے ساتھ شادی والے گھر پہنچی، یہاں خوب رونق لگی تھی۔ پشمینہ پچھلی شام سے جبار چاچا کے گھر پر ہی تھی۔ نازنین کو بھی نیلم وغیرہ کی طرف سے اصرار کیا گیا کہ ساری رات یہاں خوب رونق لگی رہے گی اس لیے وہ بھی یہیں رک جائے۔ شبنم باجی کے ہاتھوں پیروں میں مہندی لگائی جانی تھی۔ دیر تک جاگنے کا پروگرام تھا۔ لیکن نازنین اب از حد محتاط ہو گئی تھی۔

ایک ذرا سی دیر کے فنکشن میں جب ذکاء نے موقع نکال لیا تھا تو پوری رات وہ ان کے ہاں رکنے کا رسک کیسے لے سکتی تھی۔ حتیٰ کہ شمیم خالہ اور نغمہ باجی بھی زور دینے لگیں کہ وہ یہاں کی شادیوں کو قریب سے دیکھے اور انجوائے کرے لیکن اس نے سر درد کا بہانہ کر دیا۔ نہ وہ ان لوگوں کی زیادہ قریبی تھی اور نہ ہی ذکا کی مزید کسی بے باکی کا سامنا کرنا چاہتی تھی۔ گھر واپس آتے ہی وہ نیچے کے بیٹھک والے کمرے میں چلی گئی۔ پشمینہ کی غیر موجودگی میں چھت پر اکیلے سونا بھی مناسب نہیں تھا۔ موڈ پہلے ہی انتہا کا مضمحل اور اداس تھا اس نے نغمہ باجی کے کمرے سے تکیہ چادر لی اور بیٹھک میں آ کر سو گئی۔

اور آج چونکہ شبنم کا بیاہ تھا تو اسے بھی باقی سب کی وجہ سے آنا پڑ گیا۔ گھر پہ اکیلے رُک کر وہ بلاوجہ باقیوں کو شک میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی، البتہ دل میں طے کر لیا کہ آج اسے حد سے زیادہ محتاط رہنا ہے۔ فنکشن کا آغاز پانچ بجے ہی ہو گیا۔ کیونکہ رخصتی لامحالہ مغرب سے پہلے پہلے کرنی تھی۔ جس وقت وہ پہنچے، دن کی روشنی ابھی باقی تھی۔ دولہا والے وقت پر پہنچ گئے تھے۔ آج بھی عورتوں کے بیٹھنے کا بندوبست لان میں کیا گیا تھا۔ نازنین مسلسل نغمہ باجی سے ہی چپکی رہی۔ نغمہ باجی اور شمیم خالہ کسی کام سے اندر گئیں تو وہ زمرد اور رباب کے ساتھ آ بیٹھی۔ دلہن کے لیے نشست بھی یہیں لان میں بنائی گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اسے باہر لایا جانا تھا۔ لان میں اونچی آواز میں پشتو میوزک بج رہا تھا اور دولہا کے ہاں کی چھوٹی بچیاں رقص کر رہی تھیں۔

نازنین کی ستائشی نظریں رباب پر جمی تھیں۔ گہری سبز اور آتشی فراک پہنے آج وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ سامنے کے بالوں کی اس نے کئی باریک مینڈھیاں گوندھ کر سیدھی مانگ نکال رکھی تھیں۔ بیچ میں چھوٹی سی چاندی کی بندیا جھول رہی تھی۔ کانوں میں سبز نگینے سے سجے جھمکے۔

"رباب! آج تم بہت پیاری لگ رہی ہو۔"

نازنین نے بہت دیر تک توجہ اور محبت سے دیکھنے کے بعد کھلے دل سے تعریف بھی کر دی اور جواباً رباب کے چہرے پر ایک اداسی بھری ہلکی مسکراہٹ ٹھہر سی گئی۔ محبوب کی نظر تصیب نہ ہو تو خاک ہے یہ ہار سنگھار بھی۔

''ہاں بچی میں بھی یہی کہنے والی تھی۔ زمرد رُخ موڑ کر مکمل ان دونوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''بال خود بنائے ہیں رباب؟''

''نا مڑے مجھ سے کہاں بنتی تھیں۔ نازیہ باجی کی محنت ہے سب۔''

''مجھے بھی ویسے بڑا شوق ہے۔'' زمرد نے اس کی پتلی مینڈھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''چلو کبھی تمہارا شوق بھی پورا کردیں گے۔'' رباب نے مسکرا کر بہت محبت سے اُس لمحے زمرد کو اپنی بھابی اور واسع کی دلہن کی نظر سے دیکھا۔

''تم بھی بہت خوب صورت لگ رہی ہو زمرد، اور تمہاری پسند تو لاجواب ہے، بہت پیارا ڈریس ہے۔'' نازنین نے اس کے چاکلیٹ براؤن نازک کڑھائی والے لباس کو توجہ سے دیکھا۔

''شکریہ، ویسے ڈریس تو نصیر لالہ کی پسند ہے، وہی دُبئی سے لائے تھے۔'' زمرد بھی شرما گئی۔

''ہاں اور نصیر لالہ کی پسند کو تو ہم بھی مانتے ہیں۔''

پشمینہ دور سے ان کی باتیں سنتی ہوئی آرہی تھی، مسکرا کر معنی خیزی سے رباب کو دیکھتے حصہ لیا تو وہ زمرد اور نازنین کی موجودگی کے خیال سے جھینپ گئی۔

''تم دونوں بھی بہت اچھی لگ رہی ہو۔''

زمرد نے حساب برابر کرتے پشمینہ اور نازنین کو دیکھا اور وہ دونوں ہی بیک وقت آداب بجالائیں جس پر چاروں بے ساختہ ایک ساتھ ہنس پڑیں۔ اور ہنستی مسکراتی وہ چاروں شہزادیاں آنے والے وقت سے بے خبر دوستی کے نئے نئے رشتے کو محبت کی مٹھاس سے مزید استوار کرتے آپس کی باتوں میں مشغول ہوگئیں۔ اپنے اپنے مستقبل سے بے خبر۔ کیونکہ اُن چاروں سے جُڑی رشتوں کی کچھ ایسی نازک ڈوریاں بھی تھیں جو اُن سب کو کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے الجھانے کے درپے تھیں، پر جن کا ادراک اس وقت کسی کو نہیں تھا۔

☆☆☆

سہرابندی و نکاح کی رسم بخیر و خوبی انجام پا چکی تھی۔ سیف لالہ، مجیب چاچا اور خلیل پھوپھا مٹھائی تقسیم کروانے میں دولہا والوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ دولہا کے والد اور چچاؤں میں روانگی کی باتیں چل رہی تھیں۔ واسع نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ مغرب کی اذان ہونے میں مشکل سے پندرہ بیس منٹ باقی تھے۔

''لالہ! آپ کو اندر دلہن کی اماں بلا رہی ہیں۔'' ایک بچہ دوڑتا ہوا واسع کے قریب آیا اور اسے بازو سے کھینچنے لگا۔ مردوں کی قنات بنگلے کی داہنی دیوار کے ساتھ ساتھ بنی تھی۔ واسع اس بچے کے ساتھ سائیڈ والے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

''کیا کہہ رہی تھیں دلہن کی اماں؟ واسع کو یقین نہیں تھا کہ اسی کو بلایا گیا ہوگا۔

''وہ کہہ رہی ہیں اور مٹھائی اندر سے لے جائیں۔''

''او۔ صحیح۔'' واسع نے ایک نظر پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ مجیب چاچا اور خلیل پھوپھا کے ہاتھوں میں اب خالی ٹوکرے تھے، تو یعنی واقعی مزید مٹھائی کی ضرورت تھی، اور وہ لوگ رخصتی کی جلدی بھی ڈال رہے تھے۔ واسع نے اپنے قدم تیز کیے تاکہ کوئی مہمان خالی ہاتھ نہ چلا جائے۔

''جاؤ بیٹا! نگار چاچی کو بتاؤ۔'' واسع چھوٹے دروازے کے باہر ہی رُک گیا۔ یہ دروازہ بنگلے کی سائیڈ والی چھوٹی گلی میں کھلتا تھا جس میں داخل ہوتے ہی فوراً سامنے ایک کمرے کا دروازہ تھا۔

''اندر آجائیں۔ یہ سامنے مٹھائی رکھی ہے۔ انہوں نے کہا تھا، یہاں سے لے لیں۔'' بچہ چھوٹی گلی میں کھڑا اشارے سے مٹھائی کا بتا رہا تھا۔ واسع نے بچے کی رہنمائی پر قدم آگے بڑھائے اور کمرے میں داخل ہوگیا۔ مٹھائی کے چند ٹوکرے واقعی سامنے رکھے تھے

''وئی خدایا۔ پردہ۔'' ایک لڑکی زور سے چیخ

مار کر باہر کی جانب لپکی۔ معلوم نہیں کون لڑکی تھی، لیکن اس وقت وہ گلے سے دوپٹہ نکال کر بالوں میں کنگھی کرنے میں مصروف تھی۔ واسع کو دیکھ کر بنا دوپٹے کے چلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ واسع نے پشیمانی سے لب بھینچے اور دل میں ارادہ کیا کہ ایک ٹوکرا اٹھا کر اسی راستے سے واپس پلٹ جائے کہ تب ہی اندر کے دروازے سے ذکی کمرے میں داخل ہوا، اسی دروازے سے ابھی ابھی وہ لڑکی شور مچاتی باہر گئی تھی۔

"تم.....؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ بلا اجازت عورتوں میں کیوں آئے۔" ذکا کا چہرا شدت جذبات سے تپ رہا تھا۔ خالہ زاد ستارہ کے شور مچا کر باہر نکلنے پر وہ جس غصے سے اندر آیا تھا، واسع کو دیکھ کر اُس غصے میں کئی گنا اضافہ ہوا تھا۔

"مجھے چاچی نے۔"

"بکواس مت کرو۔ چوری چھپے پیچھے کے دروازے سے اندر آنے کا کیا مطلب ہے، اماں کدھر سے آگئیں جھوٹے۔"

"آرام سے بات کرو، چلا کیوں رہے ہو۔" واسع کو لفظ جھوٹے پر شدت کی تپ چڑھی۔ اوپر سے جاہلوں کی طرح بے تکان بولے ہی جا رہا تھا

"مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرنا واسع!"

ذکا نے انگلی اٹھا کر متنبہ کیا، غصے سے اس کی آنکھیں لال انگارہ ہونے لگیں۔ اور ٹھیک ہے کہ نگار چاچی کی بھانجیوں سے واسع کا پردہ تھا لیکن ابھی اسے کہاں پتا تھا کہ ان میں سے کوئی یہاں اندر موجود ہے۔ لیکن ذکی تو صفائی کا موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔

ذکی کے طیش میں آنے کی ایک وجہ یہ بھی تو تھی کہ پچھلی شام ٹھیک اسی گلی اور کمرے کے راستے سے وہ بھی چوری چھپے کسی کو دیکھنے یہاں آیا تھا۔ ۔اور انسان کو ساری دنیا اپنے آئینے میں ہی دکھائی دیتی ہے۔ جو اس نے سمجھا، وہ اس کی سمجھ سے زیادہ اس کے عمل کا نتیجہ تھا۔

"میں یہ مٹھائی لے کر جا رہا ہوں، تم اپنی اماں سے بات کرو۔" واسع نے غصے سے کہہ کر ایک ٹوکری اٹھائی اور قدم باہر کی طرف بڑھائے۔

"تم....." ذکی نے غصے سے مٹھیاں بھینچیں۔

"چوری پکڑی گئی تو اب نکلنے کی کوشش کر رہے ہو۔ رُکو۔" وہ تیزی سے واسع کے پیچھے آیا، تب تک وہ کمرے سے نکل کر باہر والے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔

"ایسے تو جانے نہیں دوں گا۔" ذکی نے پیچھے سے اس کا کالر کھینچا۔

واسع کے لیے یہ حرکت قطعی غیر متوقع تھی۔ مٹھائی کے پیک کیے ہوئے ڈبے ٹوکرے میں سے لڑھک کر یہاں وہاں بکھر گئے۔ آس پاس کھڑے کئی مرد ایک ساتھ متوجہ ہوئے، ذکی نے باہر نکلتے واسع کو دوبارہ چھوٹی گلی میں کھینچا اور دھکا دے کر دیوار سے لگایا۔

"کب سے ستارہ پر نظر رکھے ہوئے ہو، میری کزن کے پیچھے پڑنے کی تمہاری ہمت کیسے ہوئی۔"

"دماغ خراب ہے ذکی! کچھ بھی بکے جا رہے ہو۔" واسع کی برداشت بھی جواب دے گئی۔ ہاتھ سے ذکا کو پرے دھکا دیا لیکن وہ جھٹکا کھا کر پیچھے ہٹتے ایک بار پھر واسع پر جھپٹا اور اس مرتبہ ذکی نے واسع کے دونوں شانوں پر زور سے دباؤ ڈال کر اسے دیوار سے لگا دیا۔ اب واسع لگاتار خود کو چھڑانے کے لیے مزاحمت کر رہا تھا اور ذکی اسے اس کوشش سے باز رکھ رہا تھا۔ سیمنٹ کی کھردری، بے رنگ دیوار پر دور تک واسع خود کو چھڑانے کے لئے پیچھے ہوتا گیا اور ذکی اسی طاقت سے اس کی کلائیوں کو دیوار پر لگائے گھسیٹتا چلا گیا۔ واسع کے ہاتھوں کی پشت سیمنٹ سے رگڑ کھا کر پوری چھل چکی تھی۔ درد کی شدت ناقابل برداشت ہوئی تو واسع نے زور سے ذکی کو دھکا دیا اور وہ پوری اونچی آواز سے گالیاں دینے لگا۔ باہر سے اسفند، مجیب چاچا اور کئی دوسرے مرد گلی میں آگئے۔

''شہر کے پڑھے لکھے بے غیرت! آزادی کے چار بول کیا دماغ میں گھس گئے تم نے اپنے گاؤں اپنے خاندان کے رسم ورواج بھی مٹی میں ملا دیے۔ گھر میں بنا آواز دیے گھسنے کی تمہاری جرأت کیسے ہوئی؟'' ذکا نے مجیب چاچا کو دیکھا تو ہمدردی لینے کے لیے زیادہ جوش اور شدت سے شروع ہوگیا۔

''بیاہ شادی کو اپنے غلط عزائم کے لیے استعمال کرتے ہو؟''

''میں کہتا ہوں، چپ ہوجاؤ ذکی؟'' واسع نے غصے سے ذکی کا گریبان پکڑا۔ ہاتھوں کی چھلی جلد سے خون رِسنے لگا تھا۔

مجیب چاچا نے آگے بڑھ کر بمشکل دونوں کو چھڑایا اور تب ہی خلیل پھوپھا اور نصیر بھی اندر آگئے۔

''کیا ہوگیا ہے ذکی! باہر تمہاری بہن کی بارات تیار کھڑی ہے۔ ہوش کرو۔'' خلیل پھوپھا نے دبے دبے سمجھانے کی کوشش کی

''آپس کے جھگڑے بعد میں نمٹا لینا۔ پاگل مت بنو۔''

مجیب چاچا نے نصیر کو اشارہ کیا اور وہ کچھ نہ سمجھتے واسع کی طرف بڑھا۔ شبنم کا سسر بھی دو اور آدمیوں کے ساتھ وہاں آپہنچا تھا۔ گاڑیاں جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ شبنم کو سجی ہوئی کار میں بٹھا دیا گیا تھا۔

گھونگھٹ کے اندر سے اس نے ایک حسرت بھری نگاہ دور لاتعلق کھڑے ذکی پر ڈالی جو اسے رخصت کروانے بھی نہیں آیا تھا۔ آنسو شبنم کی گالوں پر بہتے چلے جارہے تھے۔ ذکا کے لیے ستارہ کا شور مچانا تو اہم تھا اور بہن کی رخصتی؟

وہ روتی آنکھوں کے ساتھ الوداعی نظروں سے اپنے گھر، بابا، بھائی اور تمام اپنوں کو دیکھ رہی تھی۔ گاڑی اپنی رفتار بڑھاتے اس کے سب ہی اپنوں کو اس کی نگاہوں سے دور کرتی جارہی تھی۔ ضبط سے سسکی دباتے اس نے بے اختیار کھڑکی کے شیشے پہ اپنا ہاتھ رکھا جیسے اس پورے منظرنامے کو یہیں روک لینا چاہتی ہو لیکن آگے کو بڑھتا زندگی کا یہ رواں دواں سفر کبھی پیچھے کو نہیں جاتا اور انسان حقیقتاً کئی اپنوں سے دور تو کئی اجنبی چہروں سے قریب اور آشنا ہوتے آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

☆☆☆

''واسع ماما کا جھگڑا ہوگیا ہے۔ ہاتھوں سے بہت سارا خون نکل رہا ہے۔''

جبین کا بیٹا علی بھاگتا ہوا رباب کے پاس آیا تو وہاں موجود سب ہی بری طرح چونک گئیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب شبنم کی رخصتی ہورہی تھی تو پیچھے کے حصے میں مردوں کے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں انہوں نے بھی سنی تھیں لیکن ان میں واسع بھی ہوسکتا ہے، ایسا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ رباب نے گھبرا کر اپنی اماں کو ڈھونڈا اور جبین باجی اور نازیہ باجی بھی پردے برقعے سنبھال کر بنا سوچے تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھ گئیں۔ نازنین اور نغمہ نے بھی پریشان نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سب کچھ کیسی خوش اسلوبی سے نمٹا تھا پھر اچانک ایسی بدمزگی کی اطلاع۔

اِدھر شبنم کے رخصت ہوتے ہی نگار چاچی کی طبیعت بھی کچھ بگڑ گئی تھی۔ نغمہ، شمیم خالہ سے بات کرنے گئی تو انہوں نے بتایا کہ وہ اور پشمینہ آج بھابی کے پاس ہی رہیں گی۔

نغمہ نے واپس آکر نازنین سے گھر چلنے کا کہا۔ جمیلہ چاچی اور رباب وغیرہ گھبرائے چہرے لیے کچھ دیر پہلے ہی روانہ ہوچکی تھیں۔ واسع کا سن کر نازنین کے دل کی حالت بھی عجیب سی ہورہی تھی۔ اللہ جانے ایسا یہاں کیا ہوا تھا۔ اس نے بمشکل اپنی کیفیت باجی سے چھپائی اور دونوں جبار چاچا کے گھر سے باہر نکلیں۔ جبار چاچا اسی وقت ذکاء کو ساتھ لیے اسی طرف آتے دکھائی دیے۔ نازنین چونکہ مکمل پردے میں تھی۔ اس لیے پہچان میں آنا مشکل تھا۔ جبار چاچا بھی کسی بات پر ذکا کو ڈانٹتے ہوئے آرہے تھے۔ ذکا

کا دھیان مکمل اسی جانب تھا۔

"گھر میں بارات جانے کو تیار کھڑی ہے اور تم بھائی کے گریبان میں ہاتھ ڈال رہے ہو، دماغ خراب ہو گیا تھا۔"

"بھابی مت کہیں اس بے غیرت کو میرا۔" ذکی بلا لحاظ بول پڑا۔ "آپ حالت دیکھتے ستارہ بے چاری کی، کھلے بال، چہرے پہ ہوائیاں اڑتی ہوئی، بنا دوپٹے کے۔ اس واسع کا تو میں وہیں خون کر دیتا۔"

"وہ ہم بعد میں پوچھ لیتے، تم کم از کم بہن کی رخصتی تک تو چپ رہتے۔" وہ اس کا کوئی جواز قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ اسی غصہ بھرے لہجے میں سرزنش کرتے اندر لے گئے۔ آوازیں چونکہ دور ہو رہی تھیں۔ اس لیے کچھ بھی سمجھنا مشکل تھا۔

نازنین کے ذہن میں البتہ ذکا کا جملہ گردش کرتا رہا۔ معلوم نہیں واسع سے کیا خطا سرزد ہوئی تھی۔ کچھ بھی ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔

☆☆☆

"بس یارا۔ ذکی کی تو عادت ہے۔ تم کیوں اتنا غصہ کھا گئے۔ اندر چلو۔" نصیر راستے بھر واسع کو سمجھاتا ہوا آیا تھا لیکن واسع کی آگے سے ایک ہی چپ تھی۔ ذکا کی حرکت نے اُسے بھری برادری میں بلاوجہ شرمندہ کر دیا تھا۔ حق سچ پر ہوتے ہوئے بھی جب آپ کو غلط سمجھ لیا جائے تب تکلیف کا احساس بھی کچھ الگ ہی ہوتا ہے۔ دنیا آپ کو شک کی نظر سے دیکھ رہی ہو تب نہ صفائی دینا آپ کے حق میں جاتا ہے نہ خاموشی۔ کچھ بھی بولنا مقابل کو سوائے لفظوں کے ہیر پھیر کے اور کچھ نہیں لگتا۔

گھر آ کر وہ سیدھا اپنے پیچھے والے کمرے میں چلا گیا۔ انداز کچھ ایسا تھا جیسے نہ چاہتا ہو کہ نصیر بھی اس کے پیچھے آئے۔ وہ بھی ایک گہرا سانس بھر کر وہیں برآمدے کی کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں جمیلہ بھی بیٹیوں سمیت گھر پہنچ گئیں۔ سب ہی اس وقت یہی جان لینا چاہتے تھے کہ دراصل ہوا کیا۔

"سچ مامی۔ مجھے بالکل نہیں پتا کہ کیا ہوا تھا۔ میں تو جس وقت وہاں پہنچا، مجیب ماما اس کا گریبان چھڑوا کر باہر لانے کی کوشش کر رہے تھے۔"

"بچے بتا رہے تھے اس کے ہاتھ زخمی ہوئے ہیں؟" جبین اور نازیہ کی پریشان نظریں بھی نصیر پر جمی تھیں۔

"ہاں اس کے ہاتھ بری طرح چھل گئے ہیں۔ میں تو اسے ڈسپنسری لے جا رہا تھا لیکن وہ کچھ ماننے کو تیار ہی نہیں ہوا۔"

"تو کچھ لگانا چاہیے اس کے ہاتھ پر۔" جمیلہ پریشانی سے کچن کی طرف بڑھیں۔

"تیل اور روئی دے دو اماں۔ میں لے جاتی ہوں۔" نازیہ بھی ماں کے پیچھے لپکی۔

نصیر لب بھینچے کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ ذہن کے پردے پر وہاں شادی میں موجود لوگوں کی نظریں اور ذکا کے کچھ جملے گردش کرنے لگے۔ واسع یقیناً اپنے کردار پر بات ہونے سے اپ سیٹ ہوا تھا اور بات بھی ٹھیک تھی، بھلا بھری محفل میں خود پر انگلی اُٹھایا جانا کس سے برداشت ہوتا ہے۔ کسی کا غلط یا ٹھیک ہونا ایک الگ معاملہ ہے، پر آج جو ہوا، اس میں ذکا کا بغض و عناد صاف ظاہر تھا اگر واسع سے کوئی خطا ہو بھی گئی تھی تو موقع کی نزاکت کو دیکھتے وقتی طور پر برداشت سے کام لیا جا سکتا تھا جبکہ ذکا کے تیور سراسر تماشا کھڑا کرنے والے لگ رہے تھے۔ نصیر بنا بات جانے بھی واسع کے ساتھ تھا

"پانی۔" چوڑیاں کھنکاتا ہاتھ عین نظروں کے سامنے آیا۔ نصیر تب سے کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے دونوں ہاتھوں کو آپس میں باندھے اسی ایک مدعے میں گم تھا۔ رباب کی آواز پر سر اوپر اُٹھایا۔ سبز فراک کے ساتھ آتشی گلابی دوپٹہ اوڑھے اور شوخ سا میک اپ کیے آج تو وہ سچ مچ ایک پہاڑن لگ رہی تھی۔ بالوں کی دائیں بائیں کی مینڈھیاں اب بے ترتیبی سے کنپٹیوں پر جھول رہی تھیں۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ بھی اُسے تکتا چلا گیا۔ یہ اور بات کہ گزرے

وقت کے بوجھل خیالات تب بھی دل و دماغ پر حاوی تھے۔ اُس نے گلاس لے کر نظر ہٹالی۔

"واسع نے ہاتھ پر دوا لگوائی؟" دو گھونٹ پی کر گلاس لوٹاتے اس نے سوال کیا۔

"نازیہ باجی لے گئی ہیں۔ لیکن دروازہ شاید ابھی نہیں کھلا۔"

"میں اس کے باہر آنے تک یہیں ہوں۔ بتانا پھر۔"

"تم خود کوشش کرو نا۔ کسی طرح وہ باہر آئے۔" رباب نے نصیر کے سنجیدہ تاثرات کو غور سے دیکھا۔

"اس کا غصہ ٹھنڈا ہونے دو، خود ہی دروازہ کھول دے گا۔"

"واسع..... واسع..... بات تو سنو۔" نازیہ کی اونچی آواز کوریڈور سے آئی تو دونوں چونک کر ادھر دیکھنے لگے۔ کوریڈور سے نکل کر واسع اس کھلے برآمدے میں آیا اور پھر بائیں ہاتھ کو مڑتے چھت کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

"کیا ہوا باجی؟" رباب نے پیچھے آتی نازیہ کو روکا۔

"ہاتھ اتنے زخمی ہیں اور دیکھو نا، کچھ بھی لگوا نہیں رہا۔" وہ بولائی بولائی سی خود بھی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

"لالہ اتنے غصے میں کیوں ہیں نصیر۔ کچھ کرو نا تم"

"کہا نا ٹھیک ہو جائے گا۔ تھوڑا وقت دو۔"

"میں جاؤں اس کے پاس؟"

"اجازت مانگ رہی ہو تو میں کہوں گا، نہیں۔" وہ رباب کے پریشان چہرے کو ہی دیکھ رہا تھا۔ آخر میں ہلکا سا مسکرایا۔

"جاؤ، دو کپ قہوے کے بناؤ۔ میں اور واسع چھت پر ہیں گے۔"

"ہوں۔" وہ سر ہلا کر مڑ گئی۔

☆☆☆

"آپ سونے جا رہی ہیں باجی؟"

"سیف اللہ کے آنے تک تو جاگوں گی، ابھی تو ان دو کو سلانے جا رہی ہوں، دماغ چاٹ رکھا ہے میرا۔" نغمہ نے معیزہ کو بازو سے پکڑ کر قریب کھینچا۔

"وہ میں چھت سے اپنی کتابیں لے آؤں؟ پچھلے دو دن شادی کی وجہ سے بالکل پڑھائی نہیں کی، ابھی سوچ رہی ہوں، نیند آنے تک یہیں بیٹھک میں پڑھتی رہوں گی۔"

"ہاں ہاں پوچھنے کی کیا ضرورت، جاؤ لے آؤ۔ بلکہ میں تو کہوں گی جب تک پڑھائی کرنی ہے چھت پر ہی بیٹھی رہو، یہاں تو یہ دو تانیاں تمہارا ابھی ناک میں دم کر دیں گی۔"

"اچھا؟" اس نے رُک کر کچھ دیر سوچا۔ "نہیں، بس کتابیں لے آتی ہوں۔ پسینہ کے بغیر اوپر اچھا نہیں لگے گا۔"

وہ حتمی فیصلہ کرتے اوپر کی طرف بڑھ گئی اور نغمہ بچیوں کو لے کر کمرے میں چلی گئی۔ اوپر کی آخری سیڑھی پر چڑھ کر وہ کمرے کی طرف بڑھی۔ کھلی چھت چاند کی مکمل روشنی میں چاندنی جیسی چمک رہی تھی۔ نازنین نے باہر کی لائٹس آن کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے اندر آ کر کمرے کا بلب جلایا اور میز پہ رکھی کتابوں کی جانب بڑھی۔

"جا رہی ہوں میں۔ اب خود ہی لگا لینا۔"

باہر کافی قریب سے ایک نسوانی آواز سنائی دی تو نازنین نے کام روک کر سر گھمایا۔ دو کتابیں وہ ہاتھ میں لے چکی تھی، ان ہی کو اٹھائے جس سے باہر نکلی تو دور رباب وغیرہ کی سیڑھیوں سے تک تک ہیل کی آواز نیچے کو جاتی محسوس ہوئی۔۔ اور دونوں چھتوں کی درمیانی چھوٹی دیوار پر کچھ برتن رکھے دکھائی دیے۔

نازنین کو یاد آیا کہ جب وہ اوپر آئی تب تو یہ ٹرے یہاں نہیں تھی۔ وہ کمرے کی لائٹ آف کر کے باہر آ چکی تھی۔ اب چلتے ہوئے جونہی چھوٹی دیوار کے نزدیک پہنچی تو اسی وقت واسع بھی عین سامنے آ کھڑا ہوا۔ یعنی جس وقت وہ اپنے کمرے سے باہر

نکلی تھی، ادھر سے واسع بھی کمرے سے باہر آیا تھا۔ نازنین کی نظر ٹرے پر تھی جس میں تیل کی شیشی، روئی اور ایک ٹیوب رکھی تھی۔

وہ اب واسع سے بنا نظر ملائے ہی سائیڈ سے نکلنا چاہتی تھی، اس نے خود سے طے کیا تھا کہ اپنی چھت پر تو وہ نظر آتا ہی رہا کرے گا اس لیے وہ اس بات کو نہایت عام انداز میں لیا کرے گی۔ لیکن اس کی نظر واسع کے ہاتھوں پر بالکل بے ساختہ پڑی تھی۔ کچھ دیر پہلے کی آواز یقیناً اس کی بہنوں میں سے کسی کی تھی اور جملے کا مفہوم بھی ٹرے دیکھ کر اب سمجھ میں آرہا تھا۔ واسع کے ہاتھوں کی پشت پر خون جیسے جم سا چکا تھا۔ نازنین نے بے ساختہ نظر اٹھا کر واسع کی طرف دیکھا لیکن وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ نازیہ کے خفا ہو کر جانے پہ وہ مجبوراً باہر نکلا تھا اور دیوار پہ رکھی ٹرے دیکھ کر سوچا کہ اٹھا کر نیچے چلا جائے۔

''کک..... کیا ہوا ہے؟'' آواز بمشکل نازنین کے حلق سے نکلی لیکن پوچھنا اخلاقی فرض تصور ہوا، پھر وہ اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔

''یہ ٹیوب لگا لیں۔'' واسع کا ہاتھ تیل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ نازنین نے بے ساختہ ٹوک دیا۔ جیسی اس کے زخموں کی حالت تھی، ایسے تو فوری طور پر کسی ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت تھی۔ عام سا تیل بھلا کیا کر پاتا۔ واسع نے بھی خاموشی سے ٹیوب اٹھالی۔

''میں کچھ مدد کروں؟'' وہ اپنی نرم دلی کے ہاتھوں مجبور تھی۔

''مجھے غلط مت سمجھنا نازنین!'' واسع کا جملہ گہری چپ میں ایک ہی وار کی کاٹ جیسا تھا۔ نازنین نے حیرت سے سر اٹھایا۔

''مجھے کچھ نہیں معلوم۔''

''صبح سارے گاؤں کو معلوم ہو جائے گا۔'' وہ ایک دم سنجیدہ تھا، برف سا منجمد۔

''اگر آپ صحیح ہیں تو کسی کی پرواہ مت کریں، ایک بس اللہ پہ توکل کافی ہے۔''

''میری خاموشی کو میرا جرم سمجھا جائے گا۔''

''پھر بھی کسی کو صفائی مت دیں۔''

''اور تم؟''

''جی؟''

''تم بھی مانو گی نا مجھے درست؟'' وہ جیسے بے یقین تھا۔

''مجھے چھوڑیں، میں بھی دنیا میں آجاتی ہوں۔ انسان صرف اپنے رب کے سامنے سرخرو ہو۔''

''یاد ہے، میں نے وہ ضروری بات کرنی تھی۔'' واسع نے اس کی بات کاٹی۔ وہ اب بھی بنا اس کی جانب دیکھے آپ اپنے ہاتھوں پہ مرہم لگا رہا تھا۔

''ہوں۔'' نازنین نے سر جھکایا۔ واسع کی سنجیدگی اس لمحے اپنی منوانے کی اجازت نہ دے رہی تھی۔

''میں تمہیں ''دنیا'' نہیں سمجھنا چاہتا۔ اپنی دنیا بنانا چاہتا ہوں۔ راہ چلتے اظہار کر دینا آسان ہے نازنین! اسٹینڈ لے کر جیتنا بہت مشکل۔ پہلے ہی مرحلے پر تمہاری رضامندی جان کر حقیقتاً آگے قدم بڑھانا چاہتا ہوں۔ تمہاری سوچ میرے متعلق ویسی نہیں جیسا میں سوچ رہا ہوں تو میں اپنے قدم پیچھے ہٹالوں گا۔ پھر تم خود دیکھ لوگی کہ عبدالواسع تمہیں جانتا بھی نہیں۔ لیکن اگر تمہیں کوئی اعتراض نہیں تو مجھے اگلے مرحلے میں نغمہ بھابی سے بات کرنی ہے۔ تمہاری ذمہ داری اس کے شانوں پر ہے، اس کے ذہن میں تمہارے حوالے سے پہلے امیدوار کے طور پر میرا نام ہونا چاہیے۔ بس یہی ہے میری ضروری بات، اور تمہارا جواب میرے پاس تمہاری امانت اور میری زندگی کا سب سے قیمتی راز ہوگا۔ اب۔ چاہے وہ جیسا بھی ہو۔''

آخر میں وہ اٹک سا گیا اور اس گھبراہٹ نے نازنین کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلا دی۔

''مذاق اڑا رہی ہو۔'' واسع نے لحظہ بھر کو

آنکھیں اُٹھائیں، لہجہ سنجیدہ بلکہ قدرے ناراض سا لگا۔

"نہیں۔" مسکراہٹ سمٹ گئی اور نازنین کا چہرا حیا کے بار سے جھک گیا۔ "اجازت طلب کر کے مان بڑھانے والا انداز کا حق دار نہیں ہوتا۔"

قہوہ کے دو کپ ہاتھوں میں لیے آخری سیڑھی پر آ کر چھت کی طرف رُخ موڑتا نصیر نسوانی آواز سن کر وہیں رُکا۔ جس جگہ وہ موجود تھا وہاں اندھیرا تھا۔ سیمنٹ کی سیڑھیوں والی اس بند جگہ سے اگر وہ ایک قدم بھی آگے نکلتا تو کھلی چھت پر آ جاتا اور تب اسے دیکھنا آسان تھا۔ اس نے وہیں رک کر ایک نظر سامنے دیکھا۔ واسع کی اس کی طرف پشت تھی اور چھوٹی دیوار کے پار آ کا جی کی چھت پہ کھڑی کسی لڑکی کا آنچل دکھائی دے رہا تھا۔ لڑکی اس وقت واسع کے عین سامنے کھڑی تھی اس لیے دیکھنا مشکل تھا۔ پہلا خیال البتہ پشمینہ کا آیا۔ نصیر کے لیے سچویشن کچھ کنفیوز کرنے والی ہوگئی کہ آگے بڑھے یا پلٹ جائے۔

"اور تمہارا جواب نازنین؟" واسع کی آواز دھیمی تھی لیکن چھت کی خاموشی میں بہت صاف صاف نصیر کے کانوں میں پڑی، پیالیاں نصیر کے ہاتھ میں کانپ کہ رہ گئیں۔

"میرے امتحان ہونے تک کسی سے کچھ نہ کہیں۔"

نازنین نے بڑی مشکل سے جملہ منتخب کیا، واسع کے مقابل ٹھہرنے کی اب ہمت نہیں تھی۔ وہ نظریں جھکائے فوراً ہی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی اور چاند کی چاندنی میں نصیر نے اس نئی مہمان کا نہ صرف چہرا پوری کھلی آنکھوں سے دیکھا بلکہ اس جملے کو بھی اچھی طرح سمجھا۔

نازنین اپنی سیڑھیوں کے راستے، عجیب بے یقینی و سرخوشی کی کیفیت میں اترتی نیچے کے کمرے کی طرف بڑھی تھی تو ادھر سے آندھیوں، طوفانوں سے ٹکراتا نہیں نہیں کا شور لیے نصیر اُس گھر کی سیڑھیاں اترتا نیچے آیا جس کے آخری کنارے پر رباب حیرت بھرے تاثرات لیے نصیر کو دیکھ رہی تھی۔ ابھی ابھی تو وہ اوپر گیا تھا پھر بنا واسع کو ساتھ لیے۔

"کیا ہوا۔ اور لالہ؟"

"ایک ضروری کال آ گئی ہے، رُک نہیں سکتا۔" اس نے بہ عجلت دونوں پیالیاں رباب کو تھما کر تیز قدموں سے باہر کی راہ لی، دماغ کی کوئی نس جیسے شدت سے کھنچ گئی تھی۔ سکون میں رخنے اندازیاں تو شاید روزِ اول سے اس محبت کا نصیب تھیں پر آج جو دیکھا، وہ کسی سیلابی ریلے سا شگاف بناتا گزرا تھا۔ رباب منہ کھولے بس اس کی پشت کو دیکھ کر رہ گئی۔

☆☆☆

بنا کسی طے شدہ پروگرام اور منصوبہ بندی کے واسع اگلی صبح ہی کوئٹہ روانہ ہوگیا۔ حالانکہ ابھی اس کے امتحان شروع ہونے میں پورا ایک ہفتہ پڑا تھا اور وہ تو آیا ہی گھر تیاری کرنے تھا۔ ادھر آج یہاں شبنم کے ولیمے کی تقریب میں شرکت کی غرض سے خاندان کے کافی لوگ شیلا باغ روانہ ہو رہے تھے۔ لیکن نہ تو اس کا ولیمے میں شریک ہونے کا کوئی ارادہ تھا نہ مزید یہاں رُکنے کا۔ اس لیے یہ کہہ کر کہ اب وہ اپنے امتحانوں سے فارغ ہو کر ہی واپس یہاں آئے گا سب کو حیران کر گیا۔ جمیلہ نے پریشان نظروں سے بیٹیوں کی طرف دیکھا۔

"ہر گھر سے دو تین افراد شریک ہو رہے ہیں اماں، کوئی بات نہیں۔" جبین نے ماں کے ہاتھ پر تسلی آمیز تھپکی دی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی پشمینہ ان سے یہی کہنے آئی تھی کہ اُن کے ہاں سے آج صرف سیف لالہ اور اماں جا رہے ہیں، اور ان کی گاڑی میں جگہ بھی ہے اس لیے اگر کوئی آنا چاہے تو بتا دے۔

"آپ اور نازیہ باجی چلی جائیں، میں گھر پر رکتی ہوں، احمد کی ولیمے بھی طبیعت ذرا اچھی نہیں۔ بلکہ رباب کو بھی لے جائیں۔" جبین نے مشورہ دیا۔

"نہیں۔ میرا دل نہیں ہے۔" رباب نے

چونک کے فوراً سر اٹھایا۔ ابھی کچھ سیکنڈز پہلے نصیر نے بتایا تھا کہ وہ واپس ژوب روانہ ہو گیا ہے۔ رباب تو ابھی اُن دو سطری ٹھنڈی ٹھار لائنوں سے ہی باہر نہیں آئی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ نصیر نے یہی بتایا تھا کہ ولیمے کے دن تک اس کی چھٹی ہے لیکن اب وہ میسج کر کے بتا رہا تھا۔ ''ژوب جا رہا ہوں، چھٹی نہیں ملی۔'' نہ کوئی تسلی نہ معذرت۔ ایک بس اطلاع اور وہ بھی رباب نے خود رابطہ کر کے جب پوچھا کہ اُن لوگوں نے کب نکلنا ہے تب بتایا۔

''کیوں تمہیں کیا ہوا؟''

''بس سفر کا موڈ نہیں ہے۔''

''اچھا پھر بتا آؤ چاچی شمیم کو کہ اماں اور نازیہ باجی آئیں گی۔'' جبین نے اسے دوڑایا اور وہ بجھا دل لیے ساتھ والے گھر چل پڑی۔

☆☆☆

''ذکی! بات سنو۔'' ذکاء اللہ تیار مکمل کر کے کلائی پر گھڑی باندھتے کمرے سے باہر نکلا تو یک لخت ستارہ سامنے آ گئی۔

''ہوں۔ کہو؟'' اس نے ایک نظر ستارہ کو دیکھتے گھڑی میں ٹائم دیکھا۔ دن کے گیارہ بج گئے تھے اور بابا نے نکلنے کا یہی ٹائم بتایا تھا۔

''وہ..... پچھلی شام جو کچھ بھی ہوا، اُس میں واسع کا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں تو بال کھول کر کنگھی کر رہی تھی، تم میرے چلا کر باہر نکلنے سے پتا نہیں کیا سمجھے، میں تو بس ایک مرد کے اچانک اندر داخل ہونے سے گھبرا گئی تھی۔ وہ بے چارا واقعی نگار خالہ کے کہنے پر مٹھائی لینے۔''

''کوئی بات نہیں۔ تم نے بھی ٹھیک ہی کیا۔'' ذکی نے لاپروائی سے ہلکا سا مسکراتے بات کو ہوا میں اُڑایا اور سائیڈ سے نکل گیا۔

ستارہ نے حیرت سے اس کی پشت کو دیکھا۔ ذکا کے ایسے رویے کی تو وہ ہرگز توقع کر کے نہیں آئی تھی۔ بات بھی ڈرتے ڈرتے اس لیے شروع کی کہ اس کا خیال تھا، حقیقت جان کر ذکی ابی پہ اُلٹ پڑے گا کہ پہلے کیوں نہیں بتایا اور بلاوجہ اس کی وجہ سے گھر میں اتنا جھگڑا ہو گیا وغیرہ۔ لیکن وہ تو ہنس کر یوں چلا گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یا شاید جو ہوا اچھا ہوا۔

''حیران مت ہو ستارہ بی بی! یہ ذکاء اللہ ہے۔ غلطی کر کے پچھتاتا نہیں ہے۔ بلکہ میں اور تم جسے ''غلطی'' سمجھ رہے ہیں۔ میرے بھائی کی کوئی پلاننگ ہو گی۔'' نیلم نے تاسف سے ذکی کی پشت دیکھتے ستارہ کو آگاہ کیا، جو نیلم کی آواز سن کر چونک کے پلٹی تھی۔ وہ سنجیدہ چہرا لیے دونوں ہاتھ سامنے باندھے اس کے پیچھے کھڑی تھی۔

''میں واقعی حیران ہوئی ہوں ذکی کے رویے پر۔'' ستارہ کے چہرے پر بے یقینی اور افسوس تھا۔

''حیران ہونا بھی ہماری بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں چہرے کچھ اور کہتے ہیں، دلوں میں کچھ اور ہوتا ہے۔''

''واسع کو میری وجہ سے بلاوجہ شرمندگی اُٹھانا پڑی۔'' ستارہ نے پشیمانی سے لب بھینچے۔

''واسع بہت اچھا ہے۔ مجھے ڈر ہے اس کی اچھائی اُسے لے نہ ڈوبے۔'' نیلم کا دھیان کہیں اور تھا۔

''کیا مطلب؟'' ستارہ نے اس کی پرسوچ نگاہوں کو غور سے دیکھا۔

''کچھ نہیں۔'' نیلم نے ایک زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے جیسے خود کو تفصیل میں جانے سے روکا اور ستارہ کو حیران چھوڑ کر اندر بڑھ گئی۔

اور ستارہ نے وہیں کھڑے کھڑے دل میں مصمم ارادہ باندھا کہ اب تو وہ جتنا زیادہ ہو سکے ہر کسی کو پچھلی شام کے واقعے کی حقیقت اپنی زبان سے ضرور بتائے گی۔ واسع کی سبکی کا اثر اگر مکمل نہیں تو بہت حد تک یقیناً دوسروں کے دل سے صاف کیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

"ارے اب تم کیا میرا منہ دیکھ رہی ہو۔ تیار ہو جلدی سے۔"

گلشن نے ست کھڑی زمرد کو دھکا دے کر اپنی کوفت نکالی۔ کتنا اچھا موقع تھا آج جبار لالہ کے ساتھ ان ہی کی گاڑیوں میں ایک ساتھ شیلا باغ جانے کا۔ کیسا خوبصورت تصور باندھا تھا کہ ذکی کی کار میں وہ نصیر اور زمرد کے ساتھ بیٹھ جائیں گی۔ نیلم کو بھی اپنے پاس بٹھائیں گی اور یوں سارا راستہ ان چاروں کی خوش گپیوں میں کٹ جائے گا۔ ہلکی خوشی کے ماحول میں وہ سب کیسے ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے لیکن یہ نصیر۔ اس نے صبح سویرے ژوب واپسی کی خبر سنا کر ماں کو ہکا بکا کر دیا تھا۔

"آج تو ولیمہ ہے شبنم کا۔ فنکشن چھوڑ کر کہاں جاتے ہو۔" وہ بوکھلا کر نصیر کے پیچھے دوڑی تھیں۔

"ارے تو دولہا والوں کا فنکشن ہے نا۔ ہمیں کیا لینا۔ یوں بھی ہر گھر سے ایک، دو ہی لوگ شامل ہو رہے ہیں۔ آپ جائیں۔ آپ کو تو منع نہیں کر رہا۔"

وہ اپنے چھوٹے بیگ میں جلدی جلدی کپڑے ڈالتے سخت خراب موڈ کے ساتھ بنا ناشتہ کیے روانہ بھی ہو گیا۔ گلشن کے حسین تصورات چکنا چور ہوئے تو اب وہ ایک ایک پر غصہ نکال رہی تھیں۔

"اماں! صرف آپ چلی جاتیں تو۔" زمرد دھیرے سے منمنائی لیکن گلشن تلملا کر پلٹیں۔

"اب تم نہ میرا دماغ خراب کرو۔ سیدھی طرح تیار ہو کر آؤ اور دیکھو، ادھر اُدھر دوڑیں لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں ذکی دکھائی دے، بس اسی کی کار میں بیٹھنا ہے۔"

"لیکن....."

"اور جگہ بھی ایسی جہاں سے وہ شیشہ سامنے فٹ ہوتا ہے۔"

"اُف۔" زمرد جھرجھری لے کر اندر بھاگی۔ اماں نے پتا نہیں کون سی گھسی پٹی فلم دیکھ لی تھی۔ یعنی بیک ویو مرر میں اس کی آنکھوں کو غضب ڈھانے پر اُکسایا جا رہا ہے۔ لاحول ولا۔

"اور سنو۔" اپنا وہ نیلا کناری والا سوٹ پہننا۔

"جلدی آؤ کنہ۔" وہ جلدی جلدی ہدایات دیتی خود بھی تیار ہونے لگیں۔ نصیر چلا گیا تو کیا ہوا۔ ذکی اور زمرد کی انڈر اسٹینڈنگ کا ماحول تو بنایا ہی جا سکتا ہے۔

زمرد تیار ہو کر باہر نکلی تو اماں باتھ روم میں تھیں۔ وہ چھوٹا آئینہ ہاتھ میں لئے اپنا ناقدانہ جائزہ لے رہی تھی جب گھر کے دروازے سے اسفند اندر آتا دکھائی دیا اور اسے اتنے غیر متوقع سامنے پا کر زمرد بری طرح گڑبڑائی

"باقی سب؟" اسفند نے اپنی شرارتی مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر چوکنا نظریں آس پاس ڈالیں۔ ذکا نے اپنے گھر کے باہر روانگی کا شور ڈالا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شبنم کے میکے سے سب ہی مہمان ایک ساتھ ہی اس کی سسرال پہنچیں اور اسی لیے سب ہی گاڑیوں نے ایک ساتھ روانہ ہونا تھا اور اب مطلوبہ بندے یہاں وہاں بندے دوڑا کر بلوائے جا رہے تھے۔ اسفند موقع غنیمت جانتے گلشن پھوپھی کو بلانے کی ذمہ داری خود پر لیتے اکیلا ہی ادھر نکل آیا

"لالہ ژوب چلے گئے اور اماں تیار ہو رہی ہیں۔" وہ اس کی تعریفی نظروں سے نروس ہو رہی تھی۔

"تم تو تیار لگ رہی ہو۔ چلیں پھر؟" وہ آہستہ آواز میں صاف تنگ کر رہا تھا۔ زمرد جھینپ کر مڑ گئی اور گلشن پھوپھو بھی تیار ہو کر باہر نکل آئیں۔

"سلام پھوپھو۔ وہ ذکا، لالہ آپ سب کا ویٹ کر رہے ہیں۔" اسفند نے ایک دم چہرا سپاٹ کیا۔

"سب کہاں مڑے۔ یہی میں اور زمرد ہیں۔ چلو ساتھ ہی نکلتے ہیں۔" زمرد اندر سے چادر اوڑھ کر ماں کا برقع لیے باہر آئی تو تینوں ایک ساتھ روانہ ہوئے۔

"ذکا کی جیپ میں کوئی بیٹھا تو نہیں؟" گلشن

پھوپھی کے قدموں میں اب عجلت دکھائی دیتی تھی جیسے جگہ چھن جانے کا خیال ستا رہا ہو۔

''معلوم نہیں پھوپھو، ویسے ہماری گاڑی میں بھی جگہ خالی ہے آپ۔''

''نہیں نہیں، تمہیں ذکا کے ساتھ بیٹھنا ہے۔'' گلشن پھوپھی نے نخوت سے ہاتھ نفی میں ہلایا تو اسفند نے اچنبھے سے بے ساختہ ساتھ چلتی زمرد کو دیکھا اور اسفند کی آنکھوں کے سوال نے بلاوجہ اس بے چاری کو گڑبڑا دیا۔

''ہم سب ایک ساتھ ہی نکل رہے ہیں پھوپھو! وہاں جگہ نہ بنے تو آپ ہمارے ساتھ آسکتی ہیں۔'' اسفند کو لگا شاید وہ بات نہیں سمجھیں۔

''اچھا۔ اچھا۔ جگہ نہ ہو تو مجھے اپنے ساتھ بٹھا لینا۔ لیکن زمرد اُدھر ہی بیٹھے گی۔''

''جی؟'' اسفند کا رنگ پھیکا پڑا۔ فوری طور پر کچھ ایسا لگا جیسے گلشن پھوپھو اُسے زمرد سے فاصلہ رکھنے کے حوالے سے کچھ جتا رہی ہیں۔ دل کے چور نے اندر ہی اندر بری طرح بے چین کر دیا۔

''بھئی، نیلم اس کی دوست ہے نا۔ دونوں ایک ساتھ بیٹھیں گی۔''

گلشن نے فوراً ہی نرم انداز میں وضاحت دی۔ اب بھلا ذکی اور زمرد کے متعلق وہ کھل کر کوئی بات اسفند سے کیوں کرتیں۔ ادھر اسفند نے بھی اپنا شک رفع ہونے پر دل میں شکر ادا کیا۔

باتوں باتوں میں جبار چاچا کا گھر بھی آ گیا۔ گاڑیاں نکلنے کے لیے تیار کھڑی تھیں، لیکن تھیں ابھی گیٹ کے اندر۔ اسفند نے لڑکیوں میں نیلم کو ڈھونڈا کہ پھوپھی نے زمرد کے اسی کے ساتھ بیٹھنے کی بات کی تھی، اور پھر جلد ہی نیلم اسے اپنی خالہ زاد بہنوں کے ساتھ تیسری کار میں بیٹھی دکھائی دی۔ ادھر رش بھی نہیں تھا۔ لڑکیوں کی صحبت میں زمرد بھی یقیناً اچھا محسوس کرتی

''نیلم وہاں پیچھے تیسری کار میں بیٹھی ہے۔'' بظاہر گلشن پھوپھو سے مخاطب ہوتے اس نے ایک نظر زمرد کو دیکھا جس نے بے اختیار قدم پیچھے بڑھا دیے۔

''ہاں ہاں ٹھیک ہے، میں دیکھ لوں گی۔'' پھوپھی نے جھپٹ کر زمرد کا ہاتھ کھینچا اور ذکا کی جیپ کی طرف بڑھ گئیں۔

''کیا کہا تھا تم سے، ذکی کے ساتھ بیٹھنا ہے۔'' پھوپھی کا لہجہ اگرچہ سرگوشیانہ تھا لیکن اسفند نے مکمل سنا اور سمجھا۔ نہایت چبھتے انداز میں زمرد کو دیکھا جس کا مارے خفت کے برا حال تھا۔ اماں اسے چیل کی طرح دبوچ کر زبردستی ذکا کی جیپ میں بٹھا چکی تھیں۔

نیلم یہاں موجود نہیں تھی، گلشن کا جھوٹ چند سیکنڈز میں ہی اسفند پر کھل چکا تھا لیکن انہیں بھلا کیا پروا تھی، ان کی ساری توانائیاں تو اسے ذکا کے ساتھ بٹھانے میں لگی تھیں۔ پریشانی تو زمرد کے لیے کھڑی ہو چکی تھی۔ اسفند کے دل میں کیا ہے۔ اس سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا۔ وہ جو قدم پیچھے ہٹاتے اب نہایت آزردہ سا اس سے دور چلا گیا تھا۔ گلشن پھوپھی کا کنسرن اب کسی شے کا محتاج نہ تھا۔ اور اسے افسوس پھوپھی کی دلچسپی کا نہیں تھا، وہ اپنی اولاد کے لیے کچھ بھی سوچیں یہ اُن کی مرضی تھی۔ اسفند کو دکھ زمرد کے چھپانے کا تھا۔ اُن دونوں کا رشتہ اتنا خالص، اتنا سچا تھا کہ مصلحت بھی کسی جھوٹ، غلط بیانی یا خاموشی کا اس میں دخل نہ تھا۔ اور زمرد کا رویہ بتا رہا تھا کہ ماں کی ذکا میں دلچسپی اس کے لیے نئی بات نہیں۔ ہو بھی سکتا ہے کہ ماں کی اس خواہش سے وہ بیزار ہو لیکن اسے یہ بات اسفند سے چھپانی نہیں چاہیے تھی۔

ادھر جیپ روانہ ہوتے ہی زمرد کی سوچیں بھی کچھ ایسی ملی جلی سی تھیں۔ اس کے اور اسفند کے بیچ رشتوں کا موضوع بارہا آ چکا تھا۔ اسفند ہی اکثر پریشان کن انداز میں پوچھ بیٹھتا کہ اگر وہ لوگ رشتہ لے کر آئیں تو ان کے ہاں ردعمل کیا ہوگا۔ اور کیا اس کا رشتہ قبول کر لیا جائے گا۔ لیکن زمرد نے آگے سے

ہمیشہ اللہ پر توکل کی بات کی تھی۔ ماں کی جبار ماما کی طرف حد سے بڑھی توجہ کے متعلق اسے کبھی اسفند سے کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ معلوم نہیں کہ اس خدشے کی طرف دھیان دلانے میں اسے اسفند کے غصے کا خوف تھا یا اسے کھو دینے کا لیکن سچ یہی تھا کہ اس نے کبھی اشارتاً بھی ذکا اور نیلم کا اپنے ہاں شتہ ہونے کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔

''اور پھوپھی۔ کوئی شکایت تو نہیں ہوئی شادی کے دوران؟''

ذکا کی آواز نے جیپ کی خاموشی کو توڑا اور زمرد بھی خیالوں سے باہر آئی۔ نظر ذکی کی آواز پر بے ساختہ سامنے اُٹھی۔ ذکاء اللہ بیک ویو مرر میں اپنی آنکھیں اسی کے چہرے پہ گاڑے بیٹھا تھا۔ وہ گھبرا کر دوبارہ باہر دیکھنے لگی۔

ذکا نے مونچھوں پہ انگلیاں پھیرتے اپنی مسکراہٹ کو لبوں میں روکا۔ ابھی شادی کے دوران ہی اس کی اماں نے اسے گلشن پھوپھی کی اپنی طرف دلچسپی کے متعلق بتایا تھا۔ وہ اس سے کہہ رہی تھیں کہ شادی کے فنکشنز میں آنا جانا لگا رہے گا، اس لیے وہ زمرد کو قریب سے دیکھ اور سمجھ لے، یہ اور بات کہ دوران شادی ذکا کی دلچسپی کا محور ایک اور نیا چہرا بنا رہا تھا، زمرد سے زیادہ آمنا سامنا ہی نہیں ہوا لیکن آج زمرد کی طرف ایک گہری معنی خیز نگاہ ڈالنے کی وجہ اماں کی وہ آخری بات بنی جو انہوں نے گلشن کے منہ سے ہی سنی تھی کہ انہیں تو نصیر اور زمرد کے لیے ہمیشہ سے نیلم اور ذکی ہی پسند ہیں لیکن جمیلہ ان پر واسع اور رباب کے لیے دباؤ ڈال رہی ہے اور واسع وہ نام تھا جس پر ہمیشہ ہی ذکا کے کان کھڑے ہوئے تھے۔ جمیلہ چاچی کا رباب اور واسع کے لیے زور دینے کی وجہ کہیں واسع کی زمرد میں دلچسپی نہ ہو، آخر بنا اولاد کی مرضی جانے تو مائیں رشتہ نہیں مانگا کرتیں اور دیکھنے میں تو زمرد بھی اچھی خاصی ہے۔

اگر معاملہ واسع کی خوشی چھیننے کا ہے تو زمرد کے لیے ہامی بھرنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں۔

زمرد کو دیر تک خوب توجہ سے دیکھ لینے کے بعد ذکا کا دھیان واسع کی طرف گیا۔ وہ آج کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ بزدل کہیں کا۔ پچھلی رات کے بعد چھپ کر بیٹھ گیا۔ چلو اچھا ہے۔ اس طرح بھی مجرم ہی ثابت ہوگا۔

وہ دل ہی دل میں استہزائیہ ہنس پڑا۔ اور ذکا جسے اس وقت اپنی کامیابی گردان رہا تھا وہ سوائے چھین لینے کے اور کچھ نہیں کہلا سکتا تھا۔ اور واسع سے تو ذکا نے صرف چھینا ہی چھینا تھا۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو پلڑا واسع کا ہی بھاری تھا کہ بظاہر ایسی آن بان رکھنے والے درحقیقت اس کے ممنون احسان تھے۔ یہ اور بات کہ احسان کرنے والے پر واقعی شر بن کر مسلط تھے۔

☆☆☆

بس کی کھڑکی سے باہر دیکھتے گم صم سے نصیر کی خالی آنکھیں بجھا دل آج سچ مچ ماں کی گود میں سر رکھ کر رونے کو کر رہا تھا۔ شاید وہ کسی پر اپنے جذبے اور اپنی محبت کو ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ رباب جس کی ہمت کے سہارے برسوں سے وفا کی نازک پگڈنڈی پر چلتی چلی جا رہی تھی وہ نصیر آج بالکل تہی دامن تھا۔ ماں سے جیتنے کے محاذ کو آسان سمجھتے وہ اچانک ایک بہت گہری کھائی میں آن پڑا تھا۔

''رباب! تم رباب نہیں سراب ہو۔''

ذہن کے پردے پر گزشتہ رات کا منظر تازہ ہوا، نصیر نے غصے سے سر جھٹکا، انجانے میں شاید وہ بھی برسوں سے واسع کو اپنے بہنوئی کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ رسموں رواجوں نے اُسے بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ واسع کی دوستی پر کب بدلی کے رشتے داری کا اثر غالب آیا، وہ سمجھ ہی نہیں پایا۔ نازنین کے ساتھ اس کا اپنائیت بھرا رویہ ناقابل برداشت کیوں لگا۔

جواب صاف ظاہر تھا۔ برسوں اسے یہ سوچنے

میں گزر گئے تھے کہ اماں کا دماغ جبار ماما سے حبیب ماما کے بچوں کی طرف کیسے منتقل کرنا ہے اور آخر میں ہمیشہ یہی نتیجہ نکال پایا کہ اماں تو شاید کبھی دل سے تیار نہ ہوں تو اسے زور زبردستی کر کے ہی اپنی بات منوانی پڑے گی۔ لیکن اب۔ وہ لب بختی سے آپس میں پیوست کیے ایک مرتبہ پھر اسی تکلیف دہ منظر کو سوچنے لگا تھا۔

واسع تو اس کے جذبات سے کبھی واقف ہی نہیں رہا تھا۔ تو ایسے میں اس کی زور زبردستی کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ یقیناً واسع کا صاف انکار۔ کیونکہ وہ کسی کو اپنے ساتھ کی یقین دہانی کروا چکا تھا اور مرد اپنے وعدے اتنی آسانی سے نہیں توڑا کرتے اور ایک وعدہ اس نے بھی تو کیا تھا جسے ٹوٹنے سے بچانے کے لیے اُسے شاید اب کچھ نیا سوچنا تھا۔۔

''کچھ نیا؟'' وہ جیسے خود بھی پہلی بار اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا۔ اور کچھ نیا کرنا کیا اتنا آسان ہوتا ہے۔ کتنا کچھ پرانا روند دینے کا نام ہے کچھ نیا کرنا۔ وہ سر جھٹک کر کھڑکی کے پار تیزی سے گزرتے اس اونچے لہردار پہاڑ کو دیکھنے لگا جس کے ہر بل کا اپنا رنگ اپنی شکل اور الگ اُٹھان تھی۔ پھر بھی دور سے دیکھنے پر سب ایک جیسے تھے۔ بالکل یہاں کے رہنے والوں کی طرح۔ سیدھے سادے پر کسی کی سمجھ میں نہ آنے والے۔

☆☆☆

''تو تم بھی نہیں گئیں ولیمے میں؟'' رباب نے مسکرا کر پشمینہ کو دیکھا، وہ بھی بہت دیر سے اکیلی بیٹھی بور ہو رہی تھی۔ اماں وغیرہ کے ولیمے میں چلے جانے کے بعد جبین باجی دوپہر کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی تھیں اور رباب ست روی سے صفائیاں کرنے میں لگی تھی جب پشمینہ آ گئی۔

''دل تو میرا بہت تھا لیکن لالہ نے ہی منع کر دیا، صرف اماں کو لے گئے ہیں۔'' پشمینہ نے منہ بنایا، اسی غم کو تو کم کرنے یہاں آئی تھی۔ گھر میں تو دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ نازنین اپنی کتابوں میں گھسی تھی۔ نغمہ بھابی گھر کے کام کاج میں، وہ اُکتا کر ادھر نکل آئی۔

''ہاں ویسے شبنم سے ملنے کو تو میرا بھی بڑا دل کر رہا تھا۔ پتا نہیں آج کیسی لگ رہی ہوگی۔'' رباب کے لب پیاری سی شبنم کے تصور سے مسکرائے۔ دل اس کی دوری سے اداس بھی ہوا۔ آج وہ سچ مچ پرائی ہوگئی تھی۔ یہ احساس کچھ نیا نیا اور واقعی اداس کر دینے والا تھا۔ پشمینہ بھی کھو سی گئی۔

''رُباب۔ باری۔'' باہر برآمدے سے بھاری مردانہ آواز میں توجہ طلب انداز میں پکارا گیا تو دونوں ہی چونکیں۔

''او۔ رئیس ہوگا۔'' رباب جلدی سے اُٹھی۔ مجیب چاچا، سلطانہ چاچی اور اسفند ولیمہ کے لیے گئے تھے۔ گھر پر آج وہ اکیلا تھا، اسی لیے چاچی رباب کے ذمے لگا گئی تھیں کہ پیچھے وہ رئیس کے کھانے کا خیال رکھے گی۔ یقیناً وہی آیا تھا۔

''آؤ رئیس۔'' وہ بھاگ کر دروازے تک پہنچی۔ رئیس بھی تب تک دروازے میں آ چکا تھا۔ رباب نے راستہ چھوڑا اور وہ اندر آ گیا۔ پشمینہ کے لیے یہ سامنا بالکل غیر متوقع تھا، دل کی دھڑکن میں یک لخت تیزی آئی۔ دوپٹہ درست کرتا ہاتھ واضح لرز سا گیا۔

''جلدی تو نہیں آ گیا میں؟'' وہ ہلکا سا مسکرایا۔

''ارے نہیں۔ باجی کھانا بنا چکی ہیں۔ پھر اپنا گھر ہے رئیس! جلدی آؤ یا دیر سے، کوئی پابندی ہے کیا۔ بیٹھو۔''

رباب نے بستر سے فالتو چیزیں جھٹ پٹ اٹھا کر چادر کی شکنیں درست کیں۔ پشمینہ کے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ بیٹھی رہے یا باہر نکل جائے کیونکہ کمرے میں رباب بھی موجود تھی۔ رئیس سامنے رکھی چارپائی پر بیٹھ چکا تھا۔ پشمینہ پہلے ہی داہنی دیوار سے لگی دادی کی بڑی کھاٹ پر بیٹھی تھی۔

''میں کھانا لاتی ہوں رئیس۔'' رباب کچھ زیادہ

ہی عجلت دکھاتی فوراً کمرے سے باہر چلی گئی۔ پشمینہ نے بے بسی سے رباب کی پشت کو دیکھا وہ جاتے وقت کم از کم اسے بھی آواز دے دیتی تو کتنا آسان ہو جاتا۔ پشمینہ نے رئیس کے قدموں سے دھیرے دھیرے نگاہ اوپر اُٹھائی، وہ لب دانتوں میں بھینچے جیسے اس کی حالت پر ہنسنے سے خود کو باز رکھ رہا تھا۔ پشمینہ نے پوری ہمت لگا کر اُٹھنا چاہا

''تم کیوں نہیں گئیں سب کے ساتھ؟'' رئیس نے لہجے کو سپاٹ رکھتے براہ راست مخاطب بھی کر دیا تو وہ تھی تھی سی ہمت بھی رخصت ہو گئی۔ پشمینہ کو واپس بیٹھ جانا پڑا۔

''بس لالہ نے منع کر دیا۔'' وہ اب نیچے دیکھ رہی تھی۔

''ہوں۔ مجبوراً'' وہ مسکرایا۔ ''ورنہ تمہیں تو شادیاں وغیرہ بہت پسند ہیں۔''

''نہیں۔'' وہ بے ساختہ کہہ بیٹھی۔

''اچھا۔ عادتیں بھی بدل ڈالیں؟'' وہ پھر استہزائیہ ہنسا۔

''وقت بہت کچھ تبدیل کر دیتا ہے۔'' وہ نیچے دیکھتے اپنی ہاتھوں کی انگلیوں کو اضطراری کیفیت میں مسلے جا رہی تھی۔

''اچھا؟'' وہ ہلکا سا ہنسا۔ ''پھر تو باغوں کی چھاؤں میں واک بھی چھوڑ دی ہو گی؟''

''ہوں؟'' اس نے چونک کے سر اُٹھایا۔

''اور مغرب کی اذان سن کر اب دل بھی بھر نہیں آتا ہو گا۔ اور خزاں کے پتوں پہ ننگے پاؤں بارشیں پہن کر چلنا بھی اچھا نہیں لگتا ہو گا۔ چاندنی راتیں بھی اب نہیں ڈراتی ہوں گی۔ ہوں؟'' وہ جیسے کسی تصور سے خود اپنے آپ کو محظوظ کر رہا تھا۔

''رعب ڈال رہے ہو اپنی یادداشت کا؟'' وہ مسکرانا نہیں چاہتی تھی لیکن چند ہی جملوں نے من ہلکا کر دیا تھا۔ محض پانچ ہی ماہ کی کوئی کتنی یادیں اپنے دل پہ لکھے ہوئے تھا۔ وہ پانچ ماہ جن میں ان دونوں نے نجانے کتنا کچھ ایک دوسرے کے بارے میں جان لیا تھا۔ پر اب جو سوچو تو لگتا سوائے ایک خواب کے کچھ نہیں تھا

''یادداشت؟'' رئیس نے اچنبھے سے ابرو جوڑ کر دہرایا۔ ''یادداشت کہنا چاہیے تھا یا.....''

''نہیں۔'' وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کیسی بے ڈھنگی سچویشن میں کیسے عام انداز میں دشمن کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ''بابا یا سیف لالہ یہ منظر دیکھ لیں تو.....'' وہ سوچ کر ہی لرز گئی

''آج کل چھت پر ہوتی ہو تم؟'' رئیس نے لہجے کو بظاہر بہت سرسری رکھا تھا۔

''کیوں؟'' وہ جاتے جاتے رُکی۔ ہاں کہہ کر اقرار کرنا بہت مشکل لگا۔

''گیارہ بجے میں تمہارا اوپر انتظار کروں گا۔''

''گیارہ؟'' وہ متعجب ہوئی، رئیس کی جانب البتہ اب بھی پشت کیے کھڑی تھی۔

''رات کے گیارہ۔'' وہ مسکرا رہا تھا۔ پشمینہ بے یقینی سے آنکھیں پھیلا کر پلٹی۔

''پاگل ہوئے ہو۔ رات کے گیارہ؟'' اس کے دھیمے لہجے میں دبا دبا احتجاج تھا۔ ''عقل سے فارغ ہو گیا؟''

''ہاں نا۔ وہ تو ہوں۔'' رئیس مسکرائے گیا۔ پتا نہیں اُس کو کیا ہو گیا تھا۔''

''رات کے گیارہ بجے۔ چھت پر ملاقات۔ قتل ہونا ہے کیا۔'' وہ لرز کر بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئی اور رئیس نے اس کے آخری جملے پر کچھ عجیب سی نظروں سے اس کی پشت کو دیکھا پھر لاپروائی سے ہنس پڑا۔

''مرے ہوؤں کے مرنے کی باتیں کرتی ہے پاگل۔''

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

قرۃ العین خرم ہاشمی

محبت کے سیاہ کرنا

یہ میری چھ ماہ کی خوب صورت شادی شدہ زندگی کا نچوڑ ہے۔ مگر اس حاصل سے پہلے کی کہانی بہت دلچسپ ہے اور اس حاصل کے بعد کی کہانی بہت رواں اور پرسکون۔

ہاں تو ایک دفعہ کا ذکر ہے جب میں چاندسی دلہن بن کر سپنوں کے شہزادے کے آنگن میں اتری تھی۔

☆☆☆

''دلہن! میٹھے میں کیا بنا رہی ہو؟''

اماں نے باورچی خانے میں جھانکتے ہوئے سوال کیا تو تیزی سے کام کرتی ماریہ نے سر اٹھا کر ساس کی طرف دیکھا۔

''اماں! ٹرائفل۔ جلدی میں اب یہ ہی بنا سکتی ہوں۔'' ماریہ نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو اماں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میری مدد کی ضرورت ہے؟'' انہوں نے نرمی سے سوال کیا۔

''ارے نہیں۔ آپ بس وقت پر کپڑے تبدیل کر لیجیے گا۔ فاروق پانچ بجے تک آجائیں گے۔''

ماریہ نے ایسے کہا جیسے وہ یہاں برسوں سے رہ رہی تھی اور اماں کو آئے ابھی چند دن ہی ہوئے تھے۔ جبکہ ماریہ کی شادی کو ابھی صرف ایک مہینہ ہوا تھا۔ اماں دھیرے سے مسکرا دیں۔ وہ اپنے اکلوتے اور لاڈلے بیٹے کے ہر معمول سے بخوبی واقف تھیں مگر بہو کے مان اور یقین کو قائم رکھنے کے لیے سر ہلا دیا۔

''کیک کا آرڈر کر دیا ہے؟'' واپس پلٹتی اماں کو کچھ یاد آیا تو رک کر پوچھنے لگیں۔

''ہاں۔ علی سے کہا ہے۔ کچھ دیر تک لے آئے گا۔'' ماریہ نے اپنے چھوٹے بھائی کا نام لیتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔ کون سا کیک منگوایا ہے؟'' اماں نے کسی خدشے کے تحت پوچھا۔

''چاکلیٹ۔'' ماریہ نے معروف انداز میں کہا۔

''مگر فاروق کو چاکلیٹ کیک پسند نہیں ہے۔ وہ کافی کیک شوق سے کھاتا ہے۔'' اماں نے کہا تو ماریہ کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔

''مگر اب تو آرڈر دے دیا ہے۔ بلکہ علی کیک لے کر آتا ہی ہوگا۔'' ماریہ نے پرسوچ انداز میں کہا۔

''اچھا کوئی بات نہیں۔ فاروق آج چاکلیٹ کیک کھالے گا۔''

اماں نے مسکرا کر تسلی دی تو ماریہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ شادی کے ایک مہینے کے بعد، فاروق کی سالگرہ آئی تو ماریہ نے اسے سرپرائز دش کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس لیے آج صبح، فاروق کے جانے کے بعد سے وہ تیاری میں لگی ہوئی تھی۔ فاروق کے آنے سے پہلے سب کام مکمل ہو چکے تھے۔ ماریہ نے فاروق کے من پسند رنگ کا سوٹ پہنا اور نفاست سے تیار ہو کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ علی کیک دے کر چلا گیا تھا۔ فاروق گھر آیا تو ماریہ نے سرخ پھولوں کا بکے اسے پیش کرتے ہوئے سالگرہ کی مبارک باد دی۔ فاروق حیرت اور خوشی سے گنگ رہ گیا۔

''آپ فریش ہو کر لاؤنج میں آجائیں۔ تب تک میں کباب فرائی کر لیتی ہوں۔''

ماریہ نے جلدی سے کہا اور کچن کی طرف چلی گئی۔ میز پر برتن وہ پہلے ہی سیٹ کر چکی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ کباب فرائی کر کے لائی تو اماں دھیرے سے فاروق کے کان میں کچھ کہہ رہی تھیں۔ ماریہ کو آتے ہوئے دیکھ کر وہ چپ ہو گئیں۔ فاروق جوان کی بات سنتے ہوئے سر ہلا رہا تھا۔ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ماریہ کو تھوڑا عجیب لگا مگر اس نے نظر انداز کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد تالیوں کی گونج میں فاروق نے کیک کاٹا۔ ماریہ نے سرونگ پلیٹ میں کیک کا پیس فاروق کو پیش کیا تو فاروق نے مسکراتے ہوئے پلیٹ پکڑ کر شکریہ کہا۔

فاروق کو چاکلیٹ کیک کھاتے دیکھ کر ماریہ بہت خوش تھی۔ اس نے ایک فخریہ نگاہ ساس پر ڈالی۔ اماں نے سمجھ کر بھی اسے نظر انداز کر دیا تھا۔ ایک ہنستی مسکراتی شام، یادوں کے کئی رنگ دے کر بالآخر رخصت ہو گئی۔

☆☆☆

''جب میری شادی ہوئی تو میں بہت کم عمر تھی۔ بہت سی باتوں اور چیزوں سے انجان۔ میری ساس بہت مہربان اور اچھے مزاج کی عورت تھیں۔ انھوں نے مجھے گھرداری میں بہت طاق کر دیا اور.....''

اماں پالک کو باریک باریک کاٹتے ہوئے ماریہ کو بتا رہی تھیں۔ ماریہ جھنجلائے ہوئے انداز میں انھیں دیکھ رہی تھی۔

''اماں! پالک پر اتنی محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اسے گرینڈ کر لیتے ہیں۔'' ماریہ نے کہا تو اماں مسکرا دیں۔

''نہیں دلہن! میرے سسرال میں پالک کو گرینڈ نہیں کرتے تھے بلکہ باریک کاٹ کر پکاتے تھے۔ میں نے میتھی اور پالک اپنی ساس سے کاٹنا اور بنانا سیکھی ہے۔ اللہ بخشے انھیں۔ بہت ذائقہ تھا ان کے ہاتھ میں۔ اور بہت عمدہ سکھا کر گئی ہیں وہ مجھے۔''

اماں نے محبت سے کہا تو ماریہ کا منہ بن گیا۔

''اف اماں! یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ اب اتنا فالتو وقت کس کے پاس ہے۔ میری امی بھی پالک بناتی ہیں مگر وہ پالک کو ابال کر گرینڈ کر لیتی ہیں۔ ذائقے میں وہ بھی کمال بنتی ہے۔'' ماریہ نے فخریہ انداز میں کہا تو اماں نے اثبات میں سر ہلایا

''ہاں! تمہاری ماں کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔'' اماں کے سراہنے پر ماریہ کا سر مزید تن گیا۔

''جی اور میں نے سب کچھ اپنی امی سے ہی سیکھا ہے۔''

ماریہ نے طنزیہ انداز میں کہا اور وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ اماں خاموشی سے پالک کو کاٹتے ہوئے

کچھ سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

''پتا نہیں میری ساس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ ہر بات اور ہر چیز میں اپنے ماضی کا حوالہ دیتی ہیں۔''

ماریہ فون کان سے لگائے کمرے میں ادھر سے اُدھر چکر کاٹ رہی تھی۔

''اب کیا ہوا ہے؟'' اس کی بہترین دوست حرا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ماریہ اپنے ہر مسئلے کے لیے اسی سے رابطہ کرتی تھی۔

''ہونا کیا ہے؟ وہ ہی روز کی باتیں، اعتراض وغیرہ۔'' ماریہ نے ناگواری سے کہا۔

''تو تم سنتی ہی کیوں ہو؟ نظر انداز کر دیا کرو۔'' حرا نے لاپروائی سے کہا۔

''سننا تو پڑتا ہے۔ جب سامنے والا بار بار سنائے۔'' ماریہ نے منہ بنا کر کہا۔

''کبھی کہتی ہیں کہ میری ساس ایسے کھانا بناتی تھیں، ویسے کپڑے سیتی تھیں، ویسے یہ کرتی تھیں، وہ کرتی تھیں۔ حد ہے یار! میں تو تنگ آ گئی ہوں یہ سن سن کر۔'' ماریہ نے ناگواری سے کہا۔

''دراصل اسے احساس کمتری کہتے ہیں۔ تمہاری ساس کو ڈر ہے کہ کہیں تم اپنی قابلیت اور سلیقے سے انہیں مات نہ دے دو۔ اس لیے وہ اپنی ساس کے قصے سنا سنا کر تمہیں ذہنی طور پر متاثر کر کے کمزور کرنا چاہ رہی ہیں۔''

حرا نے تجزیہ پیش کیا تو ماریہ ٹھٹک کر رک گئی۔

''ہاں! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ تم بہت ذہین ہو حرا۔'' ماریہ نے متاثر لہجے میں کہا۔

''ہاں وہ تو میں ہوں۔'' حرا نے فخریہ انداز میں کہا۔

''دراصل میری ساس کو بھی ''میں'' کی بیماری تھی۔ وہ تو خیر اپنی تعریف میں ہی زمین و آسمان ایک کر دیتی تھی۔ تمہاری ساس تو پھر بھی اپنی ساس کی تعریف کرتی ہیں۔''

حرا نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا تو ماریہ بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''تو اور کیا۔ اس دن مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ فاروق کو چاکلیٹ کیک پسند نہیں ہے۔ مگر فاروق نے تو اتنے شوق سے چاکلیٹ کیک کھایا اور۔''

ماریہ کی بات ایک دم ادھوری رہ گئی۔ جب اس نے فاروق کو کمرے کے وسط میں کھڑے دیکھا۔ ماریہ بوکھلا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

''آ..... آپ کب آئے؟'' ماریہ نے فون بند کرتے ہوئے جلدی سے پوچھا۔

''جب تم میری ماں کی تعریف کر رہی تھیں۔'' فاروق نے ٹھنڈے لہجے میں کہا تو ماریہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

''وہ تو بس.....!'' ماریہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ فاروق کو کیا کہے۔

''تم ایک بات نہیں جانتیں۔'' فاروق نے ٹائی کی ناٹ کھولتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' ماریہ نے پریشان نگاہوں سے شوہر کے سنجیدہ چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

''اس دن جب تم کباب فرائی کرنے گئی تھیں تو اماں نے مجھے نرمی سے سمجھایا تھا کہ میں تمہاری خوشی کا احساس کرتے ہوئے چاکلیٹ کیک چپ چاپ کھا لوں۔'' فاروق نے سرد لہجے میں کہا تو ماریہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

''اچھا۔ اگر آپ کی اماں اتنی اچھی اور عظیم ہیں تو پھر وہ مجھے آزادی سے جینے کیوں نہیں دیتیں؟''

ماریہ نے جان بوجھ کر بات کو بڑھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ فاروق کے سامنے اپنی منفی سوچ عیاں ہو جانے پر شدید جھنجھلاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔

''اگر ہمارا رشتہ آج اتنے آرام اور سکون سے گزر رہا ہے تو اس میں بہت زیادہ ہاتھ میری ماں کی تربیت اور کوشش کا ہے۔''

فاروق نے کہا تو ماریہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
"تو کیا میری ماں نے اچھی تربیت نہیں کی ہے؟" ماریہ کے لہجے میں ناگواری تھی۔
"میں کسی کے والدین کی تربیت پر انگلی اٹھانے والوں میں سے نہیں ہوں۔ اس لیے کہ یہ میری ماں کی تربیت ہے۔"
فاروق کے لہجے میں واضح کاٹ تھی۔ ماریہ سمجھ کر سلگ گئی تھی۔
"میں آپ کی امی کی روک ٹوک سے تنگ آ گئی ہوں۔ وہ مجھے میری مرضی اور پسند سے کچھ نہیں کرنے دیتی۔ ہر بات اور ہر چیز میں اپنے ماضی کا حوالہ دیتی ہیں۔ ان کا وقت گزر گیا ہے۔ وہ شاید یہ بات نہیں سمجھ رہی ہیں۔"
ماریہ نے تھک ہار کر کہا تو فاروق گہری سانس لے کر رہ گیا۔
"جن سے محبت ہو، جن کے ساتھ عمر کا ایک حصہ گزرا ہو، ان کے جانے کے بعد، انھیں کسی نہ کسی حوالے سے محبت سے یاد رکھنا چاہیے۔ آپ کا محبت اور اچھے لفظوں میں کسی کو یاد کرنا، اس کی قبر میں روشنی کے کئی چراغ جلا دیتا ہے۔"
فاروق نے مدھم لہجے میں کہا تو ماریہ حیرت سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔
"کیا مطلب؟ یہ کس کے مرنے کی بات ہو رہی ہے؟" ماریہ نے الجھ کر پوچھا۔
"میں بتاتی ہوں۔"
اماں کی مدھم آواز پر ماریہ نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اماں چہرے پر ہلکی مسکراہٹ سجائے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

"میرا اور میری مرحومہ ساس کا رشتہ ایسا ہی تھا جیسے زیادہ تر ساس بہو کا ہوتا ہے۔ یعنی ترش زیادہ اور میٹھا کم۔
میری ساس بھی روایتی ساس کی طرح تھیں۔ انھیں اپنی دونوں بہوؤں سے بہت شکایتیں تھیں۔ جیسے ہمیں اپنی ساس سے بہت زیادہ شکایتیں تھیں۔ شکوے شکایت کا یہ سلسلہ ان کی آخری سانس تک چلا مگر جب وہ اس دنیا سے چلی گئیں تو ان کے جانے کے کچھ عرصے کے بعد مجھے ان کی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات یاد آنے لگی۔ وہ اس بات پر خوش ہوتی تھیں، اس بات پر ہنستی تھیں، اس بات پر ہمدردی کی تھی، اس بات پر شاباش دی تھی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ.....

مرتا وہ ہے جسے ہم بھلا دیتے ہیں، پھر چاہے وہ زندہ ہو۔ کسی مرے ہوئے کو محبت سے یاد کرنا، اس کا ذکر کرنا، اس کی خوبیوں کا ذکر کرنا، نہ صرف اسے ہمارے احساس میں زندہ رکھتا ہے بلکہ اس کی آخرت کو بھی آسان بناتا ہے۔ جہاں ہر اچھے اور برے عمل کی اہمیت دنیا سے کئی گنا بڑھ کر ہے۔ بس جب یہ سوچا کہ ہمیں بھی مرنے کے بعد ایسے ہی کسی چھوٹی یا بڑی نیکی کا انتظار رہے گا تو تب سے میں اپنی ساس کو بہت اچھے اور پیارے لفظوں میں یاد کرتی ہوں۔"
اماں نے دھیمے لہجے میں کہا تو ماریہ نے شرمندگی سے جھکا سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔
"اماں! آج آپ کے ایک چھوٹے اور معمولی سے عمل نے مجھے زندگی کا بہت بڑا سبق دیا ہے۔"
ماریہ نے کھلے دل سے اعتراف کیا تھا۔ اماں نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

☆☆☆

"دنیا سے جانے والوں کو کسی نہ کسی اچھے عمل یا حوالے سے ضرور یاد رکھا کریں۔"
میں نے نیکی کا یہ چراغ اپنی ساس سے جلانا سیکھا تھا اور آج ان کے جانے کے بعد بھی، اس چراغ کی روشنی سے کئی زندگیاں روشن ہو کر سنور گئی ہیں۔
کوشش کریں کہ آپ بھی نیکی کے ایسے ہی کسی چراغ سے، دوسروں کی ابدی زندگی کو روشن کر سکیں۔

☆

مکمل ناول

بلکی ہے رُت

عائشہ تنویر

''تمہارا نام کیا ہے؟'' اتنی دیر کی مغز ماری کے بعد اس کی بات پر دھیان دیے بنا ان میں سے ایک نے پوچھا تھا۔

گویا وہ یہاں انہیں انٹرویو دینے ہی تو آئی تھی۔ دل میں جلتے کڑھتے اس نے چہرے پر تاثرات نہ آنے دیے۔

''میزاب!''

سادہ سے سوال کا سادہ سا یک لفظی جواب تھا مگر اگلے سوال اتنے سادہ نہ تھے۔

''تو میزاب تمہارا نام کس الفابیٹ سے شروع ہوتا ہے۔''

اگلا سوال شوخ تاثرات لیے، اونچی پونی باندھے اس پیاری سی لڑکی کی طرف سے تھا جو اسے بالکل بھی پیاری نہ لگی۔ شرارت پر آمادہ وہ سب اس کی جان اتنے آرام سے چھوڑنے والے نہ تھے۔ مجبوری تھی کہ وہ وہاں سے جا بھی نہیں سکتی تھی۔ جواب تو دینا ہی تھا۔

''ایم سے۔''

''اسمال ایم یا کیپٹل ایم؟''

اگلا سوال حاضر تھا۔ وہ بے بسی سے ہونٹ چبانے لگی۔ ہنستے مسکراتے وہ سب اس کے زچ ہونے والے انداز سے حظ اٹھا رہے تھے۔

''آپ پلیز میرا بیگ دے دیں۔''

اس نے اپنا ضبط آزما کر درخواست کی۔

''ہمیں کیسے یقین آئے گا کہ یہ بیگ تمہارا ہی ہے۔ کیا پتا تم جھوٹ بول رہی ہو۔''

شکل سے ہی جھوٹا لگتا وہ لڑکا بظاہر سنجیدگی سے بول رہا تھا مگر اس کی چمکتی آنکھیں اور پورے کا وہ

کی کھی کھی میزاب کو اندر تک جلا گئی۔ آنسو آنکھوں میں آنے کو بے قرار تھے مگر وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا تصور ہی کیا تھا، صرف یہ کہ یونیورسٹی کے پہلے دن ہی بیگ کلاس میں چھوڑ کر نکل گئی۔ یاد آنے پر فوراً واپس آئی مگر تب تک بیگ سینئرز کو مل چکا تھا۔ سیکنڈ ائیر کی یہ پلاٹون اس بات سے بخوبی واقف تھی کہ ابھی اس کلاس سے فرسٹ ائیر فول نکل کر گئی ہے سو بیگ لینے کے لیے بھاگی بھاگی آئی، اس بدحواس سی لڑکی کو گھیر لیا۔ نیا سیشن، نئی جگہ، نہ کوئی دوست، نہ جاننے والا، اس پر ان کی مسخریاں، غم و غصے سے میزاب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"یہ میرا ہی بیگ ہے۔ اندر میرا کارڈ موجود ہے۔ اگر آپ لوگ زیادہ تنگ کریں گے تو میں چیئرمین کے آفس چلی جاؤں گی۔" اس نے روہانسے انداز میں وضاحت دیتے دھمکانے کی بھی کوشش کی لیکن کسی پر اس کی دھمکی کا اثر نہ ہوا۔

"کیوں؟ چیئرمین صاحب پہچانتے ہیں تمہارے بیگ کو؟"

سیاہ عبایا میں خوب صورتی سے اسکارف سیٹ کیے آنکھیں پٹپٹا کر بولتی وہ لڑکی میزاب کو زہر لگی تھی اور اس کی بات پر ہنستے اس کے دوست زہر سے بھی بدے۔

"اچھا، چلو چھوڑو اب، ہمیں چائے پلا دو بس اور بیگ لے جاؤ۔"

کسی نے بیچ کی راہ نکالی۔ اتنی دیر کی مغز ماری اور ان کے ہنستے چہروں نے اسے ایک دم غصہ دلایا تھا۔ ان کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ابھی اسے اور تنگ کرنا چاہ رہے ہیں۔

"جمعرات کو آئے گا۔ خیرات نکالتی ہوں اس دن۔"

اس نے تڑخ کر کہا۔ پوری کلاس "اوہو" کی مشترکہ آواز سے گونج اٹھی۔ معصوم نظر آتی، بار بار عاجزی سے بیگ مانگنے والی لڑکی سے انہیں ایسے جواب کی امید نہیں تھی۔ اب بے جا دبانے کی کوشش پر تو چیونٹی بھی پلٹ کر کاٹ لیتی ہے تو وہ کیوں خاموش رہتی۔

"پھر جمعرات کو ہی بیگ لے جانا۔"

لمبے سے لڑکے نے بیگ لہرا کر اسے اللہ حافظ کیا۔ میزاب نے ایک نظر دیکھا، سب اس کی طرف متوجہ تھے، دل تو جانے کیا کیا سنانے کو چاہ رہا تھا مگر آنکھیں اب واقعی بھری جا رہی تھیں اور آواز گلے میں پھنس رہی تھی۔ وہ کچھ کہے بنا پلٹی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ سب خاموشی سے دیکھتے رہے اور جب وہ دروازے تک پہنچی تو گویا انہیں ہوش آیا۔

"ارے واقعی چیئرمین کے پاس نہ چلی جائے۔"

کسی کی آواز آئی۔ پونی والی لڑکی بھاگ کر اس کے پیچھے آئی تھی۔ وہی لمبا لڑکا بیگ پکڑے ایک جست میں سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اتنی دیر سے خود کو مضبوط ظاہر کرتی میزاب کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

"کم آن یار، ہم مذاق کر رہے تھے۔ رو کیوں رہی ہو۔"

لڑکی نے اس کا ہاتھ تھام کر پیار بھری بے تکلفی سے کہا۔

"یہ لو اپنا بیگ، چائے بھی مجھ سے ہی پی لینا اور خیرات بھی مجھے ہی دے دینا تم۔ اتنا چھوٹا دل ہے تمہارا تو گھر میں ہی پڑھ لیتی، یہ سب تو چلتا ہے یہاں۔"

وہ لڑکا نروٹھے سے انداز میں کہتا اسے بیگ دے رہا تھا۔ ہاتھوں کی پشت سے چہرہ صاف کرتے میزاب نے اس کا برسوں پرانی دوستی جیسا انداز ملاحظہ کیا اور بیگ سامنے آتے ہی جھپٹ لیا۔

"چلو اندر آؤ، تمہیں پانی پلاؤں۔"

وہ اسے ساتھ لیے اندر آ گئی تھی۔

"میں حرا ہوں اور یہ اسامہ، جس نے تمہیں

بیگ دیا۔" حرا بولتی جارہی تھی۔ اسامہ وہیں کھڑا بچوں کی طرح آنکھیں رگڑتی خفا خفا سی اس لڑکی کو اندر جاتے دیکھ رہا تھا۔ کچھ تھا جو کلک ہوا تھا۔ کوئی بات، کوئی یاد، کوئی چہرہ۔۔۔ مگر کیا، یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

☆☆☆

ہنستے مسکراتے شرارتی سے اس گروپ سے میزاب کا یہ پہلا تعارف تھا۔ گھر آکر اس نے خود پر بیتی داستان بہت دردناک لہجے میں تفصیل سے بتائی تھی مگر اسجد بھائی نے ہنس ہنس کر اس کے رونے کا اتنا مذاق بنایا کہ وہ دوبارہ رونے والی ہوگئی۔ مما مداخلت نہ کرتیں تو شاید بھائی اسے رلا کر ہی جاتے۔ اسفر نے تو اس کا مذاق ہی بنالیا۔ جب کبھی اس کا موڈ خراب ہوتا تو کہتا۔

"آج آپی کی شکل سے پتا چل رہا ہے کہ میزاب اسمال ایم سے آتا ہے۔"

وہ دانت کچکچا کر اس کے پیچھے بھاگتے بے اختیار ہنس دیتی۔ مذاق تو ان لوگوں نے بھی اس کا بنا لیا تھا۔ جیسے ہی وہ نظر آتی، کوئی نہ کوئی بولتا۔

"چپ، چیئرمین صاحب کی بھانجی آرہی ہے۔"

"حد ادب، ورنہ لوگ چیئرمین صاحب کو بلالیں گے۔"

بس فرق یہ پڑا تھا کہ اب وہ چڑنے کے بجائے ان کا مذاق انجوائے کرتی۔ کبھی مسکرا کر سن لیتی تو کبھی جواب دے دیتی۔

☆☆☆

اسجد دن بھر کا تھکا ہوا بہت بیزار سا گھر میں داخل ہوا تھا لیکن لاؤنج میں خالہ کو مما کے ساتھ بیٹھے دیکھا تو کھل اٹھا۔

"السلام علیکم۔"

زوردار سلام جھاڑتے ہوئے وہ وہیں بیٹھ گیا۔

"بہت دن بعد آئیں آپ۔"

جوتوں کی قید سے پاؤں آزاد کرتے وہ مما کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ مما نے اس کا ماتھا چوم لیا۔ ایسا والہانہ پیار کبھی کبھی ہی ملتا تھا۔ اسجد خوش ہو گیا۔ اوپر تلے والے بہن بھائیوں کی جیلسی کی وجہ سے اسے ہمیشہ ہی شکوہ رہتا تھا کہ سب میزاب کو زیادہ پیار کرتے ہیں۔ عام ماؤں کے برعکس مما بھی اپنی بیٹی کو بیٹوں پر ترجیح دیتی تھیں۔ وہ شکوہ کرتا اور مما مسکرا کر اس کی شکایتیں سنتی رہتیں۔ کیا بتاتیں کہ وہ انہیں کتنا پیارا تھا۔ پہلی اولاد ہمیشہ ہی دل کے بہت قریب ہوتی ہے۔ وہ اولاد میں فرق کرنے والوں میں سے نہیں تھیں۔ پھر بھی جانے کیوں اس کی تسلی نہ کروا پاتیں۔ والدین اولاد کی آنکھوں سے دل کا حال جان لیتے ہیں مگر اولاد والدین کے اندر کو کبھی سمجھ نہیں پاتی۔

"بس تم سے ملاقات نہیں ہوئی، چکر تو لگ ہی جاتا ہے۔ تم سناؤ، تمہاری جاب کا کیا بنا؟"

خالہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔ اسجد کا منہ لٹک گیا۔

"ابھی تو ایک ملٹی نیشنل میں انٹرن شپ ہی چل رہی ہے۔ میری فیلڈ کی نوکری مل نہیں رہی، بابا کہہ رہے ہیں کہ جب تک اچھی جاب نہ ملے، تجربہ بڑھا لو لیکن فیلڈ سے نہ ہٹو۔"

اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے بتایا۔ مما پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے گویا اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھیں۔

"اللہ اچھا کرے گا۔"

خالہ نے اس کی ہمت بڑھائی۔

"اکیلی آئی ہیں آپ۔ صائم، بسمہ کوئی نہیں آیا۔"

اس نے بظاہر سرسری انداز میں کہا مگر لہجے کی بے تابی مما سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ جو نام دل الاپ رہا تھا، اس نے بمشکل زبان پر آنے سے روکا تھا۔

"ایک جاننے والی ہیں یہاں، بسمہ کا رشتہ

بتایا تھا، ان سے ملنے آئی تھی۔ تو یہاں بھی آ گئی۔"

خالہ نے چائے پیتے آرام سے وجہ بتائی وہ لیٹنے سے اٹھ بیٹھا۔

"ابھی تو بسمہ پڑھ رہی ہے خالہ۔"

اس کی حیرت کا ان پر رتی بھر اثر نہیں ہوا تھا۔

"تو کیا ہوا، بعد میں پڑھتی رہے گی۔ میں تو چاہتی ہوں بس بسمہ! یمنیٰ کی جلدی سے شادی ہو۔ پھر آمنہ بھی ہے۔ صائم بڑا ہے۔ اب بہنوں کے لیے اسے بٹھا بھی نہیں سکتی اور بہنوں سے پہلے شادی کر دوں تو بھی جانے بہو کیسی آئے۔"

انہوں نے تفصیل سے اپنے روایتی ماؤں والے خدشات سے آگاہ کیا۔ وہ چند لمحے کچھ نہ بول سکا۔ مما نے ان کی تائید کی تھی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔ پھر ابھی سے رشتہ دیکھو گی تو شادی تک سال ایسے ہی گزر جائے گا۔ آمنہ کی چاہے بعد میں ہو لیکن صائم کے ساتھ یا اس کی شادی سے پہلے بسمہ، یمنیٰ کی شادی کر دینا۔ ایک ساتھ شادی میں کچھ بچت بھی ہو جائے گی۔"

اسجد نے ماں کو دیکھا تھا جو یمنیٰ کے لیے اس کے دلی جذبات سے آگاہ ہونے کے باوجود کس طرح خالہ کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں۔ مما واقعی اس سے پیار نہیں کرتی تھیں، تھوڑی دیر پہلے دل میں اترتی خوشی عائب ہو گئی

"یمنیٰ تو شاید میزاب سے بھی چھوٹی ہے۔"

اس نے مما کو یاد کروانا چاہا۔

"تو کیا ہوا بیٹا، سال، دو سال سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سب کو اپنے حالات کے مطابق چلنا ہوتا ہے۔" خالہ نے مما سے پہلے کہا تھا۔ انہیں اسجد کا یوں ماں کو جتانا اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ بُرے دل سے اٹھا تھا۔ جب تک نوکری نہ ہو جاتی، منگنی کا کہتے ہوئے بھی اسے عجیب لگ رہا تھا مگر عمر کے فرق اور بڑے بہن بھائی موجود ہونے کی وجہ سے یہ تسلی بھی تھی کہ یمنیٰ کہیں نہیں جانے والی مگر خالہ کی گفتگو اسے بے

شمار خدشوں میں ڈال گئی تھی۔ دل کی وادی میں بستے امید اور محبت کے بے شمار پھولوں پر خزاں کے سائے منڈلا رہے تھے۔ کون جانے موسم بدلنے پر باقی کیا رہتا۔

☆☆☆

وقت گزرنے کے ساتھ میزاب بھی یونیورسٹی کے ماحول میں سیٹ ہو گئی۔ اساتذہ اور کلاس فیلوز سے جان پہچان بھی ہوئی اور دوست بھی بنا لیں۔ حرا اور اس کے پورے گروپ سے اس کی اب اچھی ہائے ہیلو تھی۔ فرسٹ ائیر کی طرح سیکنڈ ائیر بھی اپنے اختیاری مضامین کی کلاسز کے لیے دوسرے ڈیپارٹمنٹ بھاگتی رہتی تو باقاعدہ دوستی کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اس دن وہ پریشان سی فزکس ڈیپارٹمنٹ کے لان میں بیٹھی تھی۔ پوائنٹ جا چکے تھے سو ڈیپارٹمنٹ میں رش نہیں تھا۔ اس کا پریکٹیکل ابھی ہونا تھا، مگر جرنل میں ساری کیلکولیشن غلط تھیں۔ اس کی دوست کے پاس آپشنل میں فزکس نہیں تھی سو وہ گھر چلی گئی تھی۔ اب اسے کوئی ایسا جان پہچان والا بندہ نظر نہیں آ رہا تھا جس سے وہ مدد لیتی۔ دیر تک پریکٹیکل لینے کی ہمت جمع کرنے کے لیے سب کلاس فیلوز پیٹ پوجا کرنے جا چکے تھے۔

"کیا ہوا، پھر کسی نے بیگ لے لیا تمہارا۔ روتی صورت بنا کر کیوں بیٹھی ہو۔"

آواز پر چونک کر اس نے سر اٹھایا، سامنے اسامہ کھڑا تھا۔ اس کا انداز پہلے دن کی طرح دوستانہ تھا۔ میزاب نے پہلے تو بے خیالی میں اسے دیکھا پھر ایک دم آنکھیں چمکیں۔ وہ ذہین تھا، ڈیپارٹمنٹ میں اکثر ہی کسی نہ کسی کی مدد کرتا نظر آتا تھا۔

"آپ کے پاس فزکس ہے نا۔ یہ نیوٹن میریکل تو حل کر دیں۔"

اس نے فوراً موقع سے فائدہ اٹھا کر مدد مانگ لی۔ اسامہ بیگ گھاس پر ایک طرف رکھتا اس کے سامنے تسلی سے بیٹھ گیا۔ آدھے گھنٹے بعد جب وہ

وہاں سے اٹھا تو نہ صرف میزاب کو پریکٹیکل اچھی طرح سمجھ آ چکا تھا بلکہ ان کے درمیان اچھے تعلق کی بنیاد بھی پڑ گئی تھی۔

☆☆☆

"ہر ماں اپنی بھانجی کو بہو بنانا چاہتی ہے۔ میں ہی دنیا سے نرالا ہوں۔ خالہ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو میری امی ہی ظالم سماج بنی ہوئی ہیں۔"

اسجد بگڑے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ خاموش تماشائی بنے میزاب اور اسفر نے ماں کو دیکھا مگر وہ بنا تاثر انداز میں اسجد کو دیکھ رہی تھیں۔ اسجد کو جاب مل گئی تھی گو تنخواہ زیادہ نہ تھی مگر اب وہ بیروزگار نہ تھا۔ وہ منگنی کرنا چاہتا تھا مگر مما کسی منگنی کے حق میں نہیں تھیں۔ اسجد نے بابا سے بات کی تھی۔ سب اس کے ساتھ تھے لیکن مما کا ایک ہی مؤقف تھا۔ شادی کرنی ہے تو کرو ورنہ چپ رہو۔

"بھائی! امی نے منع تو نہیں کیا۔ منع تو آپ کر رہے ہو۔"

اسفر نے ماں کی سائیڈ لی۔

"میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ پہلے اچھی نوکری تو ملے۔ شادی کے بعد کیریئر بنانا بہت مشکل ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ خالہ یمنیٰ کا کہیں اور رشتہ نہ طے کر دیں۔ خالہ اس کی شادی میں جلدی نہ کریں۔"

اس نے ہزار بار کی کہی ہوئی بات دہرائی۔

"جب شادی کرنا چاہو تو بتا دینا، میں اسی نوکری میں رشتے کے لیے تمہاری خالہ کو منا لوں گی مگر ایسے منگنی کر کے نہیں رکھوں گی۔"

مما نے بھی سہولت سے اپنی بات دہرائی۔

"آخر منگنی کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔ بابا بھی تو یہی کہہ رہے تھے۔"

اسجد باغی ہو رہا تھا۔ بابا اس کی طرف ہوتے ہوئے بھی ویٹو پاور کیوں استعمال نہیں کر رہے تھے۔ انہوں نے سب کچھ مما کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا۔

"تمہارے بابا کو لڑکوں کے دل کا بہت خیال رہتا ہے۔ ان سے پوچھنا کہ میزاب کو بھی یوں ہی سالہا سال رشتے لٹکانے کی، اپنی مرضی کرنے کی اجازت دیں گے۔"

مما ایک دم تلخی سے کہتی اٹھ کر چلی گئیں تھیں۔ اسجد نے سر پکڑ لیا۔ بابا کے ماضی کی پرچھائیاں اس کے مستقبل پر سایہ کر کے اسے اندھیر کر رہی تھیں۔ میزاب اپنے نام پر خجل سی ہو کر مما کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اسفر ہونقوں کی طرح کچھ سمجھنے کی کوشش میں تھا۔

"جاؤ، مما کو پانی پلاؤ۔"

میزاب نے اسفر کو وہاں سے ٹالا اور خود بھائی کے پاس آ بیٹھی۔

"آپ کیوں پریشان ہو رہے ہو بھائی۔ ابھی تو بسمہ کا رشتہ بھی طے نہیں ہوا۔ بڑی بیٹی کے ہوتے ہوئے خالہ چھوٹی کا رشتہ کیوں طے کریں گی۔ میرا یقین کرو، میں یمنیٰ کو ہی اپنی بھابھی بناؤں گی۔"

اس نے تسلی دینی چاہی۔

"خالہ ایسے نہیں رکیں گی، تمہیں پتا ہے۔ مما بس رشتہ مانگ لیں تو مسئلہ نہ ہو مگر مما کو کبھی میری خوشی کا خیال نہیں رہتا۔"

اس نے بہن کے پرجوش انداز کو طفل تسلی ہی سمجھا تھا۔ تب ہی جلے کٹے انداز میں کہا۔ میزاب جانتی تھی، وہ سچ کہہ رہا ہے۔ اسجد کی دعائیں تھیں، نصیب تھے یا بسمہ کی عام سی صورت، اس کے رشتے کے لیے خالہ بہت پریشان تھیں۔ اس نے گریجویشن بھی نہیں کیا تھا، تب سے وہ اس کا رشتہ ڈھونڈ رہی تھیں، اب وہ ماسٹرز کر چکی تھی۔ اس دوران آنے والے چھوٹی یمنیٰ یا آمنہ کو پسند کر جاتے۔ خالہ اس صورتحال سے بہت دل گیر رہتیں۔ یمنیٰ بھی اب گریجویشن کر رہی تھی۔۔ بسمہ کے رشتے میں اتنا وقت اور مسائل دیکھ کر خالہ فیصلہ کر چکی تھیں کہ اس بار یمنیٰ کا اچھا رشتہ آیا تو اسے انکار نہیں کرنا تا

کہ بعد میں رشتہ ڈھونڈنے میں پریشانی نہ ہو۔ دونوں بہنوں کی اکٹھے شادی ہو جائے۔ مما کا بھی یہی موقف تھا کہ جلدی شادی کا ارادہ ہے تو رشتے کی بات کرو ورنہ بچی کو منگنی کر کے باندھنے کی ضرورت نہیں۔

دوسری طرف اسجد تھا، جسے اچھی نوکری کا انتظار تھا۔ اسے یمنیٰ سے شادی بھی کرنی تھی اور جلدی بھی کوئی نہ تھی۔ وہ چاہتا تھا بس منگنی ہو جائے، تاکہ خالہ جلد بازی میں کہیں اور اس کا رشتہ یا شادی نہ کر دیں۔ وہ منگنی کے بعد کا گولڈن پیریڈ انجوائے کرنا چاہتا تھا اور مما پرانے زمانے کی ماؤں کی طرح ایسے کسی رشتے پر یقین نہیں رکھتی تھیں۔ مسئلہ کوئی نہیں تھا، مگر مسئلہ تھا۔ وہ بدگمانی اور بغاوت جو اسجد کے دل میں پل رہی تھی۔ اسے مما سے برگشتہ کر رہی تھی۔ وہ ان کی بات سمجھ رہا تھا۔ نہ مما سمجھانے پر زور دے رہی تھیں۔ دونوں اپنی ضد پر اڑے تھے۔

☆☆☆

"مما، میں جب بھی میزاب کو دیکھتا ہوں تو مجھے آپ یاد آ جاتی ہیں، وہ بالکل آپ جیسی ہے۔"

کچن ٹیبل پر سالن کا ڈونگا، سلاد، پانی رکھے اسامہ مما کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اسے گرم روٹی کی عادت تھی اور مما ہمیشہ اس کے آنے پر تازہ روٹی اسے اتار کر دیتیں۔ روٹی پکتے پکتے وہ کتنی ہی باتیں کر لیتے۔ اب بھی سلاد کی پلیٹ سے کھیرے چنتے اسامہ کو ایک دم یاد آیا تھا۔ مما نے روٹی توے پر ڈالتے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"تم آج کل زیادہ ہی میزاب کا ذکر نہیں کر رہے اور بہانے دیکھو، آپ جیسی ہے۔"

انہوں نے اسے گھور کر کہتے نقل اتاری۔

"سچ کہہ رہا ہوں مما، شروع میں میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے دیکھ کر مانوسیت کا احساس کیوں ہوتا ہے لیکن اب اس دن آپ کی پرانی تصویر دیکھی تو پتا چل گیا۔"

وہ سیدھا ہو بیٹھا اور یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا۔

مہینے، دنوں میں گزر رہے تھے اور ان گزرتے دنوں میں ان کا تعلق جانے کب دوستی سے آگے نکل گیا تھا۔ نہ کبھی اس نے کچھ کہا، نہ میزاب نے کسی قسم کا اظہار کیا مگر وہ دونوں جانتے تھے کہ ان کے دل ایک ہی دھن پر رقصاں ہیں۔ نہ وہ کبھی درختوں کی چھاؤں میں اکیلے بیٹھتے، نہ دوستوں کو چھوڑ کر کسی سنسان گوشے کی تلاش میں نکلتے لیکن ڈیپارٹمنٹ میں گھستے ہی نظر کا بے اختیار دوسرے کو تلاش کرنا، نظر ملنے پر مسکرا کر اپنی کلاس کی طرف بڑھ جانا ہی ان کے لیے بہت تھا۔ وہ اسے سمجھاتا تھا، پڑھاتا تھا لیکن کبھی میزاب نے اسے ایسا موقع نہیں دیا کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار کر سکے۔ شروع میں میزاب کو دیکھ کر اسے کچھ یاد آتا تھا، شاید مما سے مشابہت ہی اسے میزاب کی طرف متوجہ کرتی تھی۔ اس کی عادات، اس کی صورت میں مما کی واضح جھلک تھی۔ پھر جذبات بدلے تو وہ سب بھول گیا اور صرف میزاب یاد رہ گئی۔ اب بھی وہ اتفاقاً مما کی پرانی تصویر نہ دیکھتا تو اسے اس مشابہت کا ادراک نہ ہوتا۔

"لڑکیوں کو خود دیکھو اور الزام ساراماں کے سر ڈال دو۔"

مما نے لب دباتے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا، اسامہ سر ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"میرے اللہ، میں کیسے اپنی ماں کو یقین دلاؤں! آدھا زمانہ میرے کردار کا گواہ ہے۔"

وہ کراہ کر بولا۔

"باقی آدھا زمانہ کیوں نہیں ہے۔"

مما روٹیاں رومال میں لپیٹ کر اس کے سامنے بیٹھتی جرح کرنے لگیں۔

"کیونکہ وہ میرے رشتے دار ہیں یا محلے دار ہیں اور جاننے والے کبھی خوش نہیں ہوتے۔"

اس نے ترنت جواب دیا، ساتھ ہی ہنس دیا۔

مما کو بھی بے ساختہ ہنسی آئی تھی۔
"بدتمیز، ہمارے کون سے رشتے دار ہیں۔"
وہ قدرے افسردہ ہوئیں۔
"بابا اکلوتے سہی لیکن ان کے چچا، ماموں کے بچے سب کو آپ نے سر پر سوار کر رکھا ہے۔ مجھے تو خوشی ہے کہ ہم نے شہر بدلا اور یہاں آ گئے۔ کم از کم یہاں ہر دوسرے دن آپ کسی کی دعوت تو نہیں کر سکتیں۔"
اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے ماں کی افسردگی مٹانی چاہی۔
"میں آپ کو میزاب کا بتا رہا تھا اور آپ کہاں جا پہنچیں۔"
اس نے فوراً موضوع بدلا۔
"پھر میزاب، ابھی کہہ رہے تھے کہ شرافت کی گواہیاں دیتے ہیں لوگ۔" مما نے یاد دلایا۔
"ٹھیک ہی کہا تھا۔ مجھے لڑکیوں میں کیا دلچسپی، بس میزاب کی بات الگ ہے، وہ تو آپ جیسی ہے نا۔"
اس نے شرارت سے ماں کو دیکھا۔
"پھر دکھاؤ مجھے بھی، پتا چلے کون میری ہم شکل ڈھونڈ آئے ہو۔"
وہ اشتیاق سے بولیں۔ بیٹے کے دل کا حال اس کی آنکھوں میں لکھا تھا تو ہونے والی بہو کو دیکھنا بنتا تھا نا۔
"میرے پاس تو اس کی کوئی تصویر ہی نہیں۔"
پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے اسامہ نے بیچارگی سے کہا۔
"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آج کل کی نسل کو تصویروں کے علاوہ کام کیا ہے۔ واٹس ایپ یا فیس بک پر جو تصویر ہے، وہی دکھا دو۔"
مما کا موڈ خراب ہو گیا۔ انہوں نے بے یقینی سے اسے دیکھتے ممکنہ آپشن بتائے۔
"واقعی نہیں ہے مما۔ وہ اپنی تصویر لگاتی ہی نہیں۔ میں نے بھی کبھی نہیں مانگی۔ برا لگتا ہے۔ تصویر سے کیا ہوگا، کسی دن آپ کو ملواؤں گا اس سے۔"
اس نے رغبت سے کھانا کھاتے ہوئے ماں کو تسلی دی۔ وہ مایوس سے انداز میں اٹھ گئی تھیں۔ ڈھیلے ڈھالے انداز میں چولہے پر چائے کا پانی چڑھانے لگیں۔ سارے جوش پر پانی پھر گیا تھا۔ اسامہ نے ان کا مایوس انداز دیکھا تو کھانے کے ساتھ ذہن میں ان کی میزاب سے ملاقات کروانے کے لیے تانے بانے بنتا رہا۔

☆☆☆

"مما! اگلے سنڈے، اسامہ کے پیرنٹس کی ویڈنگ اینیورسری ہے۔ اس نے ہمیں بھی بلایا ہے، پوری فیملی کو۔ چلیں گے ہم؟"
اس کی مما ہمیشہ سے اس کے لیے سہیلی کی طرح ہی تھیں۔ ماں کی ممتا، بہنوں کی نوک جھونک اور سہیلوں جیسی بے تکلفی ایک ہی رشتے میں میسر تھی مگر

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

دل ایک گلشن

رضیہ جمیل

قیمت -/300 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

منگوانے کا پتہ

فون نمبر:
32735021

جانے کیوں آج یہ بات کرتے میزاب قدرے جھجک گئی تھی۔ مما نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ انہیں اپنی بیٹی پر پورا یقین تھا۔ اس کی گفتگو میں جب اسامہ کا ذکر آنے لگا تھا، تب وہ چونکیں اور ایک دن پوچھ بھی لیا۔

"اسامہ سے ہی مدد لیتی ہو۔ ڈیپارٹمنٹ میں اور کوئی نہیں۔"

ان کے سرسری انداز کے پیچھے چھپا سوال، چہرے کی گہری سنجیدگی میزاب کو بہت محسوس ہوئی تھی۔ اسامہ کے نام پر اپنے چہرے پر پھیلے خوب صورت رنگوں کو چھپاتے اس نے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

"سب سے تو مدد نہیں لی جاتی مما، اور آپ بے فکر رہیں، آپ کو میری وجہ سے کبھی شرمندگی نہیں ہوگی مما۔ میں آپ کا یقین نہیں توڑوں گی۔"

اس کے انداز کی سچائی نے انہیں خاموش کر دیا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اسے یہ نہ کہہ سکیں کہ انہیں اس پر خود سے زیادہ یقین تھا۔ وہ اپنے اعتماد کے نہیں بلکہ اس کا دل ٹوٹنے سے ڈرتی تھیں۔ میزاب عادتاً پورے دن کی روداد انہیں سناتی۔ بیچ میں اسامہ کا بھی نام آ جاتا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہتیں، ان کے درمیان نرم روی سے پنپتا محبت کا پودا انہیں نظر آ رہا تھا مگر وہ اسے منع نہیں کر پاتیں۔ کیا کہتیں کہ اسامہ سے کنارا کر لو۔ وہ اس سے بالخصوص ملتی تو نہیں تھی۔ آتے جاتے یا ضرورتاً بات ہو جاتی۔ بات نہ کرتی تو بھی ڈیپارٹمنٹ میں رہتے ہوئے سرِ راہ ملاقات ہو ہی جاتی۔ اپنے ایک خوف کی خاطر اس کی تعلیم کو داؤ پر لگانا انہیں گوارا نہ ہوا۔

جانے کیا وجہ تھی کہ ساری زندگی ذمہ دار بیوی اور ماں کا کردار نبھاتے وہ جانتے بوجھتے اس طرف سے آنکھیں بند کر گئیں۔ ان کی زندگی کا تجربہ تھا، سختی ہمیشہ بغاوت کو جنم دیتی ہے جبکہ اعتماد کی ڈور سے بندھا شخص کبھی اپنے دائرے سے نہیں نکل سکتا۔

میزاب کا سیل فون بنا کسی لاک کے ان کے لیے کھلا تھا۔ اپنے دل میں آنے والی ہر بات وہ ان سے شیئر کرتی۔ یہی سوچ کر وہ اسے کچھ کہہ نہ سکیں۔

اب اس کی بات پر دل قدرے مطمئن ہوا۔ اسامہ اسے اپنی فیملی سے ملوانا چاہتا تھا۔ وہ میزاب کو اکیلے نہیں بلا رہا تھا بلکہ دونوں خاندانوں کا تعارف کروا رہا تھا۔ یہی بات اس کے دل کو کھوٹ سے پاک ثابت کرتی تھی۔

"اتنا بڑا بیٹا ہے ماشاء اللہ ان کا، اس عمر میں کون شادی کی سالگرہ مناتا ہے۔ بہت زندہ دل ہیں اسامہ کے والدین۔"

انہوں نے جواب دینے کے بجائے ہنس کر تبصرہ کیا۔ ذہن شوہر کے ممکنہ ردعمل کا اندازہ لگا رہا تھا۔

"ان کے زیادہ رشتے دار نہیں ہیں مما، اسامہ بھی اکلوتا ہے، اس کے ابو بھی اکلوتے تو بس ملنے جلنے کے لیے یہی بہانے ڈھونڈتے ہیں۔"

میزاب نے چمکتے چہرے سے بتایا تھا۔ ماں کی طرف سے نیم رضامندی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"لیکن اگلے سنڈے تو مجھے آپی کی طرف جانا ہے۔ بسمہ کی منگنی ہے۔"

انہیں غلط وقت پر بھانجی کی منگنی یاد آئی۔ میزاب کا چہرہ بجھ گیا۔

"خالہ تو کہہ رہی تھیں، کوئی منگنی نہیں کرنی میں نے۔" اس نے خفگی کے ساتھ یاد کروایا۔

"ہاں تو باقاعدہ منگنی نہیں ہے۔ بس لڑکے کے گھر بات پکی کرنے جانا ہے، لیکن میرا اور تمہارے بابا کا جانا بہت ضروری ہے بیٹا۔ وہ تمہارے بابا کو لڑکے سے ملوانا چاہتی ہیں۔ فوراً شادی رکھنی ہے نا۔ اب اتنی مشکل سے بسمہ کا رشتہ ہوا ہے ایسے وقت میں اپنی طرف سے کوئی پریشانی نہیں کھڑی کر سکتی۔"

مما کی بتائی تفصیل بھی میزاب کو مطمئن نہ کر سکی۔ وہ دل ہی دل میں کڑھ گئی۔ اسے بھائی کی بات یاد آئی۔ مما کو بھانجیوں سے زیادہ ہی پیار تھا۔ تب ہی بیٹے سے زیادہ بھانجی کی فکر تھی۔

"آپ بھی خالہ سے یمنی کے لیے بات کرلیں۔ وہ یمنی کو بھی ساتھ ہی رخصت نہ کردیں۔" بھائی کا خیال آتے ہی اس نے بے اختیار یاد دلایا۔ انہوں نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ جانے مما کیا کریں۔ میزاب نے دل میں سوچا مگر مزید اصرار کرنے کے بجائے دوبارہ اپنے مسئلے پر آئی۔

"پھر ہم نہیں جارہے ویڈنگ اینورسری میں۔" اس کا لہجہ مایوس ہوا تھا۔

"تم اسجد کے ساتھ پارٹی میں چلی جانا۔ ہم منگنی میں چلے جائیں گے۔"

انہوں نے حل نکالا۔ وقت نے انہیں بہت عجیب دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ بیٹی کے کلاس فیلو کا رشتہ آنے پر شوہر کا ردعمل کیا ہوتا، وہ سمجھ نہیں پارہی تھیں۔ بلاوجہ وہموں اور خدشات میں بیٹی کا دل توڑنا بھی انہیں مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ بیٹے کو سب سمجھا کر اس کے ساتھ بھیجنے کا سوچ کر وہ مطمئن ہوگئیں۔ اچھا تھا وہ اسامہ سے مل لیتا تو اپنی رائے دے دیتا تو اس کے ساتھ مل کر وہ بہتر طور پر اس معاملے کو آگے بڑھا سکتی تھیں۔ وہ ہر قسم کی صورتحال کے لیے اپنے طور پر تیار تھیں مگر تقدیر انہیں کیا دکھانے والی تھی، وہ بالکل بے خبر تھیں۔

☆☆☆

سیاہ سلک کی سادہ میکسی میں ہلکے پھلکے میک اپ کے ساتھ میزاب نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ اوور بھی نہ ہو اور اچھی بھی لگے۔ اندر ہی اندر وہ جانتی تھی کہ اسامہ نے اسے اپنی فیملی سے ملوانے کے لیے بلوایا ہے۔ چھوٹا سا کلچ ہاتھ میں پکڑے جب وہ اسجد کے ساتھ باہر جانے کے لیے نکلی تو اس نے بہن کے چمکتے چہرے کو دیکھا تھا۔ وہ اتنی بڑی ہوگئی اور اسے علم بھی نہیں ہوا۔ مما کا اندازہ تھا کہ وہ لڑکا اسے پسند کرتا ہے اور میزاب بھی اس میں دلچسپی رکھتی ہے ورنہ ایسے کسی کی ذاتی تقریبات میں جانے کا کیا جواز۔ میزاب کی پسند کا سن کر اس کے دل میں عجیب جذبات پیدا ہوئے تھے۔ وہ خود اپنے آپ کو سمجھ نہیں پایا۔ جب وہ یمنی کے لیے برملا اظہار پسندیدگی کر سکتا ہے، یمنی اور اپنی دلی وابستگی کا ذکر والدین اور بہن بھائی کے سامنے کرنے سے نہیں کتراتا تو میزاب کی پسند پر بھی اسے روشن خیالی کا ثبوت دینا چاہیے۔ مگر وہ لڑکا کون تھا، کیسا تھا اور ان کا تعلق کیسا تھا، یہ خیالات اسے بے چین کررہے تھے۔

مما سے بدگمانیاں تھیں، خفگیاں تھیں مگر محبت بھی بہت تھی اور میزاب تو ان سب کے جگر کا ٹکڑا تھی۔ مما نے کہا تھا کہ وہ چاہتی ہیں، اسجد اس کے ساتھ جاکر اس لڑکے سے مل لے تاکہ بعد میں انہیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ وہ ماں اور بہن کی خوشی کی خاطر تیار کھڑا تھا۔ سیاہ دوپٹے کو پنیں لگا کر میزاب نے اچھی طرح جما کر اوڑھا تھا۔ میکسی کی آستینیں کلائیوں تک تھیں۔ اونچی ہیل میں وہ تیار کھڑی اس کی منتظر تھی۔ اسجد گہری سانس بھرتا اسے آنے کا اشارہ کرتا نکل گیا۔

ہال ان کے گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ ہال کے داخلی دروازے پر کھڑے تھے۔ ہال خالی خالی نظر آرہا تھا۔ ابھی زیادہ لوگ نہ آئے تھے۔ اسجد کا ارادہ جلدی جاکر فوراً واپس آنے کا تھا۔ انٹرنس پر ہی اسامہ کھڑا ہوا تھا۔ اسجد سے اچھی طرح سلام دعا کر کے اس نے ہال کا جائزہ لیا۔ پاپا ارد گرد نظر نہ آئے۔ خالی ہال میں مما دور ایک کونے کے صوفے پر بیٹھی ہوئی نظر آئیں۔

"دوست احباب تو ابھی آئے نہیں، تب تک آپ لوگ میری مما سے مل لیں۔"

میزاب پر اچٹتی سی نگاہ ڈال کر وہ ان دونوں کو وہاں لے گیا تھا۔

"مما، یہ میزاب ہے اور اس کے بھائی اسجد۔" اس نے ایک باوقار سی خاتون کو مخاطب کیا تھا۔ وہ مسکرا کر متوجہ ہوئیں اور انہیں اسامہ کی کہی بات پر یقین آنے لگا۔ ان کے سامنے ماضی کے آئینے کھڑے تھے۔ میزاب واقعی ان سے مشابہت رکھتی تھی اور اسجد بھی تو کسی کا عکس تھا۔ میزاب اور اسجد

بھی انہیں دیکھ کر چونکے تھے۔ وہ جانی پہچانی صورت رکھتی تھیں۔ عمر نے ان کی شخصیت و صورت پر زیادہ فرق نہیں ڈالا تھا۔ پرانے البمز میں لگی کچھ تصویریں ان کے ذہن پر تازہ ہوئیں۔ اسامہ ان سب کی حالت کا ادراک کیے بنا، کسی کے مخاطب کرنے پر مڑ گیا تھا۔

"بیٹھو بیٹا!"

وہ بمشکل بولیں۔ ذہن میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ انہوں نے کانپتے لہجے میں اسجد سے اس کے والد کا نام پوچھا تھا۔ نام سن کر ان کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ میزاب نے پاس بیٹھ کر انہیں دوبارہ سے دیکھا۔

"بھائی یہ تو....."

وہ کہتے کہتے رکی مگر اسجد جان گیا تھا کہ وہ کیا بولنا چاہ رہی ہے۔ گزرتے وقت نے ان پر اتنا ستم نہیں ڈھایا تھا کہ وہ پہچان میں نہ آتیں۔ گھر میں ان کا ذکر نہیں ہوتا تھا لیکن خاندان میں جو میزاب کو دیکھتا، وہ انہیں یاد کر لیتا۔

"آپ کی مما کیسی ہیں۔"

انہوں نے سنبھل کر کہنا چاہا۔

"آپ کو بھولی نہیں ہیں۔" اسجد نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔ وہ خود پر قابو نہ پا سکیں۔ بے اختیار آنسو آنکھوں سے نکلے تھے۔ میزاب کو لپٹا کر پیار کرتے ہوئے انہوں نے موقع کی نزاکت کا خیال کرتے اپنے آنسو صاف کیے تھے۔ پھر وہ باتیں کرنے لگے۔ وہ تینوں کتنی دیر بولتے رہے اور کتنی دیر چپ رہے، کسی کو اندازہ نہ ہوا۔ خود کو سنبھالتے سنبھالتے بھی انہوں نے کئی بار آنکھیں صاف کیں، اسجد کو اور میزاب کو پیار کیا۔ میزاب اس والہانہ پیار سے گھبرا رہی تھی۔ ہال میں مہمانوں کی آمد سے پہلے پہنچنے کا فیصلہ اسجد کو اب درست معلوم ہو رہا تھا۔ اسامہ نے انتظامات میں مصروف دور سے اچٹتی نگاہ ڈالی، وہ میزاب کے بھائی کے سامنے بار بار وہاں کے چکر نہیں لگانا چاہتا تھا۔

"اپنے بابا سے اجازت لے لینا۔ میں تمہارے گھر آؤں گی مگر اب کی بار میں ان کی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کروں گی۔ چاہے مجھے اسامہ کا دل ہی توڑنا پڑے۔"

انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ وہ دونوں اسی وقت کھانا کھائے بغیر واپس آ گئے تھے۔

☆☆☆

گھر سے باہر موسم کے تیور بہت خراب تھے۔ رات کے اس پہر زور و شور سے برستی بارش اور بادلوں کی گرج سب کو دہلا رہی تھی۔ بیرونی موسم کے برعکس ان کا گھر اس وقت بہت پرسکون محسوس ہو رہا تھا۔ تمام کھڑکیاں، دروازے بند ہونے کی وجہ سے لاؤنج کا ماحول ساکن تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی ان کے شوہر نے اپنی بیٹی میزاب کو یہاں بلایا تھا۔ اسجد پہلے سے وہیں موجود تھا۔ مما کو بات کی نوعیت کا اندازہ تھا سو وہ انہیں مخل کرنے کے بجائے باورچی خانے میں اپنے کام میں مصروف رہیں۔ انہیں کام مکمل کر کے آتے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی مگر میٹنگ ختم ہو چکی تھی۔ اب لاؤنج میں وہ اکیلے بیٹھے تھے۔ صوفے کی پشت سے سر ٹکائے، ہاتھ سے آنکھیں چھپائے اللہ جانے، وہ کسی سوچ میں گم تھے یا غنودگی میں تھے۔ آنکھیں چھپا لینے کے باوجود ان کے چہرے کے تاثرات عجیب کرب و تکلیف بیان کر رہے تھے۔ ان کا دل زور سے دھڑکا۔

"ان کا کیا ردعمل ہوگا؟" وہ صوفے کے پاس آئیں مگر شوہر کے وجود میں جنبش تک نہ دیکھ کر وہ انہیں مخاطب کرنے کے بجائے دانستہ باہر لان میں کھلنے والی کھڑکی تک گئیں اور ایک دم اسے کھول دیا۔ متواتر برستے پانی کا شور، بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ نے کمرے کے پرسکون ماحول کو لمحے میں تہہ و بالا کیا تھا۔ انہوں نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹایا اور بے اختیار بولتے کھڑے ہوئے۔

"کھڑکی بند کرو، مانہ بجلی سے ڈر جائے گی۔"

کھڑکی بند کرتے ہوئے انہوں نے چونک کر

اپنے شریک حیات کو دیکھا، صاحب سالوں کی نیند لے کر شاید آج جاگے تھے۔ برسوں کے بعد آج یہ نام ان کے لبوں سے سنا تھا۔ جانے اب آگے کیا ہونا تھا۔ وہ انگلیوں سے ماتھا مسلتے، سر ہلاتے مڑ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ اب ان سے کچھ پوچھنا بیکار تھا۔ نتیجہ جاننے کی خواہش لیے وہ میزاب کے کمرے کی طرف بڑھیں۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور میزاب دوپٹہ لپیٹے نم آنکھوں کے ساتھ تلاوت میں مصروف تھی۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہیں۔ پھر..... کچھ بھی پوچھنے کا ارادہ ترک کر کے اپنے کمرے میں چلی آئیں۔

کمرے کے نیم تاریک ماحول میں صاحب آنکھوں کو بازو سے ڈھانپے چت لیٹے تھے۔ اس کے باوجود وہ جانتی تھیں کہ وہ سو نہیں رہے بلکہ محض کچھ وقت خاموشی سے اپنے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں۔ وہ بھی تکیہ سیدھا کرتے اپنی جگہ پر لیٹ گئیں۔ مانہ، مانہ، مانہ..... اس نام کی تکرار ان کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ شادی شدہ زندگی کی ابتداء.....

میں جو بے اعتنائی تھی، وہ کب کی ختم ہو چکی تھی۔ ان دونوں نے ایک مثالی زندگی گزاری تھی۔ ہر دکھ سکھ میں ساتھ رہے لیکن اس وقت وہ دو محبت کرنے والے ساتھی تنہا ہی اپنی اپنی یادوں کے سفر کو نکلے ہوئے تھے۔ یادیں جو کسی جراح کے نشتر کی طرح زخم بھی خود تھیں اور مرہم بھی۔

☆☆☆

"فہیم تم اب تک مانہ کو کالج سے لینے نہیں گئے۔"

صوفے پر نیم دراز آدھا نیچے لٹکا وہ نیند میں جھول رہا تھا، جب امی نے کندھے پر ہاتھ مارنے کے ساتھ زوردار آواز میں جگایا تھا۔

"ضیا کو کہہ دیا ہے امی، وہ لے آئے گا انہیں۔"

اس نے کندھا سہلاتے نیم غنودہ آواز میں جواب دیا تھا۔

"میں پوچھتی ہوں کہ مانہ تمہاری بہن ہے یا ضیا کی، جو اس کے سر ذمہ داری ڈال دی۔ پڑھائی تمہاری ہو گئی ہے، فارغ گھر میں پڑے رہتے ہو۔ تو بہن کو لاتے کیا مصیبت ہے۔ ایک مہینے کی بات ہے، اس کا وین والا گاؤں سے آ جائے گا تو مسئلہ ہی ختم، تمہارے لیے اتنے دن بھی کالج سے لانا دوبھر ہے۔ لے کر پرائے بچے کو بھیج دیا۔"

امی غصے سے کہتی اس کے برابر میں ہی آ بیٹھیں۔ امی کا موڈ دیکھ کر وہ سیدھا ہوا اور ساری غنودگی بھلا کر دماغ کو حاضر کیا۔ فارغ بیٹھنے کا طعنہ دل پر لگا تھا سو بگڑ کر بولا۔

"حد کرتی ہیں امی آپ، ویسے تو دن رات آپ اور ابو انکل، آنٹی سے اپنے ہمالیہ سے اونچے اور سمندر سے گہرے تعلقات بیان کرتے رہتے ہیں۔ اب ذرا سا کام کہہ دیا تو پرایا بچہ بنا دیا۔ سارا بچپن اس بچے کا اسی صوفے پر اچھلتے کودتے گزرا ہے۔ آفس کے راستے میں کالج ہے۔ آرام سے لنچ کے لیے گھر آتے ہوئے لے آتا ہے مانہ اور شازیہ کو۔ اس کے پاس گاڑی ہے۔ میرے لیے کتنا مشکل ہے بائیک پر دونوں کو پھنسانا یا رکشہ کروا کر ساتھ چلنا، عجیب ہونق لگوں گا۔"

"ہونق لگنے کی کیا بات ہے۔ سواری ہونا بھی نعمت ہے۔ دونوں ہی دبلی پتلی سی ہیں۔ آرام سے بیٹھ جائیں گی۔ شروع سے ساتھ آتی جاتی ہیں۔ اب شازیہ کو اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتے۔ گھر میں فارغ بیٹھے ہو تو بول دیا ورنہ میں خود ہی جا کر لے آتی۔"

امی نے اس کے بگڑنے کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ دوبارہ فراغت کا ذکر تو کانٹا بن کر فہیم کو چبھا۔

"میں نے بھی ہزار جگہ انٹرویو دیا ہوا ہے، ہر دوسرے روز ٹیسٹ دیتا ہوں۔ نوکری مل ہی جائے گی مگر آپ مجھے فارغ بیٹھا رہنا ضرور جتائیں گی۔ امی نہیں پوری پھولگ رہی ہیں اس وقت۔"

فہیم نے خفگی سے کہا۔ امی جو اسے مزید ڈانٹنے کے موڈ میں تھیں۔ اس کی آخری بات پر بے اختیار

ہنس دیں۔ جانتی تھیں بیروزگاری کا دکھ آج کل اس کے سر پر سوار ہے، پھر بھی وہی بات بار بار کہہ گئیں تو اسے برا لگنا ہی تھا۔ بچپن سے ہی پھپھو کی بیٹی عینی سے اس کی بات طے تھی۔ دونوں طرف سے آتش عشق برابر جل رہی تھی۔ اس منگنی کو باضابطہ شکل دے کر شادی کے انجام تک پہنچانے کے لیے محض فہیم کی نوکری کا انتظار تھا۔ اب کی بار پھپھو آئیں تو جتا بھی گئیں کہ بس عینی کے بھائی راشد کا انتظار ہے۔ اس کے سعودیہ سے آتے ہی وہ دونوں بہن بھائیوں کی اکٹھے شادی کر دیں گی۔ بڑی بیٹی کے فرض سے تو وہ اس سے بھی جلد فارغ ہو گئی تھیں۔ پھپھو کی بات پر اپنے شاندار تعلیمی ریکارڈ کے باوجود فہیم مزید پریشانی کا شکار ہو گیا تھا۔ اسے اچھی جاب ملنے کی پوری امید تھی لیکن "نہ مل سکی تو" کا خوف ایک ڈراؤنے سپنے کی طرح اسے ڈراتا۔

امی کو ہنستا دیکھ کر فہیم نے دل میں آنے والا وسوسہ ان کے سامنے رکھا۔

"امی اگر نوکری نہیں ملی تو پھپھو رشتہ توڑ دیں گی؟" ننھے بچے کی طرح خوف بھرے معصومانہ انداز میں کہے اس سوال پر امی بے اختیار تسلی آمیز انداز میں بول اٹھیں۔

"ارے کیوں نہیں ملے گی نوکری اور رشتہ تو تمہاری پھپھو توڑ ہی نہیں سکتیں۔ تمہارے دادا، دادی نے ان کی فرمائش پر ہی جوڑا تھا۔" ان کی بات پر فہیم کو یک گونہ تسلی ہوئی، وہ مطمئن نظر آنے لگا۔

انہوں نے ایک افسوس بھری نظر فہیم پر ڈالی اور تاسف سے سر ہلایا۔ وہ عینی کے لیے اتنا پاگل نہ ہو رہا ہوتا تو انہیں بیٹے کی ماں ہونے کے باوجود نند کے نخرے نہ برداشت کرنے پڑتے۔

وہ معاملہ فہم سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ ہمیشہ بڑوں کو عزت دی۔ ان کی ساس ایک دبنگ خاتون تھیں۔ جب تک حیات رہیں، گھر کا کنٹرول مکمل طور پر ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس وقت پھوپھا کی معمولی نوکری تھی۔ حالات ایسے قابل رشک نہ تھے۔ انہوں نے بیٹی کی پریشانی دور کرنے کے لیے بچپن میں ہی پوتے اور نواسی کا رشتہ طے کر دیا۔ بیٹی کے روشن مستقبل کا سوچ کر بیٹی داماد نے دل و جان سے یہ رشتہ قبول کر لیا۔ بیٹا، بہو بھی کہے میں تھے۔ اس لیے کسی کو اعتراض نہ ہوا۔ پھر عینی بچپن ہی سے اتنی حسین تھی کہ سب دل و جان سے اس کے طلبگار ہوتے۔ فہیم اور عینی نے بچپن سے اپنا نام ایک ساتھ سنا تو فطری محبت دلوں میں پروان چڑھ گئی۔ وقت آگے گزرا تو عینی کا بھائی راشد ڈپلومہ کر کے سعودیہ چلا گیا۔ بڑی بیٹی نوری کی انہوں نے انٹر کے بعد ہی شادی کر دی۔ پھوپھا ریٹائرڈ ہوئے تو اپنے بھائی کے ساتھ مل کر کاروبار شروع کیا تھا۔ اللہ نے برکت ڈالی تو دونوں میں ترقی کر گئے۔ اب ان کی توجہ کا تمام تر مرکز عینی تھی۔ قسمت کا پلڑا جھکنے کے بعد بچپن سے قائم رشتہ اب بے وقوفی محسوس ہوتا۔ حسن، تعلیم، جہیز کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ رشتے دھڑا دھڑ آتے۔

پھوپھا کا رجحان آہستہ آہستہ خرم کی طرف ہونے لگا۔ خرم پھوپھا کا اکلوتا بھتیجا تھا اور کاروبار میں باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ خرم اور عینی کی شادی ہو جاتی تو عینی کا مستقبل اور کاروبار دونوں محفوظ ہو جاتے مگر کچھ بیٹی کے دل کا خیال تھا اور کچھ زبان دینے کی مجبوری، ابھی وہ اتنے بے دید نہیں ہوئے تھے کہ علی الاعلان قائم یہ رشتہ بلاوجہ توڑ دیتے۔

☆☆☆

شازیہ کو اس کے گھر کے دروازے کے سامنے اتار کر ضیا نے گاڑی آگے بڑھائی اور بیک ویو مرر میں رومانہ کو دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کے چہرے کا ایک رخ دکھائی دے رہا تھا مگر وہ اس کی طرف بالکل بھی متوجہ نہیں تھی۔

ضیاء نے نظر دوبارہ سامنے کر لی۔ پورا راستہ ان کی کوئی بات نہ ہوئی تھی تو اب کیا ہوتی۔ ایک گلی کا فاصلہ تھا۔ لمحوں میں وہ اپنے گھر کے سامنے تھے۔ کہنے کو وہ پڑوسی تھے مگر دونوں خاندانوں میں دوستانہ اتنا گہرا تھا کہ گاڑی رکنے پر فائل اٹھا کر باہر نکلتے ہوئے مانہ

نے شکریہ کہنے کی بھی زحمت نہ کی۔ ضیا ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

خود سے زیادہ بے نیاز محبوب کا خیال ہونا ہی شاید یکطرفہ محبت کہلاتا ہے۔ دین والے نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اسے گاؤں جانا ہے، سب اپنا بندوبست کرلیں۔ فہیم کے منہ سے یہ ذکر سنا تو صرف مانہ کی خاطر اس نے بظاہر سرسری انداز میں آفر کی تھی۔

"آج کل میرا معدہ مسئلہ کر رہا ہے۔ باہر کا کھانا ہضم نہیں ہوتا، دوپہر میں گھر آؤں گا۔ تم چاہو تو میری گاڑی لے جانا۔"

فہیم نے فوراً یہ آفر قبول کی تھی۔ یہ اور بات کہ ضیاء کے آنے کے اور مانہ کے کالج کی چھٹی کے اوقات یوں ملے کہ یہ ذمہ داری ضیا کو ہی اٹھانی پڑ گئی۔ فہیم اس کا بہت ممنون ہوا تھا اور وہ اپنی بے ساختہ مسکراہٹ چھپائے بظاہر سنجیدگی سے اسے سنتا رہا۔ اب اس بے نیاز کے لیے ضیا کو روزانہ یہ سفر طے کرنا تھا جو اسے نظر انداز کیے اپنے گھر کے اندر بھی جا چکی تھی۔

☆☆☆

مین گیٹ کھول کر اندر آتی شازیہ نے بریانی کی خوشبو محسوس کی تھی۔ اس کے چلتے قدم مزید سست ہوئے، وہ جانتی تھی کہ بریانی یقیناً ان کے گھر نہیں بنی۔ مہینے کے ان دنوں میں امی، ابو کی دوائیاں پوری کرنے کے لیے ساری بچت کھانے سے کرتی تھیں۔ بڑے سے اس گھر میں مالک مکان کا درجہ رکھنے کے باوجود وہ بہت مختصر حصے میں رہتے تھے۔ اس کے قدموں کی رفتار بریانی کی خوشبو نے نہیں بلکہ کسی سوچ نے تھامی تھی۔

عرصہ ہوا ایک حادثے میں ابو کے بستر پر پڑ جانے کے بعد امی نے مختصر سا گھر اپنے استعمال میں رکھ کر باقی کرائے پر چڑھا دیا تھا۔ یہی ان کا بنیادی ذریعہ آمدنی تھا۔ پڑھی لکھی نہ تھیں کہ نوکری کرتیں اور نہ اس وقت سلائی میں مہارت حاصل تھی۔ یہ اور بات کے گزرے سالوں میں بڑھتے اخراجات کے جن کو قابو رکھنے کے لیے سلائی کر کر کے وہ بہت کچھ سیکھ گئی تھیں۔

بوجھل قدموں سے چلتی وہ اندر داخل ہوئی۔ اپنی پژمردگی چھپائے اس نے زوردار سلام کیا اور بنظر غائر منظر نامے کا جائزہ لیا۔ اس سے بڑی بہن فوزیہ سامنے ہی سلائی مشین رکھے کچھ سی رہی تھی۔ امی، ابو کو تکیوں کے سہارے بٹھا کر کھانا کھلا رہی تھیں۔ سب نے شاید مدھم انداز میں سلام کا جواب دیا تھا۔ اس تک کسی کی آواز نہیں آئی۔ کالج بیگ ایک طرف رکھتے وہ باورچی خانے سے پانی کا گلاس بھر کر فوزیہ کے قریب آ بیٹھی۔ گلاس لبوں تک لے جاتے اس نے سرسری سا پوچھا۔

"آپی آئی تھیں؟ رکی نہیں۔"

فوزیہ نے سلائی مشین روک کر اسے بغور دیکھا۔ شازیہ کی بڑی بڑی آنکھیں اس پر ٹکی ہوئی جواب کی منتظر تھیں۔ سوال، امید، خوف کیا کچھ نہ تھا ان آنکھوں میں۔ اس نے آنکھوں کی تحریر پڑھی پھر دانستہ ایک مسکان سجا کر بولی۔

"آئی تھیں، رکنے کے لیے بعد میں آئیں گی اور وہاں بات نہیں بنی۔" اس کے اتنے سیدھے جواب پر شازیہ خجل سی ہو گئی۔ "میں کپڑے بدل لوں۔" وہ اٹھ گئی۔ کپڑے بدل کر کھانے کی ٹرے اٹھائے وہ دوبارہ وہیں آ بیٹھی۔ فوزیہ اپنے کام میں مگن تھی اور وہ سست روی سے کھانا کھاتے اسے دیکھ رہی تھی۔ گندمی رنگت، سلیقے سے سنورے بال، صاف نقوش وہ اگر بہت حسین نہ تھی تو بدشکل بھی نہیں تھی۔

بی ایس سی کرنے کے بعد اس کا ارادہ جاب کا تھا مگر امی اس کی فوری شادی پر تلی بیٹھی تھیں۔ انکار کا کوئی اختیار ان کے پاس نہ تھا سو فوزیہ خاموشی سے ماں کے فیصلے پر سر جھکائے اچھے رشتے کے انتظار میں تھی۔ ان کی امی کو بیٹیوں کے اوصاف سے بھی آگاہی تھی اور اپنے حالات سے بھی۔ اسی لیے بڑی بیٹی کا رشتہ طے کرتے وقت بھی لڑکے کی تعلیم اور شکل

کے بجائے شرافت و ہنر کو فوقیت دی۔ مختصر سے جہیز کے ساتھ سادگی سے شادی کر دی۔ آج وہ اپنے گھر میں خوش باش تھی۔ فوزیہ کے لیے بھی ان کا یہی ارادہ تھا۔ جہیز یا اس گھر کی لالچ میں آنے والے رشتوں کو وہ خود ہی منع کر دیتی تھیں یا ان کے گھر سے ٹپکتی لاچارگی اور باپ کی بے بسی دیکھ کر لوگ منع کر جاتے۔ انہیں اپنی بیٹیوں کے لیے ایسا رشتہ درکار تھا جو بنا جہیز یا میکے کی مضبوط سپورٹ کے اپنی بیوی کو عزت و محبت دے۔

☆☆☆

"پوسٹ مین" بیل کی آواز کے ساتھ ہی پوسٹ مین کا مخصوص لہجہ سنائی دیا۔ کچن میں کام کرتی امی دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتیں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی تھیں۔ سائن کر کے رجسٹری وصول کرتے انہوں نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ جب سے فہیم نے نوکری کی کوششیں تیز کر دی تھیں۔ گھر میں ڈاک زیادہ تر فہیم کی ہی آتی تھی۔ پہلے پہل وہ ایک جگہ انٹرن شپ بھی کر رہا تھا لیکن اب تو اتنی جگہ اپلائی کر چکا تھا کہ ہر دوسرے روز انٹرویو کے لیے ہی جانا ہوتا ورنہ گھر میں سویا رہتا۔ لفافے پر سرکاری مہر دیکھ کر وہ اسے کہیں رکھنے کا ارادہ موقوف کرتی اس کے کمرے میں آ گئیں۔ فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے ٹیسٹ، ڈاکیومنٹ ویریفکیشن، انٹرویو ہر مرحلے کو کلئیر کرنے کے بعد وہ روز ان سے دعا کرواتا تھا کہ امی بس اب لیٹر آ جائے۔

"فہیم، یہ دیکھو، یہ کہاں سے آیا ہے۔" اسے جھنجھوڑتے انہوں نے دبے دبے جوش سے کہا۔ ان کے انداز پر فہیم تیزی سے اٹھا تھا۔ لفافے پر تحریر پتا پڑھ کر فہیم کا دل تیزی سے دھڑکا وہ لمحہ بھر رکا۔ پھر امی کو محو انتظار دیکھ کر بسم اللہ پڑھتے ہوئے لفافہ چاک کیا تھا۔ یہ اس کا اپائنٹمنٹ لیٹر تھا۔ اس نے زوردار نعرہ لگایا۔

"ہرا، امی مجھے نوکری مل گئی۔"

"الحمدللہ" امی نے خوشی سے بھرائی آواز میں کہا۔

"میں شکرانے کے نفل ادا کر لوں، تم بھی فوراً نفل پڑھو۔ پھر مٹھائی لے کر آنا۔" وہ اسے ماتھے پر پیار کر کے ہدایت دیتی کہنے لگیں۔ "ابو کو فون پر مت بتایئے گا۔ گھر آئیں گے تو میں خود بتاؤں گا۔" اس نے سرخوشی سے کہا تو وہ سر ہلاتی نکل گئیں۔ گھنٹے بعد وہ نک سک سے درست مٹھائی کے دو ڈبے لیے ان کے سامنے کھڑا تھا۔

"دوسرا ڈبہ کس کے لیے۔" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"پھپھو کے گھر چلیں مٹھائی دینے؟" وہ جھجکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ مسکرا کر سر ہلا گئیں۔ جانتی تھیں کہ وہ عینی سے ملنے کا بہانہ چاہ رہا ہے۔ فون پر تو بات ہو جاتی تھی لیکن انہیں ملاقات کا موقع کم ہی ملتا تھا۔

"مانہ آنے والی ہو گی کالج سے۔" انہیں خیال آیا۔

"ہم جلدی آ جائیں گے۔ دیر بھی ہو گئی تو آنٹی کے پاس گھر کی چابی ہے نا۔" فہیم نے پروگرام ملتوی ہونے کے ڈر سے جلدی سے کہا۔ وہ مطمئن ہوتی کھڑی ہو گئیں۔ یوں بھی کافی دن سے وہاں کا چکر نہیں لگا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ پھپھو کے عالیشان گھر کے سامنے تھے۔

پھپھو اور عینی نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا تھا۔ مٹھائی کا ڈبا پکڑاتے ہوئے انہوں نے فہیم کی نوکری کی خوشخبری سنائی اور مبارکباد وصول کی۔ ماحول میں تھوڑا تناؤ تب آیا، جب غیر متوقع طور پر پھوپھا سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے سرد چہرے کے ساتھ یہ خبر سنی اور فہیم سے ترقی کے مواقع اور اندازاً تنخواہ پر بات کرتے ہوئے اسے سمجھاتے رہے کہ ترقی تو بس کاروبار کی مرہون منت ہے۔ نوکری تو نری غلامی ہے۔ فہیم سر ہلا کر تابعداری سے سنتا رہا، ہاں میں ہاں ملاتا انہیں اپنے مستقبل کے ارادوں میں پارٹ ٹائم کاروبار کرنے کی یقین دہانی کرواتا رہا مگر اس وقت اسے برا لگا جب وہ اسے یہ

بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
نومبر 2019
فروری 2020
www.pklibrary.com
Part 2

سنانے لگے کہ عینی پر آسائش ماحول کی عادی ہے۔ اس کے چہرے پر تکدر کے تاثرات ابھر آئے۔ عینی نے بات بدلتے ہوئے آگے بڑھ کر مٹھائی کا ڈبہ کھولا لیکن وہ معذرت کرتے چلے گئے۔ عینی نے پھپھو کے آگے ڈبا کیا۔ پھپھو نے گلاب جامن اٹھا کر منہ میں رکھتے ہنس کر کہا۔

''مٹھائی کا ڈبہ تو اتنا بڑا لے آئے، جیسے فسٹری ملی ہو۔'' فہیم جلبلا کر رہ گیا۔ من پسند نوکری ملنے پر خوشی سے اس کا ٹھکانا نہ تھا، اس پر پھپھا کے سوالات اور اب پھپھو کے تبصرے۔

''بنا سفارش کے سرکاری نوکری مل جانا بھی فسٹری کے برابر ہی ہے۔ پردیس میں مزدوریاں تو نہیں کرنی پڑ رہی نا۔''

فہیم کے جواب پر پھپھو کے چہرے کا رنگ بدلا۔ راشد مزدوری نہیں کرتا تھا مگر اس کی تعلیم فہیم سے کم تھی۔ امی نے اپنی صلح جو فطرت سے مجبور ہو کر فوراً گفتگو کا رخ موڑا۔ پھپھو بادل نخواستہ انہیں جواب دینے لگیں۔

''میں نے لان میں نئے پودے لگوائے ہیں۔ تمہیں دکھاتی ہوں۔'' عینی نے معاملہ سنبھالنے کے لیے فہیم کو منظر سے غائب کرنا مناسب سمجھا۔

''حد ہے فہیم، کیوں جھگڑے پیدا کرتے ہو۔ پاس ٹکا نہیں اور مزاج سولہ آنے۔ امی نے کچھ کہہ دیا تو سن لیا کرو۔'' باہر آتے ہی عینی نے اپنی جھنجھلاہٹ نکالی۔

''وہ لوگ سوچ سمجھ کر نہ بولیں، بس میں سنتا رہوں۔''

فہیم نے قدرے تندی سے اسے دیکھا۔ دل کے ہاتھوں مجبور تھا مگر اس کا یوں جتانا بھی اچھا نہیں لگا تھا۔

''میری خاطر برداشت کر لو نا۔ نانی کی بات کا پاس ہے ورنہ ابو کو تو ویسے ہی اس رشتے میں زیادہ دلچسپی نہیں۔ میں ضد کر کے مر جاتی تو بھی وہ میرا رشتہ خرم سے ہی کرتے۔''

عینی روہانسی ہو گئی۔ والدین بھی ٹھیک لگتے تھے اور فہیم کو کچھ کہنا یا چھوڑنا بھی مشکل تھا۔ وہ محبت سے مجبور اس کے ہزار نخرے اٹھاتا تھا مگر کوئی اور کچھ کہتا تو چڑ جاتا۔ عینی کے رونے والے تاثرات دیکھ کر فہیم نے سر جھٹک کر گویا سارا غصہ ایک طرف پھینکا۔ اتنے دن بعد اسے دیکھا تھا، وہ اس ملاقات کا اختتام تلخی پر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس سے محبت کرتی تھی، اس کے لیے بس یہی کافی تھا۔ شادی ہو جاتی تو سب مسئلے حل ہو جاتے۔

''تم مر جاتی تو میں کیا کرتا یار، ہر جمعے کو باقاعدگی سے دادی کا احسان چکانے ان کی قبر پر جاتا ہوں، فاتحہ پڑھتا ہوں۔'' اس نے ماحول خوش گوار کرنے کے لیے شرارت سے کہا تو عینی بھی ہنس دی۔

☆☆☆

امی کا اندازہ درست تھا، انہیں ٹھیک ٹھاک وقت لگ گیا۔ عینی نے انہیں دوپہر کا کھانا کھائے بنا نہیں آنے دیا تھا۔ بیٹی کی خاطر پھپھو بھی بہت اچھی طرح مہمان نوازی کر رہی تھیں۔ اتنے اصرار کے بعد اٹھ کر آ جانا انہیں اچھا نہیں لگا۔ مانہ کو بند دروازہ دیکھ کر شدید غصہ آیا تھا۔ اس کا ارادہ آنٹی سے چابی لینے کا تھا مگر آنٹی نے اسے پیار بھرے انداز میں جھڑک دیا۔ ''منہ ہاتھ دھو کر آؤ، میں کھانا لگا رہی ہوں۔ تمہیں خالی گھر میں بیٹھ کر ختم پڑھنا ہے۔'' ان کے بے ساختہ انداز پر وہ مسکرا کر رہ گئی۔ فریش ہو کر جب وہ باورچی خانے میں آئی تو آنٹی توے پر پراٹھا سینک رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر خوش گواری سے بولیں۔ ''ضیا کی فرمائش پر بھنڈیاں بنائی تھیں آج، ابھی کھانا لگایا تو یاد آیا تم بھنڈی کھاتی ہی نہیں۔ میں نے کباب تل کر پراٹھا بنا دیا ہے۔''

بھنڈی اسے واقعی ناپسند تھی لیکن یوں اپنے لیے اہتمام دیکھ کر وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

''میں کھا لیتی آنٹی، آپ نے خوامخواہ تردد کیا۔'' اس نے کمزوری آواز میں کہا۔

''پتا ہے مجھے، تم کیسے کھاتیں۔ چلو یہ کباب کی پلیٹ لے جاؤ، میز پر پانی بھی رکھو، رائتے میں نمک چکھ لینا، میں پراٹھے لے کر آتی ہوں۔'' انہوں نے کہا تو وہ تکلف بے کار جان کر کام کرنے لگی۔ چند سال پہلے تک وہ اسی گھر میں پائی جاتی۔ آنٹی کو بیٹی کا بہت شوق تھا۔ اس کے خوب نخرے اٹھاتیں۔ وہ پڑھی لکھی تھیں، تو ضیا کے ساتھ ان دونوں بہن بھائیوں کو بھی پڑھا دیا کرتیں۔ پھر شرارت کرنے، فلمیں دیکھنے لڑکے فہیم کے کمرے میں گھس جاتے اور مانہ آنٹی سے گڑیا کے کپڑے سلوانی، تو کبھی امی سے بیڈ شیٹس کڑھوانی۔ اس کی گڑیا کی شادی ہمیشہ بہت دھوم دھام سے ہوتی۔ شازیہ اپنا گڈا لے کر آتی تو امی لڑکے والوں کی طرف سے زیور ڈالتیں۔ شادی کا کھانا آنٹی پکاتیں تو ولیمہ امی ارینج کر دیتیں۔

امی کی ایک ہی بہن تھی۔ وہ بھی حالات کی ستم ظریفی کا شکار۔ ان سے جتنا بن پڑتا، بہن اور بھانجیوں کا خیال رکھتیں۔ رفتہ رفتہ مانہ نے گڑیا کی شادیاں کرنا چھوڑ دی۔ اب وہ اور شازیہ خود ہی پڑھ لیتے تو یہاں آنا جانا بھی کم ہو گیا۔

ضیا نے کرسی پر بیٹھتے دھلے چہرے کے ساتھ مانہ کو برتن رکھتے دیکھا۔ وہ پانی کی بوتل رکھ کر گئی تھی۔ بلا ارادہ اس نے پانی گلاس میں نکال لیا۔ نظر دوبارہ اس پر جا ٹھہری تھی۔ ایسے اس کے گھر میں چلتی، پھرتی کام کرتی وہ کتنی اچھی، اپنی سی لگ رہی تھی۔ ضیا نے نظر چراتے سالن کا ڈونگا سامنے کیا۔ خوش رنگ بھنڈیاں دیکھ کر بھوک چمک اٹھی۔ یہ اس کی پسندیدہ سبزی تھی۔ اس نے پلیٹ میں سالن نکالا۔ وہ کباب کی پلیٹ لے کر آئی۔ اس کے پیچھے ہی آنٹی بھی پراٹھے لیے چلی آئیں۔

''لو بھئی ضیا تم اپنی بھنڈیاں کھاؤ۔ میں تو مانہ کے ساتھ کباب پراٹھا کھاؤں گی۔'' انہوں نے رائتے کا پیالہ ضیا کے سامنے کیا۔ ''یہ کیا نا انصافی ہے بھئی۔'' وہ نوالہ منہ میں ڈالتے رک کر حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔

''نا انصافی کیسی، مانہ کو بھنڈی نہیں پسند ہے تو کچھ تو کھائے گی۔'' آنٹی اچھے میزبان کی طرح اسے کھانا سرو کر رہی تھیں۔ ضیا نے سر ہلاتے نوالہ منہ میں ڈالا۔ بھنڈی ہمیشہ کی طرح بہت مزیدار تھی۔ مگر جانے کیا سوچ کر اس نے ایک کباب بھی اٹھا کر پلیٹ میں رکھ لیا۔ بچپن کے ساتھ سے پیدا انسیت اور پھر رنگ بدلتی محبت اب دل میں گہرائی تک جڑیں گاڑ چکی تھی۔ اس بے پروا کو معلوم بھی نہیں تھا کہ کوئی خود کو اس کے رنگ میں رنگنے کو بے تاب تھا۔

☆☆☆

''آپ لوگ تو ابھی سے مجھے بھول گئے، بھابھی آنے کے بعد کیا ہوگا۔''

آئس کریم کھاتے مانہ کی زبان بھی چل رہی تھی۔ پھپھو کے گھر سے واپسی پر گھر خالی دیکھ کر امی اور فہیم بھائی ادھر ہی آ گئے تھے۔ ان کے یوں اچانک گھر سے غائب ہونے کی وجہ جان کر جہاں مانہ کو بھائی کو نوکری ملنے کی خوشی ہوئی، ساتھ ہی اپنے دیر سے جاننے پر شکوہ بھی ہو گیا۔

''مانہ تو پکی نند بنے گی، ابھی سے نخرے شروع۔'' فہیم نے ہنستے ہوئے حساب چکایا۔

''کہہ تو ٹھیک ہی رہی ہے۔ ہمارا منہ میٹھا کروائے بنا پھپھو کے پاس بھاگ گئے تم۔'' آنٹی نے بھی مانہ کا ساتھ دیا۔

''صرف منہ نہیں میٹھا کروانا، آپ کو تو کھانا کھلاؤں گا نا۔ آج رات گھر میں دعوت رکھتے ہیں۔'' فہیم نے آنٹی کو تسلی دیتے ہوئے ماں کی طرف مدد طلب نگاہوں سے دیکھا۔

''ہاں بھئی، آج رات کا کھانا ہمارے گھر کھاؤ۔ مل بیٹھے ہوئے بہت عرصہ ہی ہو گیا ہے۔ بتاؤ کیا بنانا ہے۔'' امی نے فوراً اس کی بات آگے بڑھائی۔

''نہیں بھئی، آپ کیوں بنائیں گی۔ فہیم خود ڈنر کروائے۔''

ضیا نے بھی گفتگو میں حصہ ڈالا۔ ''ساحل پر

چلتے ہیں۔ پکنک اریج کرلیں۔ میں شازیہ لوگوں کو بھی بلا لیتی ہوں۔'' مانہ بھائی کو دیکھتی چہکی تو فہیم سر پکڑ کر رہ گیا۔

''نوکری ملی ہے ابھی، تنخواہ نہیں جو مجھے رگیدنے پر تلے ہوئے ہو۔'' فہیم نے بھرپور احتجاج کیا

''آج گھر میں کھا لیتے ہیں، باہر جانے کا بعد میں دیکھیں گے۔'' آنٹی نے بھی فہیم کا ساتھ دیا۔ ''تو پھر باربی کیو کرتے ہیں چھت پر۔'' ضیا کے دماغ سے دھڑا دھڑ آئیڈیاز برآمد ہو رہے تھے۔ آخر باربی کیو کا پروگرام فائنل ہوا۔

تکے لڑکوں نے بنانے تھے مگر رات کی ٹھنڈی ہوا اور چاند کی روشنی میں بیٹھنے سب ہی اوپر چلے آئے۔ ابو اور انکل اپنی سیاسی باتوں میں مصروف تھے تو آنٹی اور امی سسرالی مسائل میں۔۔ آنٹی کے اپنے رشتے دار تو یہاں نہیں تھے مگر دونوں گھرانوں کے دیرینہ تعلقات کے پیش نظر وہ امی کی نند کو نند اور بہن کو بہن کی طرح ہی ٹریٹ کرتی تھیں۔ دونوں خواتین کے درمیان پھپھو لوگوں کا بدلتا مزاج موضوع بحث تھا۔

فہیم کے ساتھ سیخوں میں تکے پروتے، کوئلوں کو ہوا جھلتے ضیا اچٹتی سی نظر ریڈیو کے ساتھ مصروف مانہ پر بھی ڈال لیتا۔ وہ اس پارٹی کو اپنی ٹریٹ قرار دے کر کسی قسم کی مزید مدد سے صاف انکار کر چکی تھی۔

آسمان پر بادل چھائے تھے۔ ہوا کافی تیز تھی۔ اسی لیے انہوں نے انگیٹھی چھت کے ڈھکے ہوئے حصے پر لگائی تھی۔ چارپائیوں اور کرسیوں کو دھوپ کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے یہیں رکھا جاتا، کپڑے بھی یہیں ایک کونے میں دھوئے جاتے مگر اس وقت چارپائی اور کرسیاں کھلی چھت پر رکھے باقی سب ہوا میں بیٹھے تھے۔ جبکہ وہ دونوں کونے میں انگیٹھی کو ہوا جھلتے مظلومیت کی مثال قائم کر رہے تھے۔ اتنی دور سے امی لوگوں کے پیچھے کہیں بیٹھی وہ اسے صاف دکھائی بھی نہیں دے رہی تھی۔ کام میں مصروف ضیا کا ذہن بار بار مانہ میں الجھتا۔ اس کے ساتھ زندگی بتانے کی خواہش، اس کے سنگ ان خوبصورت لمحوں اور موسم سے لطف اندوز ہونے کی تمنا دل میں بڑھتی جا رہی تھی۔ دل سے مجبور ہو کر وہ اسے دیکھنے کے لیے بلا ارادہ چھت کے بیچ جا کھڑا ہوا۔

''میں ذرا ہوا کھا لوں۔'' تکوں کے ساتھ الجھتے فہیم نے اسے سوالیہ دیکھا تو وہ سرسری سا بولا۔

''ہوا ہی کھانا پھر، یہ تو میں تمہیں نہیں دینے والا۔'' فہیم نے واحد مددگار کو جاتے دیکھ کر دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ ضیا کچھ کہے بنا ہنس دیا۔ یہاں سے شہر دل کی وہ ملکہ صاف نظر آ رہی تھی۔

''بارش'' ایک دم مانہ خوشی سے چیخی۔ ہلکی ہلکی پھوار شروع ہو چکی تھی۔ سب ہی شیڈ کے نیچے سمٹ آئے۔ مانہ کرسی شیڈ کے نیچے رکھ کر بیٹھی ہاتھ بڑھا کر موسم انجوائے کر رہی تھی۔ ایک دم موسم نے رنگ بدلا۔ بارش تیز نہیں تھی مگر بجلی چمکنے سے منظر روشن ہو گیا۔ بادل گرجنے کی تیز آواز پر مانہ امی کے پاس بھاگی۔

''بچوں والی حرکتیں مت کرو بیٹا، کچھ نہیں ہوتا۔'' اس کے یوں ڈرنے پر ابو نے ڈپٹا۔ ضیا حیرت سے اپنی امی کے ساتھ چپکی مانہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس ذرا سی گرج، چمک میں ڈرنے والی کیا بات تھی بھلا۔

''آپ لوگ نیچے چلے جائیں۔ ہم بنا کر لے آتے ہیں یا انگیٹھی ہی نیچے لے آتے ہیں۔ اس موسم میں یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں۔'' فہیم اسے انگیٹھی دیکھنے کا کہہ کر امی کے پاس گیا۔ ابو لوگوں نے اس کی آفر مسترد کر دی تھی۔ سیخوں سے اترتے تکے کھانے میں جو مزا تھا وہ ہاٹ پاٹ سے نکال کر کھانے میں کہاں ملتا۔ مگر مانہ فوراً کھڑی ہوئی تھی۔ فہیم امی، آنٹی کو بصد اصرار نیچے چھوڑ کر آیا تھا۔

''بیٹھے رہتے اوپر ہی سب۔ اب کہاں بنا بنا کر

نیچے دیتے رہیں گے۔" ضیا نے کوفت سے کہا تھا۔
"ابھی چیخیں مارنا شروع کر دی تھیں مانہ نے۔ بادل گرجے یا بجلی چمکنے سے بہت ڈرتی ہے۔ ابو اس کے ڈرنے پر ڈانٹتے ہیں۔ کھڑکیاں، دروازے بند کر کے کمرے میں بٹھا کر آیا ہوں تاکہ سکون سے کھا تو لے۔" فہیم نے بہن کی محبت سے لبریز لہجے میں بتایا۔ برستا مینہ جو مانہ کو خوش دیکھ کر اچھا لگ رہا تھا۔ اب ضیا کو زہر لگ رہا تھا۔ بادلوں کا شور آج سے پہلے اسے کبھی اتنا برا نہیں لگا تھا۔ کیا ہوتا جو بارش کن من، کن من بنا شور کیے بوندا باندی بن کے برستی رہتی اور وہ چہکتی چڑیا کی طرح سرشار اس کے سامنے ہی رہتی۔

☆☆☆

وقت نے خوب صورت کروٹ لی تھی۔ آج کل خوشخبریاں ایک کے بعد ایک مل رہی تھیں۔ فوزیہ کا رشتہ طے ہونے کی خبر بھی انہیں خوش کر گئی۔
"ماشاء اللہ، اللہ خوشیوں کا وقت لائے۔ پھر کیا ارادہ ہے۔ کب کرنی ہے شادی۔"
امی کا لہجہ دلی محبت و خلوص کا عکاس تھا۔ مطمئن نظر آتے خالہ، خالو اور ماحول میں پھیلی خوشگواریت مانہ کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔
"بس اگلے مہینے کا پہلا جمعہ رکھ لیا ہے۔ دراصل لڑکے کی ایک ہی بہن ہے۔ والدہ حیات نہیں ہیں تو اس کے والد صاحب دونوں بچوں کی ایک ساتھ شادی کرنا چاہتے ہیں۔" خالہ نے تفصیل بتائی۔
"اتنی جلدی خالہ، ہال مل جائے گا۔" مانہ نے بے اختیار دخل دیا۔ ساتھ ہی سب کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر شرمندہ بھی ہو گئی۔ بڑوں کی بات میں بولنا بنتا نہیں تھا۔
"ہال نہیں کرنا بیٹا۔ بہت مختصر بارات آئے گی۔ ہمارے بھی اتنے مہمان نہیں، گھر کے سامنے شیٹ لگا لیں گے۔"
خالہ نے حسب عادت مسکرا کر جواب دیا۔

پے در پے مشکلات انہیں صبر کے اس اعلیٰ مقام پر لے آئی تھیں کہ وہ ہر تکلیف مسکرا کر ٹال دیتیں۔ مانہ سر ہلاتی وہاں سے اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔ اب اسے شازیہ سے ساری معلومات لے کر فوزیہ سے چھیڑ چھاڑ بھی تو کرنی تھی۔
"فکر بالکل مت کرنا، فہیم اور اس کے ابو ایک، دو دن میں آئیں گے۔ کام وغیرہ بتا دینا، تمام انتظام سنبھال لیں گے۔ ابھی تو بس تمہارا فون سنا تو رہ نہ پائی اور فوراً چلی آئی۔" امی نے بہن کو تسلی دی۔
"فکر کیسی، اللہ سب بنانے والا ہے اور بھائی صاحب نے تو ہمیشہ چھوٹی بہنوں کی طرح خیال رکھا ہے۔ نازیہ کی شادی میں بھی فہیم اور وہ اس کا دوست ضیا بھاگ بھاگ کر سارے کام کرتے رہے۔ بلاؤں گی میں ضیا کی ماں کو بھی اور کون سے رشتے دار ہیں میرے۔" خالہ نے ہمیشہ کی طرح اللہ توکل کرتے سجاؤ سے کہا۔ ان کا لہجہ تشکرانہ تھا۔ اللہ کے بعد بہن، بہنوئی کا ہی سہارا تھا۔ جو ہر موقع پر کام آتے۔
"مانہ کی پھپھو کو بھی بلا لینا۔ راشد واپس آ گیا ہے۔ اب اس کے لیے رشتہ دیکھتی پھر رہی ہیں۔"
امی نے دھیمے انداز میں کہا۔ خالہ ان کی بات میں چھپے مقصد کو جان کر مسکرائیں۔
"بلانا تو ہے۔ آپ کی اکلوتی نند ہے اور فہیم کا بھی سسرال ہے بھئی۔ یہ اور بات کہ انہیں ہم غریبوں کے گھر آنا گوارا ہو یا نہیں۔ بیٹے کا رشتہ بھی وہ ہم پلہ لوگوں میں ہی کریں گی۔"
"بس جانے بھی دو۔ ایسی بھی بات نہیں۔ روپے پیسوں سے عزت نہیں بنتی۔ خاندانی لوگوں کے طور طریقے الگ ہوتے ہیں۔ کم ظرف ہوتے ہیں جو پیسہ آتے ہی ماش کے آٹے کی طرح اینٹھ جاتے ہیں۔" امی ناک چڑھا کر بولیں۔
"تمہارے بھائی کے ساتھ گئی تھی میں راشد سے ملنے۔ تمیز سے ملا۔ اچھا بچہ ہے۔ بس باپ تھوڑا

اکھڑ ہے۔ جلدی ہی شادی کا کہہ رہے تھے وہ۔ میرا ارادہ تھا کہ سال، دو سال رک جاتے تو مانہ کی بھی ساتھ ہی کر دیتی لیکن تمہارے بھائی نے منع کر دیا۔ کہتے ہیں جس کا جب نصیب ہو۔"

اب وہ دونوں بہنیں اپنی باتوں میں لگی تھیں۔

"تم نے بتایا ہی نہیں مانہ کہ عینی بھابھی کے بھائی آ گئے۔" چائے کی ٹرے لا کر رکھتے ہوئے شازیہ نے ان کی گفتگو سنی تو جا کر مانہ سے سوال جڑ دیا۔

"مجھے کیا ان سے، آئیں یا جائیں۔ میری تو خود اب تک ملاقات نہیں ہوئی۔" مانہ نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔ تقدیر دور کھڑی اس پر ہنس رہی تھی۔ اگر وہ جانتی کہ راشد کا اتنے برس بعد واپس آنا، اس سے ملنا، مانہ کی زندگی پر یوں اثر انداز ہوگا تو شاید کہیں چھپ کر بیٹھ جاتی۔

☆☆☆

"خالہ بھی مانتی نہیں ہیں۔ میں نے کہا بھی تھا کہ ہال میں نہیں کرنا تو ہمارے گھر کر لیں۔" فہیم حسب عادت کام کے ساتھ بڑبڑانے میں مصروف تھا۔ گھر کے دروازے کے بالکل سامنے سڑک پر شامیانے لگائے جا چکے تھے۔ خوبصورت آرائشی دروازہ بنا کر بارات کو خوش آمدید کہنے کا بہت اچھا انتظام کیا گیا تھا۔ میز، کرسیاں، پانی سب کا مناسب بندوبست تھا۔

"چل اب سب ہو گیا ہے تو نہا دھو کر تیار ہو آئیں۔" ضیا نے سب طرف نظر دوڑائی۔

"نہیں، تم ابھی یہیں رکو۔ ان کے سر پر نہ دھو تو کام نہیں کریں گے۔ ابھی ان ٹنکیوں میں ٹھنڈا پانی بھروانا ہے اور وہ ہاتھ دھونے والی ٹنکی کے ساتھ صابن، تولیہ رکھوانا ہے۔ میں گھر جا کر تیار ہوتا ہوں اور ابو کو بھیج دیتا ہوں۔ وہ آ جائیں گے تو تم آ جانا۔" فہیم نے کام کرتے کیٹرنگ کے عملے کو دیکھا اور تمام انتظامات کا باریک بینی سے جائزہ لیا۔ وہ ایسے ہی شعلہ، شبنم مزاج کا حامل تھا۔ فہیم نکلا تو ضیا وہیں ایک کرسی پر سر پیچھے ٹکا کر نیم دراز ہو گیا۔ اس کے ابا سے لے کر اس تک چلتی یہ نسل در نسل دوستی بہت کچھ کروا لیتی تھی ورنہ کسی اور کے لیے یہ سب کرنا اتنا آسان بھی نہ تھا۔

"ضیا بھائی، بات سنیں۔" گھر کے اندرونی دروازے سے آواز کے ساتھ مانہ کا چہرہ نمودار ہوا تھا۔ ضیا فوراً سیدھا ہو گیا۔ وہ وہیں کھڑی اس کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ تھکاوٹ کا احساس لمحوں میں ماند پڑا۔ وہ تیزی سے اس تک آیا۔ "بھائی کہاں ہیں؟" وہ یقیناً فہیم کو ڈھونڈنے آئی تھی، اسی لیے پہلا سوال اسی کے بارے میں ہوا۔

"گھر تک گیا ہے۔" ضیا نے اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے ان دیکھی خوشی و توانائی سے اپنا وجود بھرتا محسوس کیا۔ کتنے دن بعد اسے دیکھا تھا۔ جب سے اس کا وین والا واپس آیا تھا۔ ان کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ کئی دن وہ بے اختیار دوپہر کو آفس سے اُٹھ آتا رہا مگر کالج کے سامنے آ کر اور گھر پہنچ کر بھی وہ نظر نہ آئی تو ایک خالی پن کا سا احساس ہوتا۔ وہ اس کے لیے کتنی ضروری تھی، اسے ان چند دنوں میں اندازہ ہوا تھا۔ مانہ کو تو شاید اس کے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا، کجا کہ اس کی کمی محسوس کرتی۔

"اچھا! وہ خالہ کہہ رہی ہیں کہ اسٹیج نہیں بنائیے گا۔ خالو کی وہیل چیئر نہیں جا سکے گی اور ابھی بھی اندر آ کر انہیں لے جائیں۔ وہ باہر بیٹھ کر بارات کا استقبال کرنا چاہتے ہیں۔" اس نے فہیم کو نہ پا کر اسے ہی خالہ کا پیغام پہنچا دیا۔ ضیا نے عائب دماغی سے سر ہلایا۔ وہ سننے سے زیادہ دیکھ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ بے نیازی سے پیغام دیتی وہ اس کے جذبوں سے کتنی لاتعلق تھی۔ محبت کی جو مدھم آنچ اس کے دل کو سلگا رہی تھی، اس کی گرمائش مانہ تک کیوں نہیں پہنچی۔

"تم نے مجھے یاد نہیں کیا اتنے دن۔" بے اختیار ذہن میں چلتی سوچ زبان تک آئی تھی۔

"جی!" مانہ تعجب سے دو قدم اور پیچھے ہوئی تھی۔ اس کا یوں مسلسل دیکھنا ویسے ہی پزل کر رہا تھا اور اس پر اب یہ جملہ..... ضیا کی آنکھوں میں بولتے نرم نرم جذبے وہ محسوس کر لی تھی لیکن ایسی بے باکی اس نے پہلے کبھی نہیں دکھائی تھی۔ وہ اسے کیا سمجھ رہا تھا۔ مانہ کے دل میں ناپسندیدگی کا غبار اٹھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات ضیا کو ہوش میں لے آئے۔

"وہ، میں یہ کہہ رہا تھا، دین سے آنے جانے میں مسئلہ تو نہیں ہوتا۔ میں پک کر لوں گا۔" اس نے بات بنانا چاہی۔

"میں ہمیشہ سے دین میں ہی جاتی ہوں ضیا بھائی۔ آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ ایک دم رکھائی سے بولتی اندر چلی گئی تھی۔ ضیا — بے چین ہوا۔ وہ اسے غلط سمجھ رہی تھی۔

اپنے سر پر ہاتھ مارتا ضیا خود کو ڈپٹ رہا تھا۔ مانہ کا انداز کیسا بے یقین تھا۔ وہ خود اپنا تاثر خراب کر بیٹھا تھا۔ اب اسے فوراً امی سے بات کرنی تھی تاکہ مانہ اسے فلرٹ نہ سمجھے۔

☆☆☆

"کہاں لے آئی ہیں آپ۔ اب فہیم کی خالہ سے ہمارا کیا واسطہ۔" راشد ایک طرف گاڑی کھڑی کرتے جھنجھلا رہا تھا۔ گلی میں لگے شامیانے ہی اس شادی کا حال بتانے کو کافی تھے۔

"واسطہ کیوں نہیں، اکلوتی خالہ ہیں فہیم کی۔ بھابھی کے لیے نہ سہی، عینی کے لیے ہی رشتے داروں سے ملنا تو ہوگا۔" پھپھو سمجھانے والے انداز میں کہتی نیچے اتر گئیں۔ راشد شامیانے کے اندر آیا تو پھپھو اور عینی گھر میں جا چکی تھیں۔ ماموں، فہیم اور دیگر افراد سامنے بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ وہ بھی ان کے ساتھ جا بیٹھا۔ بارات آ چکی تھی۔ نکاح کے بعد مبارک سلامت کے شور کے ساتھ ہی کھانا لگا دیا گیا تھا۔ راشد اکتایا ہوا سا بیٹھا تھا۔ اس کی اکتاہٹ ایک دم ختم ہوئی تھی۔ کھانے کے بعد اندر سے رنگ و بو کا ایک ریلہ سا آیا تھا۔ تمام خواتین بمعہ دلہن باہر آ گئی تھیں۔ دلہن کو دلہا کے ساتھ بٹھایا گیا۔ نوخیز لڑکیاں نک سک سے تیار، خوشبو بکھیرتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ دلچسپی سے ساری چہل پہل دیکھنے لگا۔ سب نے نشستیں سنبھال لیں تو قدرے سکون ہوا۔ اسے بمشکل عینی اور امی، مامی کے ساتھ بیٹھے نظر آئے۔ وہ ان کے پاس گیا۔ مامی سے سلام دعا کرتے نظر کے سامنے — وہ آئی تھی۔ خوبصورت لباس میں، معصوم چہرے والی مانہ۔ "السلام علیکم۔" نظر ملنے پر اس نے سلام جھاڑ دیا۔

"وعلیکم السلام، یہ مانہ ہے۔ اتنی بڑی ہو گئی۔" اس کے بے اختیار حیرت کے اظہار پر جہاں مانہ جھینپ گئی، وہیں عینی نے بے اختیار مسکراہٹ روکی تھی۔ اسے بے اختیار اپنے غلط ہونے کا احساس ہوا۔ ایک لڑکی کے بارے میں یوں تبصرہ کچھ معیوب لگتا سو فوراً وضاحت کی۔

"جب میں گیا تھا، تب تو مٹی میں کھیلتی تھی بلکہ شاید کھاتی بھی تھی۔ اب تو بہت سمجھ دار لگ رہی ہے۔"

"تم بھی تو اتنے سال بعد آئے ہو۔ کالج جانے لگی ہے اب تو۔"

پھپھو کو بھتیجی پر پیار آیا۔ پھپھو کے ساتھ ہی پھپھو کے بیٹے نے بھی پیار بھری نظر سے دیکھا تھا۔ مانہ اس کے یوں نظر جما کر دیکھنے پر الجھتی ہوئی وہاں سے اٹھ کر شازیہ کے ساتھ دلہن کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ ذہن میں بے اختیار ضیا بھائی کا خیال آیا تھا۔ دو مہینہ بھر اسے کالج سے پک کرتا رہا تھا اگر آج کا واقعہ نکال دیا جاتا تو نہ ضیا نے کبھی یوں اسے دیکھا تھا..... نہ اکیلا پا کر بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی۔

اس کے ادھر ادھر ہوتے ہی راشد کو رنگ پھیکے پڑتے لگے تھے۔ وہ رخصت کی اجازت لے کر نکل آئے۔

"آپ ادھر ادھر رشتہ ڈھونڈ رہی ہیں تو ماموں سے مانہ کے لیے پوچھ لیں۔" واپسی میں ڈرائیونگ

کرتے راشد نے سرسری انداز میں کہا تھا۔

''وٹہ سٹہ ہو جائے گا، مجھے معلوم ہے، بھائی کبھی نہیں مانیں گے۔ ویسے بھی مانہ ابھی چھوٹی ہے، پڑھ رہی ہے۔ میں تو تمہارے لیے کوئی ڈاکٹر نرگس ڈھونڈوں گی۔'' پھپھو نے فوری جواب دیتے اسے بہلانا چاہا۔

''نہیں امی، مجھے شادی کرنی ہے، ہسپتال نہیں کھولنا۔ آپ بات تو کریں ماموں سے، میں مانہ سے ہی شادی کروں گا۔'' اس کا سرسری لہجہ قطعی ہوا۔

''وہ نہ مانے تو.....'' بھائی کا لہجہ عینی کو ڈرا گیا۔ الفاظ اس کی زبان سے سرسراتے ہوئے پھسلے تھے۔

''تو ہم ان سے سارے تعلق ختم کر لیں گے۔ اگر کوئی رکھنا چاہے تو وہ مجھ سے تعلق توڑ لے۔'' راشد نے ایک نظر آئینے میں نظر آتے عینی کے خوف زدہ چہرے پر ڈالی اور کہتے ہوئے گاڑی کی رفتار بڑھا دی تھی۔

☆☆☆

پوری تقریب میں ضیا کی آنکھیں مانہ کو کھوجتی رہیں مگر وہ دانستہ اس سے احتراز کر رہی تھی۔ کوئی کام بھی ہوتا تو شازیہ کو باہر بھیج دیتی۔ نکاح کے بعد جب سب خواتین باہر آ گئیں تب وہ باہر آئی تھی۔ ضیا کے بے چین دل کو کچھ قرار آیا۔ وہ اسے مسلسل نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن گاہے بگاہے نگاہ بے اختیار اس طرف چلی جاتی۔ اپنی زبان کا پھسلنا اور مانہ کا گریز اسے محتاط رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ اسے گفتگو کا مرکز نہیں بلکہ زندگی کا محور بنانا چاہتا تھا۔ اپنی محبت کو اپنی عزت بنانا چاہتا تھا۔ مانہ نے اس کی بے اختیاری محسوس کی تھی۔ اس نے ضیا کا دیکھنا اور نظر موڑنا محسوس کیا تھا۔ ایک دم امنڈنے والی بدگمانی کم ہوئی تھی۔ وہ اس کی عزت کرتا تھا۔ وہ نظر جھکانا جانتا تھا۔

اسی رات ضیا نے امی سے اپنی پسند کے اظہار کے ساتھ رشتہ لے جانے کی بات کر دی تھی۔ وہ حیرت زدہ اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

''آپ نے خود ہی کہا تھا کہ آپ میری پسند پر راضی ہوں گی، چاہے وہ جو بھی ہو اور ان سے تو ہمارے کتنے پرانے تعلقات ہیں۔'' ضیا نے انہیں ماضی کی بات یاد دلائی۔

''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں بیٹا۔ نہ تمہارے پاپا کو ہوگا۔ مانہ اچھی بچی ہے۔ ہمارے سامنے پلی بڑھی ہے۔ لیکن مجھے نہیں لگتا کہ وہ لوگ اتنے آرام سے مانیں۔ دوستی الگ چیز ہے مگر ان کے ہاں کاسٹ سے باہر رشتہ نہیں ہوتا۔'' انہوں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

ضیا پریشان ہوا تھا۔ جو کام وہ بہت آسان سمجھتا تھا۔ اس کی ابتدا ہی اس قدر مشکل تھی۔

''آپ بات تو کریں۔ آپ انہیں راضی کریں نا امی پلیز۔'' اس کے لہجے کی لجاجت، آنکھوں سے چھلکتا کھو دینے کا خوف اس کے جذبات کی شدت عیاں کر گیا تھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے دل سے اس کے لیے دعا کی تھی۔

☆☆☆

خوشیوں کی عمر کم ہوتی ہے مگر اتنی کم ہوگی، کسی کو گمان بھی نہ تھا۔ شازیہ مستقل رو رہی تھی۔ خالہ صبر کا پیکر بنی بیٹھی تھیں مگر آنسو بے آواز چہرے پر رواں تھے۔ زندگی ایسے پے در پے امتحانات میں گزری تھی کہ ہر حادثہ چھوٹا محسوس ہوتا لیکن یہ حادثہ ہرگز چھوٹا نہ تھا۔ ابھی فوزیہ کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور خالو کی یوں اچانک وفات سب کو دکھی کر گئی۔ دل کا مسئلہ عرصے سے چل رہا تھا۔ ایک انجیو گرافی ہو چکی تھی، ڈاکٹرز سے رابطے میں بھی تھے مگر یوں اچانک دل بند ہو جائے گا، کس نے سوچا تھا۔ ہسپتال جانے کی نوبت آئی، نہ کسی مشکل میں ڈالا۔ بس خاموشی سے چل دیے۔

مانہ نے پہلی بار اپنی ملنسار سی خالہ کو ایسا غم زدہ دیکھا تھا۔ وہ تو ہر صورت حال میں مسکرا کر حل نکالتیں مگر اب بظاہر خود کو مضبوط بناتے وہ اندر سے ہی ٹوٹ گئی تھیں۔ ان کا بلڈ پریشر شوٹ کر رہا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی میں بمشکل بیٹھی بیٹیوں کو ڈھارس دینا چاہ

رہی تھیں مگر ان کی حالت کسی سے چھپی نہ تھی۔ ان کا کون سا بڑا خاندان تھا جو تدفین کے لیے کسی کا انتظار کیا جاتا۔ دو دن لوگ آئے اور اب خالی گھر میں وہ ماں بیٹیاں خاموش بیٹھی تلاوت کر رہی تھیں۔ مانہ، امی کے ساتھ مستقل اس دن سے یہیں تھی۔ خالہ اب سنبھل گئی تھیں۔ انہوں نے بیٹیوں کو گھر جانے کا کہہ دیا۔

''امی میں آپ کو چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔ ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔'' فوزیہ کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔

''جانا تو ہے بیٹا، پھر دن گننے کا فائدہ۔ تمہاری شادی ہو گئی ہے بیٹا، اپنے شوہر کے ساتھ خوش رہو۔ بس اور مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ یہاں رہ کر کیا کرو گی تم یا نازیہ۔ اپنا گھر، اپنے شوہر کا خیال رکھو۔ میں ٹھیک ہوں۔ میرا خیال رکھنے کو شازیہ ہے نا۔'' انہوں نے بیٹی کو متانت سے سمجھایا۔ حالات کی مار انسان کو حقیقت پسند بنا دیتی ہے۔ انہوں نے بہت کچھ سہا تھا۔ اب یہی دعا تھی کہ بیٹیاں اپنے گھر میں خوش رہیں۔

''تمہاری امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ تم لوگ بے فکر ہو کر اپنے گھر جاؤ۔ میں عدت کی وجہ سے چپ ہوں۔ فہیم سے کہتی ہوں کسی مفتی صاحب سے پوچھ آئے، جیسے وہ کہیں۔ پھر میں ان دونوں کو اپنے گھر لے جاؤں گی۔'' امی نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے انہیں تسلی دینا چاہی۔

''نہیں آپا، آپ کی مہربانی، میں یہیں رہوں گی۔ آپ نے ہمیشہ میرا بہت خیال رکھا ہے۔ بس اب جلدی سے شازیہ کا رشتہ ڈھونڈ دیں۔ تاکہ آخری فرض سے بھی فارغ ہوں۔ زندگی نے مہلت نہ دی تو میرے بعد شازیہ آپ کی ذمہ داری ہے۔'' خالہ نے دھیمے سے کہا تھا۔ امی تڑپ گئیں۔

''کیسی فضول باتیں کرتی ہو۔ اپنے ہاتھوں بچی کی شادی کرنا۔'' خالہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ صدمے سے عجیب مایوسی کا شکار ہو رہی تھیں۔ جینے کا کوئی مقصد یا خواہش باقی نہیں تھی۔ فضا میں غم رچا ہوا تھا۔

دکھ کتنا ہی ہو مگر زندگی کب رکتی ہے۔ پھپھو نے بھی تھوڑے دن انتظار کیا تھا، پھر وہ امی کو عینی کی شادی کا یاد کروا گئی تھیں۔ ساتھ ہی راشد کی شادی کا بھی عندیہ دیا۔ وہ مانہ کا رشتہ مانگ رہی تھیں۔

''مجھے ایسے ایک گھر میں دو رشتے پسند نہیں۔'' ابو نے فوراً ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

''خاندان میں تو رشتے ہو جاتے ہیں بھائی صاحب۔ کوئی نیا بندہ ہو تو آپ کہیں۔ مانہ میری بھتیجی نہیں، بیٹی ہے۔ سینے سے لگا کر رکھوں گی۔'' پھپھو نے پورا زور لگایا۔ انہیں راشد نے سکھا کر بھیجا تھا۔ وہ ہر صورت مانہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ پھپھو کے انداز پر ابو قائل تو نہ ہوئے مگر وقتی طور پر خاموش ہو گئے۔

''آپ نے صاف جواب کیوں نہیں دیا۔ مجھے وٹہ سٹہ نہیں کرنا ہے۔ آپ نے ضیا کا رشتہ تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ابھی مانہ کی شادی نہیں کرنی مگر انہیں انکار نہ کیا۔'' پھپھو کے جاتے ہی امی، ابو سے الجھی تھیں۔ مانہ نے چائے کے برتن سمیٹتے حیرت سے ان کی بات سنی۔ ضیاء کا رشتہ آیا، منع ہو گیا اور اسے پتا بھی نہیں چلا۔ ایسا کیسے ممکن ہے۔ دل نجانے کیوں ڈوب کر ابھرا تھا۔ اس کا دھیان سارا باہر سے آنے والی آوازوں پر لگا۔

''منع تو انہیں بھی نہیں کیا، وقت ہی لیا ہے۔ ضیا اچھا بچہ ہے مگر برائی کوئی راشد میں بھی نہیں۔ پھر خاندان کا ہی ہے۔'' ابو نے سبھاؤ سے کہا تھا۔

انہیں ضیا خود بہت پسند تھا۔ اسی لیے ایک دم منع نہیں کر سکے لیکن یہ بھی سچ تھا کہ اپنی ذات سے باہر رشتہ جوڑنا ان کی روایت نہیں تھا۔ مانہ کے ہاتھ سے شیشے کا پیالہ پھسل کر گرا اور زوردار آواز سے ٹوٹا۔ ایک چھناکا دل میں بھی ہوا تھا۔

''کیا ابو پھپھو کی بات ماننے والے ہیں۔'' امی بے اختیار اٹھ کر پریشان سی کچن تک آ گئیں۔ ''کیا ہوا، کیا ٹوٹا؟ لگا تو نہیں؟''

مانہ نے فرش سے کانچ چنتے خوف زدہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''پھپھو کو منع کر دیں پلیز امی۔'' اس نے ملتجی لہجے میں مدھم آواز میں کہا تھا۔ امی نے گہری نظر سے اسے دیکھا اور کچھ کہے بنا واپس لاؤنج میں چلی گئیں۔

''راشد سے ہزار گنا اچھا ہے ضیا۔ کاروبار، تعلیم، مزاج ہر چیز میں بہتر ہے۔ ایسے کون سے ہیرے جڑے ہیں ہماری ذات میں کہ باہر رشتہ کرتے جھڑ جائیں گے۔ ابھی لڑکی والے ہیں تو عینی کے ابا کا مزاج نہیں ملتا۔ لڑکے والے بن گئے تو اور آسمان پر چڑھیں گے۔'' امی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اب کی بار واشگاف الفاظ میں انکار کیا تھا۔ سدا بیٹے کا ساتھ دیا تھا۔ اب بیٹی کا عندیہ جان لیا تھا تو اسے کیوں اکیلا چھوڑتیں۔ ابو کسی سوچ میں گم تھے۔ جس طرح کے ان کے تعلقات تھے، وہ سٹہ تو وہ بھی نہیں چاہتے تھے۔

یہی انکار پھپھو کے گھر پہنچا تو فہیم کی شادی خطرے میں پڑنے لگی۔ پھپھو، پھوپھا کے لیے اکلوتے بیٹے سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا۔

''عینی! تم سمجھاتی کیوں نہیں ہو راشد کو۔'' فہیم فون پر عینی سے الجھ رہا تھا۔

''میں اپنے بھائی کو دکھی نہیں کر سکتی۔ کوئی غلط خواہش تو نہیں کر رہا۔ شادی تو کرنی ہے تم لوگوں نے مانہ کی، تم اسے کیوں نہیں سمجھاتے۔ بہنوں کے لیے تو بھائی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔ کیسی بہن ہے تمہاری۔''

عینی نے اپنی جھنجھلاہٹ نکالی۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ سب سمجھانے کی ناکام کوشش کر چکے تھے مگر راشد ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔

''مانہ کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔ ابھی تو امی ہی نہیں مان رہیں۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ ہمارے رشتے کا مانہ سے کیا تعلق، انتہائی گھٹیا حرکت ہے یہ۔'' فہیم نے ناگواری سے کہا۔

''مانہ کا واسطہ نہیں ہے تو ضیا کا رشتہ کیوں آیا ہے۔ ضیاء کی وجہ سے ہی مامی منع کر رہی ہیں۔ ایسی بھی کیا طوفانی محبت کہ خاندان والوں کا لحاظ نہیں۔ تم مانہ سے بات کرو، وہ ضیا کے لیے منع کر دے۔ جب مانہ مان جائے گی، تو مامی خود ہی مان جائیں گی۔'' عینی نے جل کر کہتے فہیم کو راہ سجھائی تھی۔ فہیم کو مشورہ پسند آیا تھا۔ بچپن کی منگنیاں ہوں یا شادی سے پہلے کی محبتیں، یوں ہی عقل پر پٹی باندھتی ہیں۔

☆☆☆

ضیا اندر ہی اندر بے چین تھا۔ کتنے ہی دن ہو گئے تھے اور کوئی بات واضح نہیں تھی۔ اس کا اضطراب ماں باپ سے چھپا ہوا نہیں تھا مگر کیا کرتے۔ اپنے طور پر رشتہ مانگ لیا تھا، اب اس صورتحال کا علم ہوا تو اصرار بھی کر لیا مگر زیادہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ مانہ اس تمام ہنگامے سے جان چھڑانے کے لیے خالہ کی طرف گئی ہوئی تھی۔ گھر کا عجیب ماحول تھا، بات اس کے ہی متعلق تھی مگر کوئی اس سے ڈسکس نہیں کرتا تھا۔ شادی ابھی اس کے پلانز میں شامل نہیں تھی مگر ایک بات طے تھی کہ وہ یوں زبردستی کے رشتے کے خلاف تھی۔ پھپھو کے گھر آدھا گھنٹہ نہیں گزرتا تھا کجا کہ پوری زندگی گزارنا۔ وہ وہاں شادی ہرگز نہیں چاہتی تھی۔

اسے فرار کی ضرورت تھی۔ خالہ کو اور شازیہ کو اس وقت کسی کے ساتھ کی ضرورت تھی۔ ان دونوں نے وہیں سے کالج جانا شروع کر دیا تھا۔ فہیم نے وہیں جا کر مانہ کو سمجھانا چاہا۔

''دیکھو، راشد اچھا لڑکا ہے۔ امی تم سے پوچھیں گی تو تم انکار مت کرنا۔''

''مجھ سے تو کسی نے نہیں پوچھا بھائی۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔

''میں امی کو کہوں گا نا، بس تم میرا ساتھ دے دو۔ تمہیں پتا ہے ضیا کے رشتے کا۔'' وہ بہن سے ضیا کے بارے میں رائے پوچھتے پوچھتے رک کر بات بدل گیا۔

"نہیں۔" مانہ نے نگاہیں چرالی تھیں۔ بھائی پوچھنے نہیں آیا تھا جو دل کی بات بتالی۔ وہ اپنی سنانے آیا تھا۔ فہیم نے اس کا آنکھیں چرانا نہیں دیکھا تھا، وہ اس کے جواب سے مطمئن ہو گیا۔ اگر مانہ کو کسی بات کا علم ہے نہ دلچسپی، تو وہ ہی کو ہر مقصود پا لے۔

اگلے مرحلے میں اس نے امی ابو کو راضی کرنے کی کوشش کی مگر ہمیشہ کی نرم خو امی اس معاملے میں ضد پر اڑی تھیں۔ دو بچے تھے، دونوں کی خوشی دل سے عزیز تھی۔ فہیم نے زیادہ کچھ کہنا چاہا تو انہیں غصہ آ گیا۔ انہوں نے ابو کو طنزیہ انداز میں مخاطب کیا تھا۔

"آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ ابھی سے "اس" کے لیے بہن کو قربان کرنے کو تیار ہے تو بعد میں کیا ہو گا۔ اللہ جانے کس پر گیا ہے، آپ نے تو سدا ماں، بہن کی سنی ہے۔" آخری الفاظ بڑبڑاہٹ کی طرح ادا ہوئے تھے۔ ابو کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھری تھی۔ ساری زندگی ان کے ہر فیصلے پر سر خم کرنے والی بیوی اپنی بیٹی کے لیے روایتی بیوی کا روپ دھار چکی تھی۔ انہیں خود بھی بیٹی بہت عزیز تھی، اس لیے وہ بیوی کے فیصلے سے مکمل متفق تھے۔ ان کی مسکراہٹ سے قطع نظر فہیم جھنجھلا گیا تھا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ امی۔ مانہ میری بہن ہے، اس کے ساتھ میں کچھ برا کر سکتا ہوں۔ اچھا کھاتا کماتا رشتہ ہے، اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ماننے میں کیا حرج ہے۔"

"کھاتا، کماتا تو ضیا بھی ہے بلکہ اس سے زیادہ سیٹ ہے۔ تمہارا بچپن کا دوست ہے۔" امی نے اسے گھورا۔

"راشد خاندان کا ہے۔ اپنا مارے بھی تو چھاؤں میں ڈالتا ہے امی۔"

فہیم نے پرانی دلیل کا سہارا لینا چاہا۔

"آج وہ غیر ہو گیا اور جب وہ مانہ کو کالج سے لاتا تھا تب؟ میرا دماغ خراب مت کرو فہیم۔ میں ضیا کے لیے ہاں کر چکی ہوں۔ مٹھائی دے آنا اپنی پیاری پھپھو کو۔" انہوں نے بات ختم کی۔ فہیم بے بسی سے وہاں سے اٹھ آیا۔ ایک موہوم سی امید باقی تھی شاید مانہ منع کرے یا پھپھو لوگ ہی مان جائیں۔ مگر مانہ کی منگنی کی مٹھائی خاندان بھر میں بھجوا دی گئی۔

پھپھو کے گھر فہیم خود گیا، سوچا تو یہ تھا کہ پھپھو کو دادی کی خواہش کا حوالہ دے کر قائل کرے گا مگر ان کی طنزیہ باتوں نے اس کے اندر آگ بھر دی تھی۔ فوراً ہی پھپھو کے گھر سے عینی کو تحائف میں دیا سامان واپس آ گیا۔ انہوں نے اگلے ہی ماہ عینی کی شادی اس کے چچا کے بیٹے سے طے کر دی تھی۔ عینی سے بات کرنے کی کوشش کی مگر اس نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ جاتے جاتے اس کے جملوں نے فہیم کا دل جلا دیا تھا۔ عینی اپنے بھائی کو منگیتر پر فوقیت دے رہی تھی اور مانہ نے بھائی کے بجائے ضیا کا انتخاب کیا دکھ سے زیادہ ایک غصے کی لہر فہیم کے اندر سے ابھری تھی۔ وہ مانہ کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اسے سب پر غصہ تھا۔ وہ عینی سے خفا تھا۔ وہ گھر بھر سے ناراض تھا۔ حتیٰ کہ اسے ضیا پر بھی غصہ تھا۔ وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ اس کی ناراضی اور حالات دیکھ کر امی نے آنٹی کا فوری شادی کا مطالبہ مان لیا تھا۔ شادی ہو جاتی تو سب کی خفگیاں ماند پڑ جاتیں۔ انہیں اندازہ نہ تھا کہ ان کا غصیلا اور جذباتی بیٹا کیا ٹھانے بیٹھا ہے۔

☆☆☆

کہاں گھر میں فہیم کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور کہاں فوری طور پر مانہ کی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی۔ خالہ اور شازیہ کو امی اپنے گھر ہی لے آئی تھیں۔ عینی کی شادی کا سب سے پہلا کارڈ ان کے گھر آیا تھا۔ فہیم نے غصے سے کارڈ کے ٹکڑے کر دیے اور اپنی انا کی بلندی کے لیے عینی کی شادی سے پہلے خود شادی کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے خود کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا تھا بلکہ اپنے غصے کو اندر ہی اندر دبا کر آتش فشاں بنا دیا۔

امی سمجھیں کہ شاید سب ٹھیک ہو گیا۔ انہوں

نے خوشی خوشی مانہ کے ساتھ اس کی اور شازیہ کی شادی بھی کردی، شازیہ کے ساتھ اس کا رویہ بہت لیا دیا تھا مگر پھر بھی وہ لوگ مطمئن تھے کہ رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ان کی خوشی اس وقت خاک میں مل گئی جب اس کی خاموشی ٹوٹی تھی۔ وہ کبھی سے پہلے کی طرح نہیں ملتا تھا مگر بدتمیزی بھی نہ کی تھی۔ یہ ان کی شادیوں کے کچھ عرصے بعد کی بات ہے، جب ایک دن چھوٹی سی بات پر وہ غصے میں مانہ اور ضیا پر چلایا تھا۔

''تم دونوں نے میرے اعتماد کو دھوکا دیا ہے۔ دھول جھونکی ہے ہماری آنکھوں میں۔ مت آیا کرو میرے سامنے۔''

ابو گھر میں موجود نہیں تھے۔ شازیہ کو فہیم نے وہ مقام نہیں دیا تھا کہ وہ کچھ کہتی اور امی نے دوسرے کمرے میں اس کی بلند آواز سنی تو سینے پر ہاتھ رکھے جہاں کی تہاں بیٹھ گئیں۔

''بس کردو فہیم، بہت برداشت کرلیا میں نے۔ میری بیوی پر الزام لگانے کی ضرورت نہیں۔ کیا کیا ہے ہم نے؟ چھپ چھپ کر ملتے نہیں تھے۔ عزت سے رشتہ بھیج کر شادی کی ہے میں نے۔'' ضیا غرایا تھا۔ مانہ صدمے سے سفید چہرہ لیے کھڑی تھی۔ اسے معلوم ہوتا کہ حالات اس نہج پر آئیں گے تو وہ کبھی اس شادی کے لیے ہامی نہ بھرتی۔

''اتنے ہی تم لوگ معصوم ہوتے تو یہ شادی نہ ہوتی۔ مانہ نے راشد کو نہیں مجھے چھوڑ کر تمہارا انتخاب کیا ہے۔'' وہ زہریلی ہنسی ہنسا تھا۔ اپنی بہن پر یوں تبصرے کرتے اس کی زبان بھی نہ لڑکھڑائی۔ اس کی بدلحاظی پر شازیہ سارا خوف بھول گئی۔

''خود شادی نہیں کی بلکہ خالہ نے وداع کیا ہے اسے، آپ بھی تو عینی کے لیے مر رہے ہیں اب تک۔ جب آپ پسند کی شادی کرسکتے ہیں تو مانہ کیوں نہیں۔''

اس نے آگے بڑھ کر لڑکھڑا کر صوفے پر بیٹھتی مانہ کو سنبھالتے ہوئے اسے آئینہ دکھانا چاہا مگر فہیم اسے اپنی بات پر مہر سمجھا تھا۔

''تو ماننے کی ہمت رکھیں نا کہ ان کے عشق نے میری نیا ڈبوئی ہے۔''

اس کی بات پر ضیاء کے لیے خود پر قابو پانا مشکل ہوگیا۔ مانہ کیسی تھی، اس کا کردار کیا تھا، وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

''شٹ اپ، جسٹ شٹ اپ۔'' ضیا مانہ کا ہاتھ پکڑ کر اس دن گھر سے نکلا تو دوبارہ نہ آیا۔ مانہ امید سے تھی، یہاں مسلسل ٹینشن میں رہنا اس کی صحت کے لیے نقصان دہ تھا۔ گھر جا کر بھی وہ مستقل روتی رہی۔ دونوں گھروں کی درمیانی دیوار کو تکتے اسے کیا کچھ نہ یاد آتا۔ اس کا ابارشن ہوگیا تھا مستقل اس ماحول میں رہ کر وہ ڈپریشن میں جارہی تھی۔ ضیا کو ماحول بدلنے کے لیے اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو کاروبار سمیٹ کر وہ لوگ لاہور شفٹ ہوگئے تھے۔ امی ابو کا مانہ سے تھوڑا رابطہ تھا مگر شازیہ کو فہیم نے سختی سے منع کیا تھا۔ سب نے یہی سوچا کہ تمام واقعات اتنے بے درپے ہوئے ہیں تو فہیم کو سنبھلنے کا وقت دینا چاہیے۔ مسلسل سمجھانا یا زور دینا مناسب نہیں۔ کچھ عرصے بعد سب ٹھیک ہوجائے گا۔ مگر حالات ٹھیک ہونے کے بجائے مزید بگڑ گئے۔

پھپھو نے آبائی گھر میں سے اپنا حصہ مانگ لیا تھا۔ پھپھو کے حصے کی رقم کا اندازہ لگا کر ابو آدھا پہلے ہی ادا کرچکے تھے مگر انہیں تکلیف دینے کے لیے پھپھو نے وہ رقم از خود قرض قرار دے دی اور مکان کی موجودہ مالیت کے حساب سے تمام رقم یک مشت ادا کرنے کا تقاضا کردیا۔ ابو کو گھر بیچنا پڑ گیا۔ وہ لوگ کرائے پر چلے گئے۔ گھر بکا تو امی، ابو مانہ کو اس کا حصہ خود دینے آئے تھے۔ اب وہ کسی کا حق اپنے سر پر نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد انہیں حج پر جانا تھا۔ وہ آخری بار تھا جب مانہ اپنے والدین سے ملی۔ حج کے دوران ہی بھگدڑ میں امی، ابو کا انتقال ہوگیا اور وہ وہیں دفنا دیے گئے۔ مانہ تک یہ اطلاع بھی دیر میں پہنچی تھی۔ فہیم بھائی کے نئے گھر کا اسے معلوم تھا نہ

وہ اس کا گھر جانتے تھے۔ یہ رابطے ٹوٹے تو پھر جڑ نہ سکے۔

گزرتے وقت میں بے تحاشہ خوشیاں اور محبت سمیٹنے کے باوجود بھائی کا خیال مانہ کے دل سے محو نہیں ہوا۔ یہ سوچ کہ وہ اس وقت بھائی کی بات مان لیتی تو آج یہ دوری نہ ہوتی، اسے تاسف میں مبتلا کرتی تو کبھی اپنے ناشکرے پن کا احساس ہونے پر اللہ سے معافی مانگتی۔ وہ خوش تھی، اس کی زندگی میں سب کچھ تھا سوائے میکے کی اپنائیت اور ساتھ کے۔ اتنے برس بعد دوبارہ اس شہر میں سکونت اختیار کرنے کی ضد بھی مانہ کی تھی۔ جلاوطن کیے گئے رومانہ اور ضیا کا بیٹا اسامہ یوں فہیم بھائی کی بیٹی کو پسند کرلے گا، یہ تو کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔

☆☆☆

پوری رات ماضی کی وادیوں میں گھومتے کب شازیہ کی آنکھ لگی، اسے پتا نہیں چلا۔ اسے فہیم نے مسجد سے آکر جگایا۔ نماز کا وقت تنگ پڑ رہا تھا۔ وہ جلدی سے وضو کرنے چلی گئی۔ فہیم باہر نکل چکا تھا۔ نماز کے بعد دعا مانگتے ہوئے شازیہ بارگاہ الٰہی میں رو پڑی تھی۔

خالہ نے شازیہ کے اکیلے رہ جانے کے ڈر سے بہت عجلت میں اس کی شادی کردی تھی۔ شادی کے بعد شروع کا عرصہ بہت مشکل تھا۔ فہیم نے اسے صاف کہہ دیا تھا کہ اب وہ اس کی بیوی ہے، اس لیے اس کی مرضی کے مطابق چلے اور مانہ کو مکمل بھول جائے۔ شازیہ اس کے سامنے کچھ نہ کہتی مگر سارا دن خالہ کے منہ سے مانہ کی باتیں سن سن کر وہ اسے کیسے بھول سکتی تھی۔ وہ دونوں بچپن سے ساتھ تھیں۔ ہمدم دمساز تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ مانہ نے ایسا کچھ نہیں کیا جو فہیم کی غیرت پر تازیانہ بنتا۔ فہیم کی جذباتیت اور رشتے کی نزاکت اسے کچھ کہنے نہیں دیتی مگر اندر ہی اندر بہت کچھ پکتا رہتا۔ کچھ عرصے بعد سب نارمل ہونے لگا تھا۔ ان کے رشتے میں بے تکلفی اور محبت پیدا ہونے لگی تھی۔

خالہ کے انتقال کے موقع پر شازیہ نے ڈرتے ڈرتے اسے مانہ سے رابطے کا مشورہ دیا تھا، جس کے جواب میں اس نے پتا معلوم نہ ہونے کا کہہ کر بات ختم کردی۔ اب وہ مانہ کے نام پر بھڑکتا نہیں تھا مگر وہ اس کے بارے میں بات بھی نہیں کرتا تھا۔ فی الوقت شازیہ کے لیے یہی کافی تھا۔ وہ جانتی تھی کہ فہیم حد درجے جذباتی اور شدت پسند تھا۔ خاندان کی بات تھی، رشتہ ٹوٹنے کے بعد پھپھو یا عینی ہر جگہ طنزیہ انداز میں مانہ پر جملے کستیں۔ یہ آگ ان ہی جملوں کا ردعمل تھی، جو بہت کچھ خاکستر کرگئی تھی، اب اس کی راکھ کریدنے سے کچھ ہاتھ نہیں آنے والا تھا۔ فہیم نے بعد میں مانہ کو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی تو شازیہ کو منع بھی نہیں کیا جو اپنے بچوں کو مانہ پھپھو کی تصاویر دکھا کر متعارف کرواتی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ وہ بیوی کو تو منع کرسکتا تھا مگر باقی سب اس کے حکم کے پابند نہ تھے۔ ملنے جلنے والوں میں کوئی نہ کوئی مانہ کا پوچھ ہی لیتا۔ شازیہ لاکھ اس کے دوسرے شہر میں ہونے کا بہانا کرکے بات ختم کرنا چاہتی مگر لوگوں کو زخم کریدے بنا چین نہ آتا۔

اسجد کے بعد جب میزاب پیدا ہوئی تو شازیہ کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ میزاب ہو بہو مانہ کی شکل لائی تھی۔ فہیم بیٹی کی پیدائش پر بہت خوش تھا۔ وہ کسی قسم کی صنفی تفریق کے بنا بچوں کو برابر پیار اور توجہ دیتا، بیٹی کے لاڈ اٹھاتا، ہر قسم کی آزادی تھی اور شازیہ یہی سوچتی کہ اتنے لاڈ پیار کے بعد آخر میں وہ بیٹی کی زندگی کا فیصلہ کرتے ہوئے روایتی باپ بن جائے گا۔ اسجد کی منگنی نہ کرنے کے پیچھے بھی یہی خوف چھپا ہوا تھا۔ وہ طویل عرصے تک رشتے رکھنے کے حق میں نہیں تھی۔ کیوں کہ ان کے ٹوٹنے والے خوابوں کی کرچیاں وجود سے نکالنا آسان نہیں ہوتا۔ کوئی نہ کوئی کانچ اندر گڑا رہ ہی جاتا ہے۔

مانہ، اس کی بہترین دوست تھی، وہ جانتی تھی کہ اس کا ضیا سے کوئی لمبا چوڑا افیئر نہ تھا۔ بس پسندیدگی پیدا ہوئی جو فوراً جائز رشتے میں بدل گئی۔ بہن کی

پسند پر طوفان اٹھانے والا، بیٹے کی پسند کی شادی کے لیے راہ ہموار کرنے والا بیٹی کے معاملے میں کیسا ردعمل دے گا۔ وہ انجان اور خوف زدہ تھی۔ اس سے بڑا جھٹکا اسے تب لگا، جب اسجد نے اسے بتایا۔

''اسامہ کی والدہ مانہ پھپھو ہیں، وہ گھر آنا چاہتی ہیں، ملنا چاہتی ہیں مگر انہوں نے صاف کہا ہے کہ وہ بابا کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کریں گی۔ چاہے انہیں اسامہ کو منع کرنا پڑے۔''

فہیم کی بیٹی کی پسند کی شادی، وہ بھی رومانہ ضیا کے بیٹے سے۔

شازیہ ڈھے گئی تھی۔ غصہ حرام ہے، غصے اور تکبر سے بولے فہیم کے الفاظ واپس ان کے منہ پر لگے تھے۔ میزاب کی پیدائش پر جو دھڑکا دل کو لاحق ہوا تھا، وہ عجیب صورت حال میں سامنے آیا تھا۔ اس نے بیٹے کو سب بتا دیا تھا۔ اسجد نے ماں کو تسلی دی تھی۔ وہ ٹھنڈے دل سے اس مسئلے کو حل کرنا چاہتا تھا۔ اسے بہن بہت عزیز تھی۔ ماضی میں جو غلطی بابا نے کی تھی، وہ اسے دہرانا نہیں چاہتا تھا۔ میزاب کا مضطرب اور سہما ہوا انداز اس کے دل پر اثر کر رہا تھا۔ کسی قسم کی بدمزگی کے خوف سے اس نے ماں کو اس معاملے سے الگ رہنے کا کہہ کر خود بابا سے بات کی تھی۔ پھر فہیم نے میزاب کو بلوایا تھا۔ اب آگے کیا ہونا تھا۔ اللہ جانتا تھا۔

☆☆☆

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے مما۔'' مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ اسامہ ان کے ساتھ مصروف تھا۔ میزاب کو مما پاپا سے ملوانے، اس کی فیملی سے تعارف حاصل کرنے کے لیے ہی مدعو کیا تھا سو اسے مما کے پاس بٹھا کر وہ انتظامات دیکھ رہا تھا۔ اس طرف آیا تو نگاہ بے اختیار اس کونے کی طرف اٹھی۔ وہاں ماں کو اکیلا نڈھال سا بیٹھا دیکھ تیزی سے ان تک آیا۔

''سر شدید درد کر رہا ہے۔'' وہ اپنی کنپٹیوں کو ہاتھ سے دبا رہی تھیں۔ اسامہ پریشان ہوا تھا۔ انہیں مائیگرین کا مسئلہ تھا، درد شدید ہو جاتا تو دونوں طبیعت ٹھیک نہ ہوتی۔

کامل خوشی یا اطمینان کسی کو نہیں ملتا۔ کہیں نہ کہیں کوئی خلش، کوئی کمی سب کی زندگی میں ہوتی ہے۔ آنسوؤں سے نم، دل کا کوئی اندھیرا کونا جو چمکتے چہروں اور کھلتی مسکراہٹوں کے پیچھے لوگوں کو نظر نہیں آتا۔ محبتوں کے سائے میں پلتی مانہ، کو رومانہ ضیا بن کر بہت سی خوشیوں کے ساتھ یہ سر درد کا تحفہ ملا تھا۔ ضیا کی بے تحاشا محبت بھی زندگی کو مکمل نہیں کر سکی تھی۔

''آپ اندر چلیں۔ ڈریسنگ روم میں تھوڑی دیر آرام کر لیں۔'' اس نے حل تلاشنا چاہا۔

''مناسب نہیں ہے۔ سب مہمانوں سے مل لوں۔ تم بس مجھے دوا لا دو۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''آپ اٹھیں مما۔ مل لیجیے گا سب سے۔ ابھی تو مہمان جمع ہو رہے ہیں۔'' انہیں تسلی دیتے وہ کونے میں بنے چھوٹے سے کمرے تک لایا تھا۔ انہیں بٹھا کر دوا کی تلاش میں نکلا۔ راستے میں پاپا کو مما کی طبیعت کی خرابی سے آگاہ کیا تو وہ بے چین ہو گئے۔ پانی کے گلاس کے ساتھ وہ جب تک دوا لایا، رومانہ خود کو کافی حد تک سنبھال چکی تھیں۔ اسامہ کے ساتھ ہی ضیا بھی چلے آئے تھے۔

''کیا ہوا بھئی۔ بی پی تو شوٹ نہیں کر رہا۔ ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔'' حد درجہ تفکر سے کہتے وہ اندر آئے تھے۔

''میں ٹھیک ہوں۔ آپ دونوں پریشان مت ہوں۔ بس ویسے ہی ذرا سر درد کر رہا تھا۔'' انہوں نے مسکرا کر تسلی دی۔ اسامہ ان کے پاس بیٹھ کر انہیں دوا کھلانے لگا۔

''مجھے تو اسامہ بتا رہا تھا کہ وہ میزاب کو آپ کے پاس چھوڑ کر آیا ہے۔ پسند نہیں آئی کیا، جو اسے دیکھ کر سر پکڑ لیا۔ کہاں ہے وہ؟''

ضیا نے شگفتگی سے کہتے ہوئے استفسار کیا۔ ان

کی استقبالیہ پر اسجد اور میزاب سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ ان کی بات پر رومانہ بے اختیار بولیں۔

"پسند کیسے نہیں آئے گی۔ اس سے اچھی لڑکی دنیا میں ہو ہی نہیں سکتی۔" ان کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔ وہ اس وقت متضاد کیفیات کا شکار ہو رہی تھیں۔ ماضی اور مستقبل کے تانے بانے یوں الجھ رہے تھے کہ خوشی اور غم جدا نہیں ہو پا رہے تھے۔

"آپ طبیعت ٹھیک کریں، باہر آئیں۔ ملتے ہیں اس اچھی لڑکی سے بھی پھر جلدی سے تقریب ختم کر دیں گے۔" ضیا خوش گوار لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ وہ واپس چلے گئے۔ شاید کوئی ایمرجنسی تھی۔" رومانہ نے دھیرے سے کہا تھا۔ دوبارہ سر پر بوجھ محسوس ہونے لگا تھا۔

"لیکن مجھ سے مل کر تو نہیں گئے۔" اسامہ بے اختیار بولا۔ ضیا کے چہرے پر بھی اچنبھا تھا۔

"جلدی میں ہوں گے نا۔ چھوڑو انہیں، پہلے باہر بیٹھے مہمانوں کو نمٹا لیں۔" وہ بات پلٹتے ہوئے عجلت میں کھڑی ہو گئیں۔ ضیا نے اسامہ کو اشارے سے مزید کچھ کہنے سے منع کر دیا۔ وہ جان گئے تھے کہ رومانہ اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتیں۔ تقریب تو بہر طور گزر گئی مگر گھر پہنچتے پہنچتے مزید ضبط رومانہ کے لیے ممکن نہیں رہا۔

"آپ کو معلوم ہے میزاب کون ہے۔" ضیا لباس تبدیل کر کے سکون سے بیٹھے ہی تھے کہ رومانہ بول اٹھیں۔

"کون ہے میزاب؟" انہوں نے متانت سے پوچھا تھا۔ جانتے تھے کہ کچھ ایسا ضرور ہے جو وہ شیئر کرنا چاہ رہی ہیں۔

"وہ فہیم بھائی کی بیٹی ہے۔ میری بھتیجی ہے میزاب اور اسجد وہ تو بتا رہا تھا فہیم بھائی ہے، آپ دیکھتے تو فوراً پہچان لیتے۔"

وہ جوش سے بتا رہی تھیں۔

"گڈ" اس قدر غیر متوقع بات نے ضیا کو مزید کچھ کہنے نہیں دیا تھا۔ ذہن میں بہت کچھ چلنے لگا تھا۔ اسامہ، میزاب کو پسند کرتا تھا لیکن اب کیا میزاب کے گھر والے اسامہ کو قبول کریں گے۔ ان کے ماتھے پر شکنیں بچھ گئیں۔

"ہم ان کے گھر جائیں گے نا ضیا؟ میں نے انہیں کہہ دیا کہ ہم فہیم بھائی کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کریں گے۔ میں اب انہیں مزید دکھ نہیں دینا چاہتی۔" آس بھرے لہجے میں سوال کرتے ہوئے رومانہ کہہ رہی تھیں۔

"اور اسامہ کو؟" ضیا کے جملے میں پنہاں سوال رومانہ کو تڑپا گیا۔ "اسامہ میرا بیٹا ہے۔ میں اسے سمجھا لوں گی۔ فہیم بھائی اس رشتے پر مانیں یا نہ مانیں لیکن ہم ان سے تعلقات بحال ضرور کریں گے۔ میں اب مزید تنہا نہیں رہ سکتی۔" ان کا لہجہ یقین بھرا اور مضبوط تھا۔

"تنہا؟ تو میں کہاں ہوں۔ تم بھول گئی ہو جو فہیم نے کہا تھا۔ تم سدا بھائی کی یاد میں تڑپتی رہیں۔ میری محبت تمہارے لیے کافی نہیں ہے مانہ۔" ضیا کے دل پر چوٹ لگی تھی۔ تو اندر دبے سوال زبان پر لے آئے۔

"ایسا ہرگز نہیں ہے۔ آپ کی محبت، آپ کا ساتھ میرا اثاثہ ہے مگر ہر رشتے کی الگ جگہ ہوتی ہے۔ آپ فہیم بھائی کی جگہ لے سکتے ہیں نہ وہ آپ کی۔ انہوں نے مجھے جو کچھ بھی کہا۔ میں سب بھول گئی ہوں۔ مجھے صرف ان کا لاڈ پیار یاد ہے۔"

رومانہ ان کے خدشات کی تردید کرتے ہوئے مان بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"تم ایمانداری سے بتاؤ، کیا واقعی میں نے اسے دھوکا دیا تھا۔ دوست کی بہن کے لیے رشتہ بھیجنا غلط ہوتا ہے؟ میں نے بہت صاف زندگی گزاری ہے۔ جب تم میرے دل کو اچھی لگنے لگیں تب بھی حتی المقدور خیال رکھا کہ بے اختیاری میں کوئی عامیانہ حرکت نہ سرزد ہو۔ ہمارے فیملی ٹرمز تھے۔ سب مجھ پر اعتبار کرتے تھے۔ میں تمہیں کالج سے گھر تک

چھوڑتا رہا مگر کبھی کوئی غلط نگاہ نہ ڈالی اور.....'' دکھ سے کہتے کہتے ضیا جیسے تھک کر رک گئے۔ رومانہ کا بھائی تھا تو ان کا بھی بچپن کا دوست تھا۔ خونی رشتے رگوں میں بہتے ہیں تو دوست دل میں رہتے ہیں۔ دل میں رہنے والے تیر چلائیں تو زخم گہرا بنتا ہے۔ وہ کچھ نہیں بھولے تھے۔ زخم پر سے کھرنڈ اترا تو چبھن دوبارہ شروع ہو گئی۔ رومانہ نے تاسف سے انہیں دیکھا پھر ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگی ں۔

''آپ کی کوئی غلطی نہیں۔ غلطی شاید بھائی کی بھی نہیں ہے۔ وہ حالات ہی ایسے تھے۔ اس وقت یہ سب کچھ ایسے ہی ہونا تھا۔ قسمت سے کون لڑ سکتا ہے۔ آپ کی نیت صاف تھی تو اب دل بھی صاف کرلیں۔''

بہن کی محبت بھائی کے لیے ہمیشہ جانبدار ہوتی ہے۔ رشتوں کے معاملے میں، محبت میں ایماندار ہونا یا انصاف کرنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ بھی اپنے بھائی کو بہت خوش اسلوبی سے ہر الزام سے بری الذمہ کر چکی تھیں۔ گزرے وقت میں وہ بہت رو چکی تھیں، اب گزرے وقت پر رونا نہیں چاہتی تھیں۔ ضیا ان کے چہرے پر لرزتے امید و بیم کے سایوں کو دیکھتے کھل کر مسکرا دیے تھے۔ ان کی زندگی میں بیوی اور بیٹے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ان کی خوشی کیسے سبوتاژ کرتے۔ اتنے سالوں کی محبت جو سکون رومانہ کو نہ دے سکی وہ ایک مسکراہٹ دے گئی۔ تلخ یادوں کو بھولنے میں ہی بھلائی تھی۔

☆☆☆

چائے نماز پر بہت دیر رونے کے بعد ان کا دل ہلکا ہو گیا تو وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی آئی۔ رات بھر جاگنے اور رونے کی وجہ سے سر بھاری ہو رہا تھا۔ فہیم کوئی کتاب کھولے بیٹھے تھے۔ چائے کے دو کپ بنا کر وہ ٹرے لیے ان کے پاس ہی آ بیٹھیں۔ چند لمحے خاموشی سے گزرے تھے، پھر فہیم نے اپنا مگ اٹھاتے ہوئے انہیں مخاطب کیا تھا۔

''کسی دن مانہ کو کھانے پر بلالو۔''

انہوں نے عام سے انداز میں کہنا چاہا تھا، جیسے یہ برسوں کی روٹین ہو لیکن لہجے میں پوشیدہ جھجک شازیہ سے مخفی نہ رہ سکی۔

''مانہ تو خوشی سے آئے گی مگر ضیاء بھائی ناراض ہو کر گئے تھے۔ بہتر ہوگا کہ پہلے آپ خود ان سے بات کر لیتے۔ غلط فہمیاں دور ہو جاتیں تو بہتر ہوتا۔''

ماضی کے تلخ حقائق انہیں یاد تھے۔ اسی لیے صائب مشورہ دینا چاہا۔ بچوں کے سامنے دوبارہ کوئی تماشا کرنا اسے مقصود نہ تھا۔ فہیم نے گہری سانس لی تھی۔

''میں بات کرلوں گا۔'' فہیم نے کہا۔ پھر رک کر دوبارہ سوچ سوچ کر بولتے گئے۔

''مانہ میری بہن ہے، بہت لاڈ اٹھائے تھے اس کے، ذرا سی تکلیف پر تڑپ جاتا تھا۔ ضیا بھی میری جان تھا۔ بہت اچھا وقت ساتھ گزارا ہے ہم نے۔ تب جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ محبت سے زیادہ ٹھکرائے جانے کا دکھ تھا، اپنی ذات کی بے توقیری تھی، جو مجھے مشتعل کر رہی تھی۔ میری آنکھوں پر شکست، نارسائی یا احساس توہین کی کون سی پٹی بندھی تھی کہ مجھے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کچھ عرصے بعد ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا مگر میری انا مجھے غلطی تسلیم کرنے کا حوصلہ نہیں دے رہی تھی۔ اس وقت مجھے امی، ابو اپنے دشمن لگے تھے جو مجھ سے زیادہ مانہ کے لیے سوچ رہے تھے، اب میزاب کو دیکھتا ہوں، اس کے لیے سب بہترین چاہتا ہوں تو سوچتا ہوں، امی نے ٹھیک فیصلہ کیا۔ مانہ کے لیے ضیا سے بہتر شریک حیات کوئی نہ ہوتا۔''

آہستہ آہستہ بولتے وہ شازیہ کو دیکھ کر رکے اور قدرے مسکرائے۔ ''اور میرے لیے تم اللہ کا انعام ہو۔ مجھے تم سب کی محبتوں پر یقین ہے۔ ہم اب دوبارہ سے ٹوٹی کہانی کے سرے وہیں سے جوڑیں گے۔ ہم میزاب کی خوشیوں کو ادھورا نہیں چھوڑیں گے۔'' شازیہ کا دل لمحہ بھر کو رکا تھا۔ عمر بھر کی تپسیا تھی۔ جو بار آور ہوئی تھی۔ بہن کی محبت نے زور مارا تھا یا بیٹی عزیز تھی۔ سبب جو بھی تھا، نتیجہ بہت اچھا تھا۔ بیٹے

کا ساتھ دینے والا باپ، آج بیٹی کی دلی خواہش کے لیے اپنی انا قربان کرنے جا رہا تھا۔ بہنوں اور بیٹیوں سے محبت کے بدلے قربانی مانگنے کی رسم ان کے گھر میں ختم ہو رہی تھی۔

☆☆☆

اس سے پہلے کہ اسامہ ماں سے سوالات کر کے پریشان کرتا، ضیا نے اسے ساری تفصیل بتا دی تھی۔ میزاب اس کے ماموں کی بیٹی ہے، یہ جان کر اسے حیرت ہوئی تھی تو پاپا کی بات اسے سوچنے پر مجبور کر گئی۔ پاپا چاہتے تھے کہ وہ چند دن مما کو میزاب کے گھر جانے سے روک کر رکھے۔ مما جیسے بے قرار ہو کر اگلے ہی دن وہاں جانا چاہتی تھیں، یہ ایکسائٹمنٹ نہ ان کی صحت کے لیے بہتر تھی، نہ اس رشتے کے لیے۔ اسامہ سارا دن مما سے پرانی باتیں سنتا اور میزاب کا ایڈریس نہ ہونے کا بہانہ کرتا۔ چند دن گزرے تو اپنے من پسند خوابوں میں خوش رومانہ میزاب کے مستقل یونیورسٹی نہ آنے کا سن کر پریشان ہو گئی تھیں۔ دل میں عجیب خیال آتے، شاید فہیم بھائی نے میزاب کے یونیورسٹی آنے پر پابندی لگا دی ہو۔ ان کا دل واہموں سے لرزتا۔ اس سے پہلے کہ رومانہ کچھ کرتیں، ایک دن فہیم بھائی خود چلے آئے۔ اسامہ اس وقت گھر پر موجود نہیں تھا۔ ضیا نے فہیم کو اتنے سالوں بعد سامنے دیکھا تو خاموش کھڑے رہ گئے۔ فہیم آگے بڑھ کر اس کے گلے لگ گیا۔

"ناراض ہے تو۔" گرمجوش معانقے کے ساتھ بے تکلفی کی حدت نے دل پر جمی خفگی اور سرد مہری کی برف لمحوں میں پگھلائی تھی۔ ضیا نے انہیں خود میں زور سے بھینچا تھا۔ معذرت کے سارے لفظ دہلیز سے باہر رہ گئے اور اندر یادوں کی پوٹلی سے پرانی تصویر نکال کر اسے نیا رنگ دے دیا گیا۔ مانہ کی بے تابی نے انہیں اسی وقت فہیم کے گھر جانے پر مجبور کیا تھا۔

"مانہ کو مجھ سے زیادہ تم سے ملنے کی جلدی تھی۔" فہیم نے مانہ کو شازیہ کے سامنے کھڑا کرتے ہوئے کہا اور گلے لگ کر وہ دونوں سالوں کے آنسو بہانے لگیں۔ بہتے آنسوؤں کے ساتھ چمکتی مسکراہٹ والے چہروں نے صلہ رحمی کی برکت سمجھائی تھی۔

☆☆☆

"پاپا، کہاں چلے گئے تھے آپ، کب سے فون کر رہا تھا۔" ضیا صاحب اندر آئے تو لاؤنج کے صوفے پر آڑا ترچھا لیٹا اسامہ سیدھا ہو کر خفگی سے کہنے لگا۔

"میں نے کہا تو تھا کہ تم سو جاؤ۔" انہوں نے اس کی خفگی کو اہمیت نہیں دی تھی۔

"ایسے کیسے سو جاتا، جب مجھے پتا ہی نہیں کہ آپ لوگ کہاں ہیں اور مما کہاں ہیں، وہ ٹھیک تو ہیں۔" نروٹھے پن سے کہتا وہ ماں کی طبیعت کا سوچ کر بے قرار ہوا۔

"ہاں بھئی، سب ٹھیک ہے۔ تمہاری مما آج اپنے بھائی کے گھر رات گزاریں گی۔ دیکھ لو، ایک دن میں ہمیں بھول گئیں۔"

وہ مسکرا کر کہتے وہیں بیٹھ گئے اور کلائی سے گھڑی اتار کر میز پر رکھی۔

"بھائی کے ہاں مطلب ماموں، آپ لوگ میزاب کے گھر گئے تھے۔" اسامہ خوشی بھری بے یقینی سے ساتھ بیٹھتا پوچھ رہا تھا۔

"جی جناب، میزاب کے ہاتھ کی کافی بھی پی کر آیا ہوں لیکن جو ذائقہ میرے بیٹے کے ہاتھ میں ہے، وہ بہو کے ہاتھ میں کہاں۔ جلدی سے ایک کپ چائے بنا لاؤ۔ یہ کافی میرے مزاج کی چیز نہیں۔"

ضیا نے شرارت سے اسامہ کو چھیڑا تھا۔

"سب ٹھیک ہو گیا نا پاپا، جب صلح ہو ہی گئی تھی تو مجھے بھی وہاں بلا لیتے۔ مجھے کیوں گھر میں پریشان ہونے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔" اسامہ نے ان کی بات پر دھیان دیے بغیر امید بھرے لہجے میں پوچھا اور گلہ کیا۔

"بیٹا جی، چائے کے کپ کے بغیر تو میں بات نہیں کروں گا۔ چائے لے آنا اور جو جاننا ہو جان لینا۔ میں فریش ہونے جا رہا ہوں۔"

ضیا مسکراتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ اسامہ وہیں بیٹھا انہیں جاتے دیکھ رہا تھا۔ کیسی فلمی کہانی تھی اس کے

والدین کی اور اب یہ پاپا کا چائے کا ڈرامہ۔ چائے بنانی ہی تھی اب کہ دل میں بہت کھد بد ہو رہی تھی۔

☆☆☆

انہوں نے رات جاگ کر گزاری تھی۔ جانے والوں کو یاد کر کے آنسو بہائے تھے تو اپنی دوستی کے سلسلے کو وہیں سے جوڑا تھا۔ گزری زندگی کی بے شمار باتیں، واہمے، اندیشے بتاتے شازیہ نے اسے اپنے خوف اور اسجد کی خواہش کا بتایا تھا۔

''چھوڑو بھی بیکار ضد۔ تم فوزیہ باجی سے بات کرو۔ بس اب ہم میزاب اور اسجد کی ایک ساتھ منگنی کریں گے۔ جیسے ہی اسامہ کے امتحان ہوں گے، پھر اکٹھے ان سب کی شادی کر دیں گے۔''

بھائی سے ملنے کی خوشی نے رومانہ کو ماضی والا انداز لوٹا دیا تھا۔ اس نے فوراً سارا پروگرام طے کیا تھا۔

''لڑکی والوں سے بھی پوچھ لیتے ہیں محترمہ۔'' شازیہ نے اسے تنگ کیا۔

''لڑکی والی تو میں خود ہوں۔ میزاب کی پھپھو اور یمنیٰ کی خالہ، دیکھنا فوزیہ باجی مجھے کبھی انکار نہیں کریں گی اور تمہیں تو میں کرنے نہیں دوں گی بھابھی جان، نند ہوں تمہاری۔'' مانہ نے مان بھرے لہجے میں دھونس جمائی اور دونوں ہنس دیں۔

☆☆☆

یہ ایک بعد نور بنا خوب صورت بینکوئٹ تھا۔ رنگین روشنیاں، قہقہے، آوازیں ہر طرف چہل پہل تھی۔ سالوں بعد یہ رونق رومانہ کے سر میں درد کی ٹیس اٹھانے کے بجائے انہیں پرسکون کر رہی تھی۔ وہ مصروف سی ادھر ادھر آ جا رہی تھیں۔ منگنی کے بجائے نکاح کا خیال نئی نسل کا تھا۔ اسامہ کو ضیا نے ماموں کی پابندیوں سے اس قدر ڈرایا تھا کہ وہ نکاح ہی کرنا چاہتا تھا کہ کہیں ماموں میزاب کو منگنی کے بعد پردے میں ہی نہ بٹھا دیں۔ یمنیٰ، اسجد اور میزاب، اسامہ کے نکاح کے بعد انہیں ساتھ ساتھ لا کر بٹھا دیا گیا تھا۔

''میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس قدر آرام سے میری ہو جاؤ گی۔'' اسامہ نے برابر میں بیٹھی میزاب کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

''پلیز سیدھا ہو جائیں۔ سب کے موبائل میں کیمرے ہیں، ڈرون کیمرا پھر رہا ہے، کیوں مذاق بنوانا ہے۔''

میزاب بمشکل بدبدائی تھی۔ اسامہ نے اس قدر غیر رومانوی جواب پر بدمزا ہو کر سیدھا بیٹھتے ہوئے برابر میں نظر ڈالی۔ اسجد اور یمنیٰ کے ساتھ بسمہ، آمنہ، صائم اور فوزیہ خالہ، خالو بیٹھے تصویر بنا رہے تھے۔

یہ ہماری فیملی کہاں ہے، کوئی لفٹ ہی نہیں کروا رہا۔'' وہ پھر میزاب کی طرف متوجہ ہوا۔ میزاب نے سر مزید جھکایا مگر وہ ہو گیا، جس کا اسے خدشہ تھا۔ اسفر پاس آ کر بہت معصومیت سے کہہ رہا تھا۔

''اسامہ بھائی، آپ پریشان نہ ہوں۔ میں نے آپی کو میزاب کی اسپیلنگ کی یاد کروا دی ہے۔''

اسامہ گڑبڑایا۔ پہلی ملاقات کی تفصیل سب کو معلوم ہو گی، اسے اندازہ نہ تھا۔

''اب بس یہ دیکھنا ہے کہ میزاب کیپٹل لیٹرز میں آتا ہے یا اسامہ۔'' فوٹو گرافر نے وہاں کی تصویریں بنا کر اب سب کو ادھر آنے کا کہا تھا۔ اسامہ کے برابر میں آ کر بیٹھتے اسجد نے اسفر کی بات سنی تو شرارت سے ٹکرا جوڑا۔

''یہ بے ایمانی ہے بھئی۔ میں اکلوتا ہوں تو اب میرے ساتھ کون ہو گا۔'' اسامہ نے احتجاج کیا۔

''میں ہوں نا یار۔'' صائم نے اسے حوصلہ دیا۔ ہنستے مسکراتے بچوں کو نیچے سے دیکھتے ان چاروں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ اسٹیج پر سب انہیں بلا رہے تھے۔

''دل صاف ہو تو رشتے کتنے خوب صورت اور ماحول نکھرا نکھرا لگتا ہے۔'' فہیم نے آنکھیں رگڑتے سوچا تھا اور سب کے ساتھ اسٹیج کی طرف بڑھ گئے۔ رشتوں پر طاری خزاں کا موسم بدل گیا تھا۔ اب ہر سو بہار تھی، محبتوں کی بہار۔

نعیمہ ناز

عالیہ بیگم اپنی بیٹی حنہ کے رشتے کے لیے خاندانی لوگوں کی تلاش میں تھیں۔ جب کہ ان کی ساس کا کہنا تھا کہ رشتہ کے لیے دین داری اور شرافت کو ترجیح دینی چاہیے۔

عائشہ اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی۔ رشتوں کے نام پر اس کی ایک خالہ تھیں جن کے دو بچے فہد اور علیزے تھے۔ فہد اپنے باپ کے پاس امریکہ میں پڑھنے گیا تھا۔ اس کی والدہ سلائی کر کے اپنے بچوں کو پڑھا رہی تھیں۔ عائشہ کی سہیلیاں اس کی بے پناہ خوب صورتی کو سراہتی تھیں۔

سید صاحب کو مسجد کمیٹی کا صدر منتخب کیا جا رہا تھا۔ ان کی بیٹی نائلہ ایک خود سر لڑکی تھی، اس کی اپنے شوہر سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ وہ آئے دن اپنے شوہر سے لڑ جھگڑ کر باپ کے گھر آ بیٹھتی۔ اس میں ماں کے مزاج کی جھلک تھی۔ اسے اپنی خوب صورتی پر بہت ناز تھا۔ سید صاحب اس کی طرف سے بہت پریشان تھے۔ نائلہ کے شوہر سرمد کا دوست جمال اس پر مرمٹا ہے۔

چنبلی کا تعلق بازارِ حسن سے ہے طلال شیخ ایک نامور سیاست دان اور جاگیردار کا بیٹا ہے جو چنبلی کے حسن پر مرمٹا ہے۔

شاہ میر رسول بخش کامب سے چہیتا شاگرد تھا، جو ان کے ساتھ ہی رہائش پذیر تھا۔

احمد فجر کے بعد جلدی جلدی گھر سے نکلا۔ آج ڈبل سواری پر پابندی کی وجہ سے پڑوس کے کامران انکل اسے اپنی موٹر سائیکل پر لفٹ نہیں دے سکے۔ اسے کافی انتظار کے بعد بس کی کھچا کھچ بھری چھت پر جگہ ملی۔ انتہائی تیز رفتاری سے موڑ کاٹتے ہوئے کچھ مسافر نیچے جا گرے جن میں احمد بھی شامل تھا۔

سرمد سو رہا ہوتا ہے تو جمال کا فون آتا ہے۔ اپنی بدقسمتی پر کڑھتی نائلہ کو جمال کی کال ایک نعمت لگتی ہے۔ جمال اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اسے پھر سبز باغ دکھاتا ہے۔ اچانک نائلہ کی نظر اٹھتی ہے تو سامنے کھڑا سرمد اسے عجیب نظروں سے دیکھتا نظر آتا ہے۔

طلال چنبیلی کے شادی پر اصرار کرنے پر ہامی بھر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ جلد مہک جان سے بات کرے گا۔ مہک جان سے بات کر کے وہ اس کی شرائط مان کر چنبیلی سے نکاح کر کے لے جاتا ہے۔

احمد کے انتقال کے بعد عائشہ اور اس کی امی بہت سارے مسائل کا شکار ہوتی ہیں لیکن اپنی غیور طبیعت کی وجہ سے کسی سے قرض ادھار نہیں لیتیں۔

ایک سلائی کے سوٹ کے لیے لیس اور دھاگہ خریدنے کے لیے عائشہ کو بازار جانا پڑتا ہے۔ شام زیادہ ہو جاتی ہے، وہ بس کے انتظار میں کھڑی ہوتی ہے مانی بصد اصرار اسے لفٹ دیتا ہے۔ مانی کی امی اور بہن ماریہ گاڑی میں مانی کے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھتی ہیں لیکن پہچان نہیں پاتیں۔ مانی پوچھ گچھ پر ماریہ کے سامنے عائشہ کا نام لے دیتا ہے۔

جمال دوپہر میں فون کر کے نائلہ کو ہوٹل لے جانے کی بات کرتا ہے۔ دروازہ بجنے پر وہ باپ کو دیکھ کر وہ حیران رہ جاتی ہے۔ سید صاحب اس کا فون اٹھاتے ہیں۔ سید صاحب کے جانے کے بعد نائلہ جمال سے ملنے چلی جاتی ہے جہاں وہ ایک دوسرے سے التفات کا اظہار کرتے ہیں۔ جمال اسے اپنے نوتعمیر شدہ بنگلے میں لے جاتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ یہ تمہارا گھر ہے۔

چنبیلی طلال کے ساتھ شادی ہو جانے پر بہت خوش ہے۔ طلال اسے بتاتا ہے کہ ہر چیز جو اسے پسند آ جائے وہ قید کر لیتا ہے اور اس قید سے رہائی اس کی مرضی کے بغیر ممکن نہیں۔

سید صاحب اپنے بیٹے فرحان سے اس کی شادی کی بات کرتے ہیں تو وہ پھر ٹال دیتا ہے حمنہ کے نکاح والے دن مانی، عائشہ کا انتظار کرتا ہے۔ ماریہ جو اس کی ہے اس سے پوچھتا ہے تو وہ بتاتی ہے کہ وہ اپنی امی کو اکیلا چھوڑ کر نہیں آ سکتی۔

عائشہ کی خالہ کا فون آتا ہے وہ عائشہ کی امی سے کہتی ہے کہ جوان بچی کے ساتھ اکیلی کیسے رہو گی میرے پاس آ جاؤ، عائشہ کی امی انکار کر دیتی ہیں اور سوچتی ہیں کہ کب تک بہن کو انکار کروں گی اگر مجھے کچھ ہو گیا تو عائشہ کا کیا ہو گا۔ وہ عائشہ کے رشتے کی بات کرتی ہیں۔

جھکا جان بڑی بی کو ڈانٹتی ہے کہ تم اس انتظار میں رو رو کے کیوں مر رہی ہو، وہ نہیں آئے گا۔ پتا نہیں زندہ بھی ہے یا مر مرا گیا۔ تارا جھکا جان کو کبیر صاحب کے آنے کی اطلاع دیتا ہے۔

نائلہ جمال کے گھر سے آنے کے بعد بھی اسی تصور میں کھوئی ہوئی تھی۔ سرمد آتا ہے تو اسے بخار ہوتا ہے۔ وہ نائلہ سے چائے بنانے کا کہتا ہے نائلہ منع کر دیتی ہے اور گلی کے نکڑ سے اسے چائے لانے کا کہتی ہے۔ واپس آ کر سرمد، نائلہ سے پوچھتا ہی ہے کہ وہ آج دن میں کہاں گئی تھی۔

چنبیلی طلال کو ماں بننے کے متعلق بتاتی ہے تو وہ ناراض ہوتا ہے کہ ہم خاندانی لوگ ہیں ہمارے یہاں خاندانی بیوی سے بچہ پیدا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہ کہتا ہے کہ ہم چھ بھائی ہیں اور چھٹا بھائی لاڈلا چہیتا یہ شادی کے چھٹے مہینہ پیدا ہوا تھا۔

ماریہ، عائشہ کو فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ اس کے رشتے کے لیے شام میں کچھ لوگ آ رہے ہیں۔ مانی اتفاقاً وہاں سے گزرتے ہوئے سن لیتا ہے۔

ظفر صاحب کی بیٹی کو فائرنگ کے ذریعے ڈرا کر ان کو عملی دھمکی دی جاتی ہے۔

چنبیلی بیٹے کی پیدائش پر طلال کی توجہ پا کر پھر اپنا خیال رکھتی ہے لیکن طلال نشے میں چور گھر آ کر اس سے کہتا ہے کہ

وہ اپنی محبوبہ کے پاس سے آرہا ہے۔ جنیلی کے سوال پر کہتا ہے کہ تو تو بیوی ہے محبوبہ تو وہ ہے جو فلیٹ میں رہتی ہے۔

جان محمد کی بیٹی کو ایکسیڈنٹ کے ذریعے مروادیا جاتا ہے۔ اس کی بیوی بین کرتی ہے اور چاچا کے قاتلوں کے نام لیتی ہے اس کی رشتہ دار اسے چپ کرانے کی کوشش کرتی ہیں لیکن وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہوتی۔ میڈیا کے لیے یہ بہت بڑی خبر تھی کیس کے اہم گواہ کی بیٹی کی ایکسیڈنٹ میں موت۔ میڈیا کی بڑی تعداد اس کے گھر جمع تھی۔

ماریہ، شاہ میر کے ہاتھ کا سلا سوٹ دیکھ اس کی تعریف کرتی اور اسے کہتی ہے کہ تم اپنے چاچا کو تنگ کیوں کرتے ہو۔ انہوں نے تمہاری شکایت کی ہے۔ نائلہ سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود اپنی کیفیت خود نہیں سمجھ پاتی۔ وہ ڈرتی ہے کہ باہر جانے پر پہچان لی جائے گی۔ جمال اس کا یہ حل نکالتا ہے کہ اسلام آباد شفٹ ہو جائے۔

امداد بروہی پریس کانفرنس کر کے صفائی پیش کرتا ہے کہ جان محمد کی بیٹی کو مارنے میں اور ظفر صاحب کی بیٹی پر فائرنگ میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔

جان محمد کے جیل میں سارے عیش و آرام ختم ہو چکے تھے، اسے انتہائی بدبودار اور غلیظ کوٹھڑی میں قید کر دیا گیا تھا۔ جب سے اس نے گولی نہ چلانے کا بیان دیا تھا اس پر شدید ٹارچر ہو رہا تھا۔

ترنم نے روتے روتے ارمانوں سے کرایہ پر لیا گھر خالی کیا، اماں دو ملازم ساتھ لائی تھی جو سارا سامان پیک کر رہے تھے۔ اسے تو ہوش نہ تھا ایک سوچ پریشان کر رہی تھی کہ ایسی کیا بات تھی جو اس نے دل پر لے لی اور دل دھڑکنا ہی بھول گیا۔

سامان لوڈ ہو گیا تو اماں نے اسے اور بچوں کو ٹیکسی میں بٹھایا۔ خلیل نے جاتی ٹیکسی دیکھ کر کہا، پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

ایک درمیانے درجے کے ریسٹورنٹ میں ایک عورت چاچا سے ملنے آتی ہے اور پوچھتی ہے کہ میری امانت ہے تمہارے پاس۔ کیسا ہے وہ۔ چاچا کہتے ہی کہ ٹھیک ہے۔ وہاں ماریہ بھی چاچا سے ملتی ہے، وہ اپنی دوستوں کے ساتھ وہاں آتی ہے۔ عورت اٹھ کر چلی جاتی ہے، چاچا کسی سوچ میں گم تھے۔ شاہ میر ایک یتیم خانے میں اپنی آمدنی کا بڑا حصہ خرچ کرتا ہے۔

عالیہ بیگم بیٹی کی شادی کے لیے زیورات نکالتی ہیں، شوہر باتی کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کی پسند کی لڑکی کے گھر کب جانا ہے، وہ انکار کر دیتی ہیں۔

موحد کے کینیڈا جانے کا سن کر کشف موحد سے کہتی ہے کہ وہ بتا کر جاتا تو وہ اپنے باپ کا اتا پتا معلوم کروا لیتی اس سے۔ موحد کہتا ہے کہ تمہاری آنی کا بھی تو کینیڈا میں رابطہ ہے ان کے کزن ہیں وہاں۔ کشف کی حیرانی پر بچھتاتا ہے کہ زینب کی اجازت کے بغیر اسے نہیں بتانا چاہیے تھا۔ وہ کشف سے اس کے والد کا نام پوچھتا ہے اور منصور احمد کا نام سن کر پتھر ہو جاتا ہے۔

سلیمان کو دیکھ کر رمشا جلدی سے آگے بڑھتی ہے۔ وہ ردا کی چوٹ دیکھ کر استفسار کرتا ہے۔ رمشا اور ردا یہ جاننے کے لیے بے چین تھیں کہ کہیں سلیمان نے ان کی باتیں تو نہیں سن لیں۔

کشف زینب سے شکایت کرتی ہے کہ وہ اسے اکیلا چھوڑ کر کیوں گئی۔ زینب پریشان ہوتی ہے کشف کی حالت دیکھ کر۔ وہ اس سلسلے میں صالحہ بانو سے بھی بات کرتی ہے۔

ردا شاپنگ پر جانے سے انکاری ہے، ماں کے سمجھانے پر سلیمان اس کی والدہ رمشا اور سونیا کے ساتھ وہ چلی جاتی ہے، وہاں وہ لوگ کچھ دیر کے لیے سلیمان اور ردا کو بات کرنے کا موقع دیتے ہیں، فرحان اسے سلیمان کے ساتھ دیکھ لیتا ہے۔

منصور زرین سے کہتا ہے کہ اسے دس پندرہ دن کے لیے پاکستان جانا ہے، اس کی بھانجی کی شادی ہے۔

زینب کشف کی وجہ سے پریشان ہے کہ سونیا کے ہاں ایسا کیا ہوا جو وہ وہاں سے آ گئی۔ کشف کہتی ہے کہ وہ

ایک شرط پر بتائے گی کہ زینب اسے بتائے کہ زینب منصور سے کینیڈا میں ملی ہے اور یہ بات اسے ڈاکٹر موحد نے بتائی ہے۔

سونیا نکاح والے دن زینب کو بتاتی ہے کہ منصور پاکستان نہیں آ رہا۔

چنبیلی کی چیخ سن کر جب سب اس کے کمرے میں پہنچتے ہیں تو اس کا چہرہ تیزاب کی وجہ سے موم بتی کی طرح پگھل رہا تھا۔

ترنم کا بیٹا سپارہ پڑھنا شروع کر چکا ہے۔ ترنم بہت خوش ہے۔ اس کی ماں کہتی ہے کہ اپنے بارے میں بھی کچھ سوچو۔ وہ اسے شیخ صاحب کا بتاتی ہے۔ ترنم کہتی ہے کہ میں اپنے دونوں بچوں کو نہیں چھوڑوں گی۔

سومی، نائلہ کو بتاتی ہے کہ جمال پہلے یہاں ہی رہتا تھا۔ چھ مہینے پہلے گیا ہے اور وہ راکٹ کا بڑا بھائی اور اس کا جیٹھ ہے۔ راکٹ کے آنے پر بات مل جاتی ہے۔

جھکا جان طلال کے خلاف ایف آئی آر درج کراتی ہے۔ چاچڑ اسے سمجھاتا ہے کہ پرچہ تو کٹ جائے گا مگر طلال کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

عائشہ جس اسکول میں پڑھاتی ہے وہاں کچھ غنڈے آ کر ان کا سامان اٹھا کر پھینکتے ہیں اور انہیں ڈرا دھمکا کر جاتے ہیں۔

مانی کے لیے یہ بات انتہائی صدمے کا باعث تھی کہ شاہ زین کے گھر والوں نے اس کے قاتلوں سے مذاکرات کر کے کیس ختم کر دیا تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے ذوہیب اپنی امی سے باتیں کر رہا تھا عائشہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہی تھی کہ اچانک ذوہیب ماں کی آواز پر چونکتا ہے وہ بتاتی ہیں کہ ان کے سینے میں شدید درد اٹھا ہے۔ ذوہیب عائشہ سے کہتا ہے کہ ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔ خالہ کی حالت پر عائشہ خود پریشان ہو جاتی ہے۔

امداد بروہی کا بیٹا جیل سے رہا ہو جاتا ہے۔ مانی بہت دل برداشتہ ہے۔ سارہ یوسف زئی، طلال کے مقابلے پر چنبیلی کی حمایت کرتی ہے وہ میڈیا اور سوشل میڈیا پر اس کے لیے آواز اٹھاتی ہے۔

عائشہ کی خالہ کو انجائنا کا اٹیک ہوتا ہے عائشہ اور ان کا بیٹا ذوہیب ان کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ ذوہیب سے کہتی ہیں کہ وہ عائشہ سے شادی کر لے۔

نائلہ، جمال کی وجہ سے پریشان ہوتی ہے۔ پریا کو طلال ملک کا باپ اپنے آدمی کے ذریعے دھمکی دیتا ہے کہ وہ طلال کے حق میں گواہی دے۔ ماریہ دادی سے اپنے بوتیک کے لیے پیسے مانگتی ہے۔

مانی، ماریہ کو لے کر بازار جاتا ہے۔ وہاں اسے عائشہ نظر آتی ہے۔ خالہ جیولر کی دکان پر اس سے پوچھتی ہیں کہ اسے کون سی انگوٹھی پسند ہے۔ مانی یہ سن کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

تیرہویں قسط

مانی اک دم ہی کسی سحر سے آزاد ہوا تھا۔ قدموں کو جما دینے والی برف تڑخ گئی تھی۔ اس کا ٹرانس ٹوٹ گیا اور اس نے غور سے اسے دیکھا جو مڑ کر اپنے ساتھ موجود خاتون سے کچھ کہنے لگی تھی۔ مانی واپس پلٹ گیا۔ گو کہ کبھی واپس پلٹنا، پیچھے جانا آسان تو نہیں ہوتا مگر انسان کے قدم اس کے اختیار میں کب ہوتے ہیں؟ کبھی دل کے کہنے پر آگے بڑھتے ہیں کبھی تقدیر پیچھے ہانک دیتی ہے۔ چاہے انسان کی مرضی ہو یا نہ ہو، بادل نخواستہ، خود پہ جبر کرتا ہوا، خود کو مضبوط بنانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ پیچھے کی طرف ہٹ رہا تھا۔

"چلیں بھائی، ہو گیا میرا کام۔" ماریہ ایک ہاتھ میں اپنا کیچ اور دوسرے میں دو تین تھیلے پکڑے سامنے سے آ رہی تھی۔ اس کا سارا دھیان اور ساری توجہ اپنے ہاتھوں میں موجود تھیلوں پر تھی جنہیں وہ سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

مانی اس کے ساتھ چلتا ہوا تیزی سے پارکنگ کی طرف بڑھا تھا خریداری کے تھیلے پیچھے سیٹ پہ ڈال کر ماریہ نے سکون کا سانس لیا اور تب اس کی غیر ارادی نگاہ اپنے بھائی پر پڑی۔

"کیا ہوا؟" مانی کے چہرے پہ غیر معمولی پن دیکھ کر وہ چونک گئی۔

"کچھ نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے چابی گھمائی، ماریہ یکدم چیخی۔

"عائشہ، بھائی عائشہ!" ماریہ کا لہجہ پُرجوش ہو گیا۔ آنکھوں میں چمک آ گئی۔

"گاڑی تو روکیں، وہ عائشہ ہے ادھر سامنے۔" ماریہ نے جھنجلا کر بھائی کو دیکھا۔ "آخر ہوا کیا ہے، صمّ بکم" بنے بیٹھے ہیں۔"

مانی اس کی بات پر توجہ دینے کے بجائے لاتعلقی سے گاڑی ریورس کر رہا تھا۔

"بھائی صاحب، گاڑی روکیے وہ میری سہیلی ہے عائشہ، وہ رہی سامنے۔" ماریہ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"جانتا ہوں، وہ عائشہ ہے۔" مانی نے بالآخر لب کھولے۔ "مگر رکنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، دریاؤں نے اپنا رخ بدل لیا ہے۔"

اس کے اندر جو ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی، وہ چہرے تک آ گئی تھی۔ خاموشی سے ڈرائیو کرتے ہوئے جانے پہچانے راستے اجنبی لگ رہے تھے۔ وہی راستے تھے، وہی مانی تھا، وہی دل تھا۔ آتے ہوئے کچھ اور تھا اب جاتے ہوئے کچھ اور، لب بھینچے اس کا پتھریلا چہرہ ماریہ کو اب پریشان کر رہا تھا۔

وہ مانی کے کہے گئے فقرے کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ تو طے تھا کہ وہ اب ماریہ کے کسی سوال کا جواب نہیں دے گا، لہٰذا وہ خاموشی سے اپنی عقل کا اینٹینا چاروں طرف گھماتی رہی۔

☆☆☆

دھیرے دھیرے بلند ہوتے سورج نے کچھ دیر بعد بھر بھر کے اپنی کرنوں کے تھال فیاضی سے لٹانے شروع کیے، چاروں طرف نقرئی روشنی پھیل گئی۔ پرانے مگر مضبوط ستون اور بوسیدہ ہوتی بالکونیوں والی یہ بڑی سی عمارت بھی پوری طرح دھوپ اور روشنی میں نہا گئی تھی۔

ادھ کھلی کھڑکی سے داخل ہوتی مسکراتی شعاعوں نے کمرے کے ایک حصے میں ڈیرا ڈال دیا۔ وہیں جہاں نازو اپنے پہلو میں بچے کو لیے بے خبر نیند کی وادیوں میں گھوم رہی تھی۔ چلبلی کرنوں نے بچے کے چہرے پر اٹھکیلیاں کیں، بچے نے دھیرے سے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے تو وہ آنکھیں کھول کر اوپر چھت اور اپنے دائیں بائیں دیکھتا رہا۔

اگرچہ کچھ دنوں سے وہ اس کمرے میں اور اس عورت کی ساتھ تھا مگر ابھی تک یہ در و دیوار، یہ چہرہ یہ لمس اور گود کی گرمی و نرمی، سب اس کے لیے اجنبی ہی تھے، وہ مانوس نہیں ہو سکا تھا۔ کبھی بہل جاتا اور کبھی رو رو کر احتجاج کرتا۔ اس وقت بھی اس نے اپنے برابر لیٹی عورت کو دیکھا، اسے ہاتھ لگایا، مگر وہی اجنبی خدوخال، نامانوس لمس، اس نے منہ بسورتے ہوئے رونے کی تیاری کی۔

''ارے رے.....!'' ناجو فوراً ہی اٹھ بیٹھی، بچے کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور تھپکتے تھپکتے باہر لے آئی۔
''بوا! ذرا پکڑنا اسے، فیڈر بنا دوں اس کی۔'' ناجو نے بوا کے بوڑھے ہاتھوں میں بچہ تھمایا اور پھرتی سے فیڈر بنانے لگی، مگر اتنی دیر میں بچے نے چیخ چیخ کے پوری عمارت بلکہ آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔
''جلدی اٹھنے میں تجھے موت آتی ہے؟ پہلے ہی بنا دیتی، رو رو کر بچہ ہلکان ہو گیا۔'' اندر کے کمرے سے نکل کر باہر آئی جھمکا نے ناجو کو پھٹکارا۔
''میں بنا ہی رہی تھی بس اک دم ہی سُر اونچے کر لیے شہزادے نے۔'' ناجو اس کی پھٹکار کا کوئی اثر لیے بغیر تیزی سے فیڈر ہلا رہی تھی۔ ''ادھر دو بوا۔'' جھمکا نے بوا کے ہاتھوں سے روتے ہوئے بچے کو لیا۔
''چپ ہو جا حرامی کی اولاد، ادھر تیرے باپ نے، ادھر تو نے زندگی حرام کی ہوتی ہے۔'' جھمکا نے زور سے اسے ڈانٹا۔
''اے ہائے، یہ تو معصوم بچہ ہے بے چارا، اس پہ کیوں غصہ نکال رہی ہو، اس کا بھلا کیا قصور؟ ناجو نے فیڈر بچے کے منہ میں دی، وہ فوراً چپ ہو گیا اور دودھ پینے لگا۔
''بچوں کا کوئی قصور نہیں ہوتا مگر یہ زاتو انہیں ہی بھگتنی پڑتی ہے۔'' جھمکا کی سرخ بڑی بڑی آنکھوں میں یکا یک ہی دنیا جہان کی ویرانی سمٹ آئی تھی۔

☆☆☆

''پتا اتنا مشکل نہیں تھا۔ چوک کے سامنے سے ذرا ہٹ کر ایک مسجد، اس سے چند قدم آگے اسکول، اسکول کے سامنے سڑک پار کر کے مختلف دکانیں تھیں، حجام کی، پرچون کی، اسٹیشنری شاپ، اس سے متصل گلی میں دائیں ہاتھ پہ چوتھا مکان، سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ جانا یا نیچے سے چاچا جی کہہ کر آواز لگا لینا، میں تو ہر وقت گھر پر ہی ہوتا ہوں یا.....'' انہوں نے کچھ سوچا۔
''آواز لگانا تو کچھ مناسب نہیں ہوگا، تم مس کال دے دینا مجھے، اگر گھر نہ ملے تو تب بھی فون کر لینا۔'' چاچا نے تفصیل سے اپنا ایڈریس بتاتے ہوئے مشورہ دیا تھا۔
''ٹھیک ہے۔'' اس نے اپنی گردن ہلائی۔
اور اس وقت وہ دونوں دائیں ہاتھ کے چوتھے مکان کے باہر کھڑی تھیں، جہاں سے لوہے کا زینہ اوپر کو جا رہا تھا۔
''مس کال دوں؟'' ماریہ نے سوالیہ انداز میں دانیہ کو دیکھا۔
''اور کتنے کام مجھ سے پوچھ کر کرتی ہو؟'' دانیہ نے اپنی مسکراہٹ دبائی۔
''کیا مطلب ہے تمہارا؟ شتر بے مہار ہوں؟ تمہاری طرح؟'' ماریہ نے اسے گھور کے دیکھا۔
''اچھا مس کال دو اپنے چاچا جی کو، مجھے مت لتاڑو یہاں کھڑے ہو کر۔''
ماریہ ابھی موبائل نکال ہی رہی تھی کہ چاچا سامنے سے آتے دکھائی دیے۔
''شکر، یہ مل گئے گھر پر۔'' ماریہ نے اطمینان کی سانس لی۔
یہاں آنے سے پہلے اور راستے میں بھی اس نے کئی بار رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ہر بار ناکامی ہوئی، بہر حال اب ساری کوفت ختم ہو گئی تھی۔ دونوں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کمرے میں بیٹھی، کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اوپر دو کمروں کچن باتھ روم اور چھوٹے سے صحن پہ مشتمل ایک صاف ستھرا پورشن تھا۔ موزائک کا فرش کچن میں ٹائلز، نیا رنگ و روغن، جس کمرے میں وہ بیٹھی تھیں، وہاں فرنیچر نام کی کوئی شے نہیں تھی، غالیچہ بچھا ہوا تھا، اس پہ بیٹھنے کے لیے دو بڑے بڑے کشن اور دیوار کے ساتھ دو گاؤ تکیے رکھے تھے۔

''بیٹھو بیٹا، ہم پچھلے مہینے ہی یہاں شفٹ ہوئے ہیں، ابھی ساز و سامان نہیں خریدا، بس ضرورت کی چیزیں لی ہیں۔'' چاچا بھی گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

''زیادہ فرنیچر بھی اچھا نہیں لگتا، ایسا لگتا ہے کہ سب کچھ منہ پر آ رہا ہو، یوں بھی اچھا لگ رہا ہے سادہ سا، بس دیواریں خالی خالی لگ رہی ہیں ان پہ کچھ لگا لیں۔'' ماریہ نے بڑی سادگی اور بے تکلفی سے انہیں مشورے دینے شروع کیے۔

''گھر کو بنانے اور سجانے کا کام تو کوئی عورت ہی کر سکتی ہے، ہم مردوں کو اتنا طریقہ سلیقہ کہاں۔'' چاچا بولتے بولتے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''میں ابھی آتا ہوں۔''

برابر والے کمرے میں مشین تقریباً مستقل ہی چل رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے اس کی آواز بند ہوتی اور اس کے بعد پھر شروع ہو جاتی۔

''گھر میں کوئی مہمان آئے تو اخلاقاً سلام دعا کر لیتے ہیں۔'' چاچا اس کے سر پہ کھڑے ہو گئے۔

''آپ کے مہمان ہیں آپ نے نہیں کی سلام دعا؟''

''ہم نے تو کر لی، اب آپ بھی کر لیں اور بچیوں کی خاطر تواضع کے لیے کچھ لے آئیں، مہربانی ہو گی آپ کی، بلکہ عین نوازش ہو گی۔'' چاچا کا موڈ انتہائی خوش گوار ہو چکا تھا۔

''آ رہا ہوں میں، آپ جائیں۔'' شاہ میر نے انہیں ٹالا۔

''یہیں بھیج دوں؟ کپڑے دکھا دینا جو مکمل ہو گئے ہیں؟''

''میں آ رہا ہوں۔'' شاہ میر نے مشین روک دی۔

''ڈرتا کیوں ہے لوگوں سے۔'' چاچا جی اس کی طرف سے مطمئن ہو کر پلٹے۔

''لوگوں سے زیادہ اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے۔'' شاہ میر نامکمل کپڑے کو سوئی سے علیحدہ کر کے تہہ کر رہا تھا۔

☆☆☆

لفافے سے نکال کر کاغذات پڑھنے کی نوبت بھی نہیں آئی، ایک نظر ڈال کر ہی اس کی پیشانی پہ پہلے شکنیں نمودار ہوئیں پھر چہرے پہ غصہ۔

''یہ کیا بکواس ہے؟''

''اسے نکاح نامہ کہتے ہیں اس کے مطابق آپ نے طلال ملک کے ساتھ شادی کی تھی۔''

''میں نے اس درندے سے کوئی نکاح نہیں کیا نہ ہی میرا ایسا کرنے کا کوئی ارادہ ہے۔''

پریا نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔ اس کی خود اعتمادی اور جرات جو کچھ دیر کے لیے زائل ہو گئی تھی، اب پھر عود کر آئی تھی۔ وہ اس اجنبی شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہی تھی۔

''آپ شاید ابھی تک سمجھی نہیں ہیں کہ معاملے کی نوعیت کیا ہے، ہو سکتا ہے کہ میں آپ کو سمجھانے میں ناکام ہو رہا ہوں اس لیے میں شروع سے اور تفصیل سے آپ کو بتاتا ہوں۔'' انتہائی شائستہ لہجے اور نرم آواز میں وہ مخاطب ہوا۔

''بات یہ ہے کہ ملک صاحب کو ہر حال میں اپنے بیٹے کی گردن چھڑانی ہے اس مصیبت سے، جس میں وہ پھنس گیا ہے اور خود چھوٹے ملک جی بھی جلد از جلد اس جنجال سے باہر نکلنا چاہتے ہیں۔ تو اس کے لیے دنیا جہان کے تمام ہتھکنڈوں کے ساتھ ساتھ ایک عدد گواہ اور گواہی کی ضرورت ہے جو اتنی مضبوط اور مکمل ہو کہ ملک صاحب کی رہائی کے لیے وہی کافی ہو جائے تو جب آپ اس نکاح نامے پہ دستخط کر کے عدالت میں گواہی دیں گی کہ اس رات اور اس سے اگلا دن آپ اور طلال ملک ساتھ تھے تو.....''

''اور تمہیں لگتا ہے کہ میں اس خرافات میں ملک کا ساتھ دوں گی اور مان جاؤں گی؟'' پریا نے اس کی بات کاٹ کر استہزائیہ انداز اختیار کیا۔

''کیوں نہیں، اس کے بدلے آپ کو انتہائی پرکشش معاوضہ ادا کیا جائے گا، یہ آپ کے لیے ایک بہترین ڈیل ہوگی جو اس سے پہلے لائف میں آپ نے کبھی نہیں کی ہوگی۔''

''مجھے نہ اس ڈیل سے کوئی دلچسپی ہے نہ ہی کسی بھی پرکشش معاوضے سے۔'' پریا نے لب سکوڑے۔

''دنیا میں موجود ہر دولت مند کو اپنی دولت پیاری ہوتی ہے۔ ہر مشہور کو اپنی شہرت پیاری ہوتی ہے۔ ہر تخلیق کار کو اپنی تخلیق، ہر حسین کو اپنا حسن اور ہر نفس کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے، کیا آپ کو اپنا حسن اور زندگی پیاری نہیں؟''

''تم ڈرا رہے ہو مجھے؟''

''بالکل، کیونکہ مجھے اسی کام کے لیے بھیجا گیا ہے۔'' اس نے ہاتھ میں موجود پستول لہرایا۔ ''میں اس کے ذریعے آپ کو یہاں یا باہر کہیں بھی شوٹ کر سکتا ہوں، میں آپ کی گردن میں رسّی باندھ کر اس پنکھے سے یوں لٹکا سکتا ہوں کہ وہ خودکشی لگے اور میں.....'' وہ اٹھ کر اک دم ہی پریا کے قریب آیا۔ پریا نے چیخنے کے لیے منہ کھولا مگر اس سے پہلے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پریا کی گردن پہ جما دیے، اس کی آواز گلے میں ہی گھٹ گئی، پریا نے مزاحمت کرتے ہوئے اس شخص کے ہاتھ اپنی گردن سے ہٹانے چاہے مگر ناکام رہی، وہ اس مضبوط گرفت کو ٹس سے مس بھی نہ کر سکی، جو لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ پریا کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں اور آنکھیں حلقوں سے باہر آ رہی تھیں۔

''اور میں یوں آپ کا گلا دبا کر ابھی اسی وقت آپ کو دنیا سے رخصت کر سکتا ہوں۔'' وہ پریا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی سفاکی سے بول رہا تھا۔

☆☆☆

آفس نیا مگر سادہ تھا۔ جس عمارت میں وہ آفس تھا، وہ کوئی بہت بڑی یا جدید قسم کی عمارت نہیں تھی مگر جس مقصد کے لیے اسے کرایہ پر لیا گیا تھا اس مقصد کے لیے موزوں تھی۔

اندر داخل ہو کر اس نے چاروں طرف جائزہ لیا اور متذبذب سی کھڑی رہی۔

''یہاں آؤ اور بیٹھو، یہ تمہاری سیٹ ہے، بلکہ تمہاری ذمے داری۔'' مانی نے اس کا تذبذب بھانپ لیا تھا۔

''بہت بڑی ذمے داری اور اعتبار دے دیا ہے آپ نے، پتا نہیں میں آپ کے اعتماد اور امیدوں پہ پوری بھی اتروں گی یا نہیں۔'' وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس کرسی کے قریب آ گئی تھی۔

''یہ میرا نہیں کسی اور کا اعتبار ہے اور دراصل یہ ہماری اپنی ہی امیدیں ہیں، ہمارے اپنے خواب ہیں، اور اپنے خوابوں کو پورا کرنا اتنا مشکل بھی نہیں ہوتا۔'' وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گیا۔

''اپنے خوابوں کو پورا کرنا اتنا آسان بھی نہیں ہوتا۔'' کوئی اس کے اندر سے چلّا رہا تھا اسے۔ ایک زخمی مگر تیکھی مسکراہٹ کے ساتھ۔

''کیا ہوا مدثر صاحب؟'' اس کے یکدم خاموش ہونے پر ماروی متعجب ہوئی۔

''کچھ نہیں۔'' مانی نے سر جھٹکا۔

''باقی افراد سے آپ مل ہی چکی ہیں، اگرچہ ابھی لوگ زیادہ نہیں ہیں مگر چراغ سے چراغ جلانے کی شروعات تو ہو گئی ہے۔''

''لوگ زیادہ ہوں نہ ہوں۔ جذبہ زیادہ ہونا چاہیے۔'' ماروی اب تک کھڑی تھی۔

''بیٹھ جاؤ ماروی!'' اسے مستقل کھڑے دیکھ کر مانی نے نرمی سے کہا۔
''بیٹھنے کا تو کام ہی نہیں ہے، جس مقصد کے لیے کھڑے ہوئے ہیں، اس میں بیٹھنے کا لمحہ خطرناک ہو سکتا ہے۔'' ماروی اپنا موبائل آن کر کے کچھ آپشنز کھول رہی تھی۔
''یہ دیکھیے، بلکہ پڑھیے۔'' اس نے اپنا موبائل مانی کی طرف بڑھایا۔
مانی اس بلاگ کو پڑھ رہا تھا اور اس کی پیشانی پہ شکنیں نمودار ہو رہی تھیں۔ یہ بلاگ کچھ عرصہ پہلے ہی نمودار ہوا تھا مگر اپنے متنازعہ بلاگز کی وجہ سے بہت جلد اور بہت تیزی سے مشہور ہو رہا تھا۔ اس بلاگ میں بھی اس نے تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کے حوالے سے اپنے ذاتی خیالات کو تاریخی حقائق کا نام دے کر پیش کیا تھا۔
اس قسم کے کتنے ہی لبرلز اور دانش ور ہماری تاریخ اور تاریخی شخصیات کو مسخ کرنے میں مصروف ہیں۔'' مانی نے موبائل اس کی طرف واپس بڑھایا۔
''تم تو خود بہت اچھی بلاگر ہو، اس موضوع پہ لکھ سکتی ہو۔''
''میں لکھوں گی، مگر میں یہ چاہتی ہوں کہ آپ اس پر کالم لکھیں۔''
''میں اس موضوع پر پہلے بھی لکھ چکا ہوں، صحافتی دنیا کے ایک جانے پہچانے دانشور پلس لبرل کالمسٹ نے میرے وہ لتے لیے کہ کیا بتاؤں۔'' مانی کچھ سوچ کر مسکرا اٹھا۔ ''مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں نے ان کی کسی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دیا ہے اور وہ بلبلا اٹھے۔''
''ہیلو ایوری باڈی!'' ایک ہنستے مسکراتے چہرے نے خوش دلی اور بلند آواز سے اندر آتے ہوئے کہا۔
''آئی ایم سارری فرینڈز، پہلے ہی دن میں لیٹ ہوں مگر اس میں سارا کمال اس ٹریفک جام کا ہے جس میں تقریباً آدھ گھنٹہ میں پھنسی رہی ہوں۔'' آنے والی نے کرسی پہ تقریباً ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔
''سڑکوں پہ ٹریفک کا جو حال ہے، جسمانی تھکن تو ہوتی ہی ہے ذہنی تھکاوٹ الگ ہے۔ ویسے میں سوچ رہی ہوں، بائیک چلانا شروع کر دوں، شوقیہ سیکھی تھی مگر میری امی نے ڈر کے مارے چلانے نہیں دی سڑکوں پہ۔''
اس نے پانی کی بوتل بیگ سے نکال کر ڈھکن ہٹایا اور بوتل منہ سے لگائی۔
''بالکل ٹھیک کیا تمہاری امی نے، یہاں کی سڑکیں اور ٹریفک ہرگز اس قابل نہیں کہ ان پر کوئی بھی موٹر سائیکل چلا سکے۔ وہ بھی ایک لڑکی؟ پہلے ہی اتنے لوگ اپنی جان ہتھیلی پہ رکھ کر گھوم رہے ہیں بائیکس پر۔''
''تو پھر؟ کیا معاملات اور مسائل کو جوں کا توں چھوڑ دیا جائے یا ان کی نشان دہی کر کے بہتری کے لیے کوشش کی جائے؟''
''بالکل کی جائے مگر اپنی جان کی حفاظت مقدم رکھ کر۔'' مانی نے زور دے کر کہا۔
''ٹھیک ہے مائی لارڈ! اور آپ دونوں اگر میرے اعزاز میں کھڑے ہیں تو پلیز تشریف رکھیے۔'' اس نے ایسے انداز میں کہا کہ مانی اور ماروی دونوں ہی نے تجمل ہو کر کرسیاں سنبھال لیں۔

☆☆☆

بڑی مشکل سے زندگی کچھ سنبھلی تھی، کچھ سکون ہوا تھا کہ دل ابھی اضطراب کی حالت میں ہی تھا مگر امید تو باقی تھی۔ اب یکا یک ہی معاملات زندگی گرداب کی زد میں آ گئے تھے، وہ بولائی ہوئی تھی اور دوسرا فریق بھی شاید بوکھلایا ہوا تھا۔ تبھی تو اسے دیکھتے ہی پکار اٹھا۔
''ذرا ٹھہرو عائشہ! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔'' ٹیرس پہ اسے دیکھتے ہی واپس پلٹتی عائشہ ٹھہر گئی۔
''تمہیں معلوم تو ہوگا کہ امی نے اپنی ایک خواہش ظاہر کی ہے ہم دونوں کے متعلق تم پریشان لگ رہی

ہو؟" اس نے غور سے عائشہ کا چہرہ دیکھا۔

"ہونا بھی چاہیے، میں خود فکر مند ہو گیا ہوں۔" وہ دھیرے سے مسکرایا، پھر یکا یک سنجیدہ ہو گیا۔ "دراصل یہ معاملات اتنے آسان نہیں ہوتے، جتنا کہ ہمارے بڑے سمجھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کے زمانے میں آسان ہوتے ہوں یا انہیں لگتے ہوں مگر میرے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ میں یہ فیصلہ اتنے آرام سے اور چند گھنٹوں یا چند دنوں کے نوٹس پہ کر لوں، میرا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو اپنے دل پہ یقین رکھتے ہیں تم بھی اچھی، بہت پیاری لڑکی ہو، تم سے پہلے کئی لڑکیاں تھیں میری دوستیں، میرے حلقہ احباب میں شامل، مگر کسی پہ بھی دل نے کلک نہیں کیا، کہیں آ کر میں رکا نہیں کہ یس شی از....." وہ بولتے بولتے ایک لمحے کو رکا۔

"اگر اتنی لمبی تقریر مجھے سنانے کے بجائے اپنی ممی جان کو سناتے تو شاید کچھ فائدہ ہوتا۔" عائشہ کے چہرے پہ خفیف سی بے زاری چھائی۔

"تم یقیناً سوچ رہی ہو گی کہ میں یہ سب باتیں ممی سے کہنے کے بجائے تم سے کیوں کہہ رہا ہوں۔"

اپنی دھن میں بولتے بولتے اس نے عائشہ کا چہرہ نہیں دیکھا تھا جہاں شرمندگی کا ایک سایہ سا تھا جیسے زوہیب نے اس کے دل کی چوری پکڑ لی ہو، اس کے ذہن کو پڑھ لیا ہو مگر وہ باہر آسمان کی طرف نگاہ کیے سفید بادلوں کے تیرتے ٹکڑوں کو دیکھ رہا تھا اور اکا دکا نظر آنے والے پرندوں کو۔

عائشہ نے ایک نظر اس پر ڈالی، جو کچھ کہہ رہا تھا، مگر کیا؟ عائشہ کو اس کے ہلتے لب نظر آ رہے تھے مگر آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اپنے خیالوں میں گم وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی تھی۔

"یہ شخص اچھا ہے، بہت اچھا ہے مگر ہر اچھا فرد ہمارے دل کی سلطنت کا حکمراں نہیں بنتا، وہ بس ایک ہی ہوتا ہے، اس کے ہاتھ میں ہماری ساری طنابیں ہوتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے، سمجھ گئیں؟" زوہیب نے اپنی بات ختم کی۔

"ہوں!" عائشہ نے بغیر سوچے سمجھے سر ہلایا، خدا جانے کیا کہا تھا آگے اس نے، کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ دھیان ہی کہیں اور بھٹک گیا تھا۔

"جانے کے بعد میں تمہیں کال کروں گا۔" اس نے مزید کہا۔

"کیوں؟" عائشہ الجھن میں پڑ گئی۔

☆☆☆

پاؤں کے تلووں پہ لگی مہندی سوکھ چکی تھی، وہ آرام سے نیچی چوکی پہ پاؤں رکھے لیٹی تھیں، لال، سوکھی مہندی کو ہاتھوں سے رگڑ کر اتار رہی تھی۔ وہ خود لیٹے لیٹے اپنی بیٹی کو لتاڑ رہی تھیں۔

"دیکھ، اب تو زیادہ مینا کماری نہ بن، تو نے اپنی ہر ضد پوری کر لی۔ یہاں سے الگ ہو کر گھر بسا کر بھی دیکھ لیا، پھر بیٹے کو پڑھانے کی خواہش بھی پوری کر دی تیری، اب بچی کے معاملے میں ٹانگ مت اڑا، اسے پڑھوانا ہے تو گھر پر ہی ماسٹر صاحب بھی آ جائیں گے اور مولوی صاحب بھی، باقی جو سیکھنا ہے وہ میں خود سکھاؤں گی، ہمیں بھی کوئی آسرا سہارا چاہیے کل کے لیے یا نہیں؟" بڑی بی کی زبان قینچی سے بھی زیادہ تیز چل رہی تھی۔ ترنم نے بے چارگی اور بے بسی سے ماں کی طرف دیکھا۔

"ان کا باپ انہیں پڑھا لکھا کر کچھ بنانا چاہتا تھا۔" اس کی آنکھوں میں گزرا وقت لہرایا اور نمی بن کر پھیلتا چلا گیا۔

"ترنم! مجھ سے یہ فضول باتیں نہ کیا کر، خوابوں کی دنیا میں رہنا چھوڑ دے اور حقیقت کو تسلیم کرنا سیکھ، ہمارے بچے بڑے ہو کر وہی بنیں گے، جو ہم ہیں، چوزہ بڑا ہو کر مرغی ہی بنتا ہے مور نہیں بنتا، اتنے اونچے اونچے خواب نہ دیکھ۔ دھڑام سے نیچے گرے گی تو بہت چوٹ لگے گی۔" وہ اکثر ہی اس طرح کے لیکچر بیٹی کو دیتی رہتی تھیں۔

''چاند بابو ہے نا ہمارے بڑھاپے کا سہارا۔'' ترنم نے کمزوری آواز میں دفاع کرنے کی کوشش کی۔
''ہم جہاں رہتے ہیں پگلی، ہمارا سہارا ہماری بیٹیاں ہوتی ہیں، بیٹے نہیں اپنے بیٹے پہ اتنا گمان نہ کر، اعتبار جتنا زیادہ ہوتا ہے، دکھ بھی اتنا ہی بڑا ہوتا ہے۔'' ماں کی باتوں میں عمر بھر کا تجربہ اور مشاہدہ بول رہا تھا۔
''لڑکے کے معاملے میں تو نے اپنی مرضی چلالی۔ اب منی کے معاملے میں میری مرضی چلے گی۔'' ان کا لہجہ قطعی، فیصلہ حرف آخر اور بات پتھر پہ لکیر تھی۔

☆☆☆

گرم گرم سموسوں کی مہک، خالی پیٹ میں ادھم مچاتے چوہوں کی وجہ سے اور بھی بھلی لگ رہی تھی۔ ماریہ اور دانیہ نے بغیر کسی تکلف کے سموسے پلیٹ میں منتقل کیے اور وہاں سے اپنے پیٹ میں۔
''یہ بھی تو لو بیٹا، اپنا گھر سمجھ کر کھاؤ۔ تکلف نہ کرو۔'' چاچا نے ان کی پلیٹوں میں اور سموسے رکھے اور گلاب جامن بھی، ساتھ ساتھ تکلس بھی رکھ دیے یہ کہتے ہوئے کہ۔ ''یہ تم لوگوں نے لیے ہی ہیں۔''
''بس کریں انکل!'' دانیہ نے انہیں روکا۔
''ختم کرنا ہے سب کچھ، یہاں کون ہے کھانے والا، یہ لڑکا تو بس کھاتا نہیں سونگھتا ہے۔'' وہ بہت خوش اخلاق اور متواضع میزبان تھے۔
''آپ فکر نہ کریں انکل، جتنا کھا سکتے ہیں کھائیں گے، جو بچے گا اپنے ساتھ لے جائیں گے۔'' دانیہ نے مذاق میں کہا۔
''بہت فری ہو رہی ہو؟'' ماریہ نے اس کے کہنی ماری۔
''آخر تمہارے چاچا ہیں۔'' دانیہ کی سرگوشی بڑی معنی خیز تھی۔
ماریہ نے اسے تنبیہی نظروں سے گھور کے دیکھا پھر چاچا سے مخاطب ہوئی۔
''شادی میں ضرور آیئے گا۔''
حمنہ کی شادی کا کارڈ دینے وہ یہاں آئی تھی۔ مگر ان کے غیر معمولی پروٹوکول پر دانیہ کی معنی خیز نگاہیں اور فقرے اب برداشت سے باہر ہو رہے تھے، وہ اٹھنے کے لیے پر تول رہی تھی اور دانیہ کا دور دور تک کوئی ارادہ نہیں لگ رہا تھا۔
''لگتا ہے شاہ میر کو ہماری آمد اچھی نہیں لگی۔'' دانیہ نے پھر شوشا چھوڑا۔
''نہیں، نہیں ایسی کوئی بات نہیں، دراصل ہمارے گھر مہمان بہت کم آتے ہیں، بلکہ سمجھو کہ نہ آنے کے برابر ہی ہیں تو اسے عادت نہیں ہے۔ لوگوں سے ویسے ہی گھبراتا ہے۔'' چاچا نے شاہ میر کا دفاع کیا۔
''خصوصاً لڑکیوں سے۔'' دانیہ نے دھیرے سے ماریہ کے کان میں لقمہ دیا۔
''بہت بولتی ہو۔'' ماریہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
''اچھا انکل، شادی میں ضرور آیئے گا۔'' ایک بار پھر انہیں تاکید کر کے دونوں چل پڑیں۔

☆☆☆

اس کی سانسیں رک رہی تھیں۔ آنکھیں ابل کر باہر آ گئی تھیں، ہاتھ پیروں کی مزاحمت دم توڑتی جا رہی تھی، دھیرے دھیرے تاریکی میں ڈوبتا دماغ ایک ہی حقیقت بار بار دہرا رہا تھا۔
''میں مر رہی ہوں۔''
''میں مرنا نہیں چاہتی۔'' اس کے اندر سے بہت طاقتور آواز اٹھی تھی اس نے بری طرح تڑپتے ہوئے آخری بار اپنے ہاتھ پیر چلانے کی کوشش کی اور اچانک ہی اس کی گردن اس سخت شکنجے سے آزاد ہوئی جس میں وہ پھنسی ہوئی تھی۔ بری طرح کھانستے ہوئے وہ دوہری ہو گئی۔

''اف!'' خود کو سنبھالنے کی کوشش میں وہ بری طرح ناکام ہو رہی تھی۔ غیر متوازن دھڑکن اور کانپتے ہاتھ پیروں کو قابو کرنے کی کوشش میں اس کی نگاہیں اس اجنبی کی نظروں سے ٹکرائیں جو آج اس کا قاتل بنتے بنتے رہ گیا تھا۔

''موت بہت خوفناک ہوتی ہے۔ تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا۔'' بے حد اطمینان سے کرسی پہ بیٹھتے ہوئے وہ بول رہا تھا۔ ''زندگی کا مشکل سے مشکل معاملہ اور برے سے برا انسان بھی موت کے مقابلے میں گوارا لگتا ہے، قابل قبول ہو جاتا ہے۔''

پریا نے اپنے کانپتے ہاتھ پیروں کو قابو کر لیا تھا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی مگر پورے بدن میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ اگر اس کی شہ رگ پہ چند منٹ اور یہ دباؤ برقرار رہتا تو اس وقت وہ مردہ حالت میں پڑی ہوئی ہوتی، سوچتے ہوئے اسے اک دم جھرجھری آ گئی۔

''کیا اب تمہیں یقین آ گیا کہ موت سے بُرا کچھ نہیں ہوتا۔'' وہ مسکرا رہا تھا۔ اپنے زرد پڑے چہرے کے ساتھ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی۔

''پھر کیا کرنا ہے مجھے؟'' پریا کی سماعتوں نے اپنی کمزوری آواز سنی۔

☆☆☆

''سارے ہی کپڑے چھوٹے ہو گئے، کیسے اک دم سے قد نکالا ہے ماشاء اللہ گھٹنوں تک قمیص اور ٹخنوں سے اوپر شلوار پہنے بیٹے کو اس نے بیک وقت تفکر اور فخر سے دیکھا۔

''آج ہی ماسٹر جی کو بلاتی ہوں، چاند کا ناپ لے کر کچھ جوڑے سی دیں گے۔ پرانے والے تو سب اٹنگے سے ہو گئے۔'' دل ہی دل میں سوچتے ہوئے وہ بیٹے کی طرف متوجہ ہوئی جو رحل اور قرآن شریف اتار رہا تھا۔

''کتنے سپارے رہ گئے؟''

''چار!'' حسب معمول مختصر جواب ملا۔

وہ شروع سے ہی کم گو اور ذرا سنجیدہ مزاج تھا۔ اپنی بہن کے بالکل برعکس، جو اتنی ہی باتونی اور چنچل تھی۔ اسے گھر پہ پڑھانے ایک ٹیوٹر آتا تھا۔ نانی کی سرپرستی میں یہاں کے ماحول اور رسم و رواج کے مطابق تربیت حاصل کر رہی تھی۔ چاند عمر کے ساتھ ساتھ شعور اور عقل کی منزلیں بھی طے کر رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اسے ادراک ہو رہا تھا کہ جہاں وہ مولوی صاحب سے قرآن پڑھنے جاتا ہے، وہ دنیا الگ ہے اور جہاں وہ رہتا ہے، وہ ایک مختلف دنیا ہے مگر ابھی اپنے محسوسات اور خیالات کو پوری طرح وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا وہ سوچنے لگا تھا کئی سوالات ابھرتے تھے دل میں، مگر انہیں زبان تک نہیں لاتا تھا کبھی اسے ڈر لگتا تھا ان سوالات کو پوچھتے ہوئے اور کبھی اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ان سارے سوالات کے جوابات جانتا ہے۔

اسے سب معلوم ہے پھر سوال کرنے کا فائدہ؟ سنجیدگی کے ساتھ ساتھ وہ تنہائی کا بھی شکار ہوتا جا رہا تھا۔ اتنی بڑی دنیا اور ارد گرد لوگوں کے ہجوم میں بس گنتی کے دو چار افراد تھے جن سے اسے کچھ انسیت یا لگاؤ محسوس ہوتا تھا۔

ان میں سرفہرست مولوی صاحب تھے جو بہت محبت سے اسے پڑھاتے تھے اور انتہائی شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ ان کے مزاج میں سختی کے بجائے ایک نرم دلآویزی اور ٹھہراؤ تھا۔ چھٹی کے بعد جب سب بچے شور مچاتے اپنی اپنی رحل، سپارے، قاعدے اور قرآن اٹھائے گھر بھاگنے میں جلدی کرتے تاکہ کھیل کود سکیں۔ مگر چاند ان سب بچوں کے برعکس مولوی صاحب سے اجازت لے کر وہیں ٹھہر جاتا تھا۔ وہ مسجد سے ملحق دو کمروں کے کوارٹر میں اپنی بیوی اور پانچ بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ بڑی دو لڑکیوں کی شادی کر دی تھی۔

اب پانچ لڑکے تھے سارے حفظ کر رہے تھے۔ وہ چاند کو اپنے گھر لے جاتے تھے۔ عصر کی نماز کے بعد سارے بچے اپنا روز کا سبق دہراتے تھے۔ مغرب کی نماز پڑھ کر کھانا کھاتے تھے۔ اب اکثر مولوی صاحب اسے

کھانا کھلا کر واپس بھیجتے تھے۔

ان کی بیوی پردہ کرتی تھیں۔ چاند کے سامنے نہیں آتی تھیں مگر چاند کو ان کا گھر، اس گھر کا سادہ سا رہن سہن، معمولی ساز و سامان اور غریبانہ سی فضا بہت متاثر کرتی تھی۔ یہاں اس کے اپنے گھر کی طرح بھنے بھنے گھی میں تر بتر بارہ مسالوں والے انواع و اقسام کے مرغن کھانے نہیں پکتے تھے، مگر جو بھی سادہ سے کھانے یہاں پکتے تھے، نرم گرم چپاتی کے ساتھ وہ بھی اچھے لگتے تھے۔

جمعرات کو ان کے محلے کے بہت سے گھروں سے کھانا آتا تھا۔ اس دن مولوی صاحب کی بیوی کو رات میں کھانا پکانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

اس دن بھی حسب معمول وہ کھانا کھا کر ان کے گھر سے نکلا دو بڑی سڑکیں، تین گلیاں اور ایک پوری لائن بازار کی دکانوں کی، پھر چوراہا گھوم کر وہ بڑی سی بلڈنگ آتی تھی۔ جس کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ ابھی بے زاری اور کوفت کا تو نہیں مگر الجھن کا شکار ضرور ہونے لگا تھا۔

''ماں صدقے، ماں واری، آ گیا میرا بیٹا۔'' ترنم دوڑ کر اس کے پاس آ کر چومنے لگی، چند گھنٹے جو یہ نگاہوں سے اوجھل رہتا تھا تو اس کے لیے یہ وقت گزارنا مشکل ہو جاتا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد گھڑی کی سوئیوں کو دیکھتی رہتی جو اسے ایک جگہ ٹھہری ہوئی محسوس ہوتی تھیں، پتا نہیں کتنی سستی ماری گھڑی ہے، سوئیاں چلتی نہیں رینگتی ہیں، اکثر بلند آواز میں اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتی اور ماں سے ڈانٹ کھاتی۔

''اری کم بخت پہلے باپ کے پیچھے باؤلی تھی، اب بیٹے کے لیے دیوانی ہوئی جاتی ہے۔ باز آ جا بے وقوف، اتنی محبت کسی کو بھی راس نہیں آتی۔''

''چھوڑو بھی اماں! کیا اس ڈر سے کوئی محبت کرنا چھوڑ دیتا ہے کہ یہ راس آئے گی کہ نہیں؟'' ترنم کو ماں کی ڈانٹ پہ ہنسی آ جاتی۔ ''یہ جو تم ڈانٹتی ہو یہ بھی تو پیار میں ہی ڈانٹتی ہو۔''

''تیری طرح باؤلی دیوانی نہیں ہوں میں۔'' بیٹی کے ہنسنے پر وہ بھڑک اٹھیں۔

''اچھا چلو ہم باؤلے دیوانے ہی سہی۔'' ترنم ان کے دیے ہوئے القابات کو گلاب جامن سمجھ کر نگل جاتی تھی۔

☆☆☆

دوپہر کی تیز دھوپ، غریب کی جوانی کی طرح بہت جلد ڈھل کر دیواروں پہ ٹھہری تھی مگر یہ بھی بس ذرا دیر کے لیے تھی، اس کے بعد اسے سرمئی شام میں بدل جانا تھا۔

کھڑکی سے باہر ڈھلتی ہوئی زرد دھوپ کو بے دلی سے دیکھتے ہوئے اس نے پردہ برابر کیا اور تھکی تھکی سی آ کر صوفے پہ بیٹھ گئی، تھکن جسمانی نہیں ذہنی تھی۔ سارا دن فارغ اور بے کار بیٹھے بیٹھے الٹے سیدھے خیالوں میں الجھتی رہتی، سومی سے کبھی بات کرنے یا کوئی سوال کرنے کی کوشش کرتی مگر وہ طرح دے جاتی، اکثر تو راکٹ بھی آدھا آدھا دن گھر پر ہی ہوتا تھا اپنی لچھے دار باتوں اور چرب زبانی سے نائلہ کو مطمئن تو نہیں مگر خاموش ضرور کر دیتا تھا۔

آج تو راکٹ گھر پر نہیں تھا۔ سومی کچن میں کچھ پکا رہی تھی، مسالہ بھننے کی خوشبو فضا میں پھیل رہی تھی۔

''کیا پکا رہی ہو؟'' نائلہ کچن کے دروازے میں کھڑی ہو گئی۔

''گوشت۔'' ایک نظر نائلہ پر ڈال کر سومی نے مختصر جواب دیا۔

''تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''تین سال ہو گئے۔'' خلاف توقع اس نے آسانی اور شرافت سے جواب دیا تھا۔

''ایک بیٹا ہوا تھا، فوت ہو گیا۔'' نائلہ کے سوال کیے بغیر ہی سومی نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

نائلہ اندر آ کر کاؤنٹر کے پاس کھڑی ہو گئی۔

''افسوس ہوا سن کر۔'' اس نے سوی کی طرف دیکھا جو بے تاثر چہرہ لیے مسالہ بھوننے میں مگن تھی۔
''تمہیں افسوس ہوا ہے، مجھے بہت غم ہوا تھا۔''
''اولاد کے جانے کا غم ماں، باپ ہی سمجھ سکتے ہیں، کوئی اور اس دکھ کو ان کی طرح محسوس نہیں کر سکتا۔'' نائلہ بولتے بولتے اچانک ہی خاموش ہوئی، اس کے ذہن میں یکا یک اپنے باپ کا چہرہ ابھرا تھا۔
''پتا نہیں، ان کو کتنا اور کیسا غم ہوا ہوگا.....''
وہ عجیب کیفیت کا شکار ہونے لگی۔ کوئی کوئی خوش نصیب لمحہ ہوتا تھا جب اسے پچھتاوے اور ندامت کا احساس ہوتا تھا۔ پہلے وہ اس لمحے کو گزر جانے دیتی تھی، اس احساس کو دماغ سے جھٹکنے کی کوشش کرتی تھی۔ اگرچہ اب ایسے لمحے اور ایسے احساس کو کچھ دیر گرفت میں لیے سوچتی رہتی، مگر راستہ کوئی دکھائی دیتا تھا نہ بجھائی دیتا تھا، چاروں طرف ایک تاریکی تھی اور اس تاریکی میں کہیں کنواں بھی تھا اور کھائی بھی، وہ قدم آگے بڑھا سکتی تھی نہ پیچھے ہٹا سکتی تھی۔
''سوچتی بہت ہو۔'' سوی گوشت میں پانی ڈال کر ڈھکن ڈھک رہی تھی۔
''اور کچھ تو بس میں نہیں، خیال ہی سہی، جن کی دنیا اپنی دسترس میں ہے۔''
نائلہ نے اسے دیکھا جو آج پہلی بار اتنی مہربان نظر آ رہی تھی کہ اس کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی وہ بھی نرم اور مہربان لہجے میں، نائلہ کو محسوس ہوا کہ اس لمحے سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔
''تم جمال کو کیسے جانتی ہو؟ کون ہے وہ؟''
ہاتھ دھوتی سوی کے ہاتھ ایک لمحے کو رکے مگر پھر اس نے اطمینان سے ہاتھ دھوئے، آرام سے گیس بند کیا اور پھر بڑے سکون کے ساتھ وہ واپس مڑی تو وہی پہلے والی سوی تھی۔ کچھ اکھڑ اور کچھ بدمزاج۔
''راکٹ سے پوچھ لینا۔'' اس کی آنکھوں اور لہجے سے وہ نرم تاثر ختم ہو چکا تھا۔
''وہ تو کچھ بتاتا ہی نہیں، ٹال دیتا ہے۔''
''جمال بھائی سے پوچھ لینا، جب فون آئے تو۔'' سوی نے ہاتھ خشک کرتے ہوئے دوسرا آپشن دیا۔
''وہ بھی کچھ نہیں بتاتے، کس سے پوچھوں؟''
''یہ سب تفتیش شادی سے پہلے کرنی تھی نا، اب کیا فائدہ؟''
''پھر بھی مجھے معلوم تو ہونا چاہیے نا۔'' نائلہ کی تاویل شاید کمزور تھی تب ہی وہ ہنس دی۔
''کیا کرو گی معلوم کر کے، اگر کچھ الٹا سیدھا معلوم ہوا تو کیا چھوڑ دو گی اسے اور چھوڑ کر جاؤ گی کہاں؟'' سوی اسے وہ آئینہ دکھا رہی تھی جسے وہ دیکھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔
''میری مانو تو ان سب چکروں میں مت پڑو، وہ کون ہے، کیسا ہے کیا ہے؟ سوالوں کے بغیر زندگی آرام سے گزرتی ہے، جواب ڈھونڈنے کے چکر میں بندے کی مٹی پلید ہو جاتی ہے۔''
آج پہلی بار وہ ناصح بن رہی تھی اور کسی حد تک غم گسار بھی۔ اسی لمحے نائلہ کا موبائل بجنے لگا، وہ بھاگی، جمال کا فون آ گیا۔
''ہیلو!'' نائلہ کی آواز میں خوشی کی لہر تھی۔
''نائلہ! شام میں تیار رہنا، میں لینے آ رہا ہوں۔'' جمال نے بغیر کسی تمہید کے یہ دو فقرے کہے تھے اور پھر زیادہ بات کیے بغیر فون بند کر دیا تھا مگر نائلہ کے لیے یہ مختصر بات بھی نئی زندگی کی نوید تھی۔ کچھ دیر پہلے کے خیالات، پچھتاوے سب یکدم فراموشی کے غلاف میں چھپ گئے۔

☆☆☆

اُف، صرف دلہن کی اپنی تیاری ہی ایک فکر نہیں بلکہ دلہن کی بہن کی تیاری بھی ایک ٹینشن سے کم نہیں ہوتی یہ

نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا، بیوٹیشن بھی اس کی ہدایت یا فرمائشوں سے شاید تنگ آ گئی ہوگی مگر پھر بھی ماریہ کے حسب منشا اس نے تیار کر ہی دیا۔

''میک اپ اتنا تیز اور گہرا بھی نہ ہو کہ اوور لگے نہ اتنا ہلکا کہ وہ دلہن کی بہن ہی نہ لگے۔'' خدا خدا کر کے تیاری مکمل ہو ہی گئی۔

ڈریسنگ روم سے نکل کر وہ ہال میں آئی، ابھی تھوڑے مہمان آئے تھے چند قریبی عزیز و اقارب تھے۔ بارات نکلنے میں کچھ دیر تھی، وہ لوگ بذات خود تو وقت کے پابند تھے مگر جن باراتیوں کو اکٹھا کر کے لا رہے تھے۔ ان کی اکثریت لیٹ لطیف تھی، پھر بھی انہوں نے فون پہ ابو جان کو تسلی دی تھی کہ کوئی تیار ہو یا نہ ہو جلدی آئے یا دیر میں، وہ آدھ گھنٹے بعد دولہا کو لے کر نکل جائیں گے۔

سامنے سے سید صاحب آ رہے تھے عارف کے ہمراہ۔

''یہ لو، تمہارے سسرال والے آ گئے۔'' ماریہ نے فروا کو ٹہوکا دیا۔

''جاؤ سلام کر کے آؤ۔'' فروا نے مسکراہٹ دبائی۔ پرسوں ہی مایوں مہندی والے دن وہ اس شخص سے باقاعدہ منسوب ہوئی تھی، دل ایک انوکھی تال پہ دھڑکنے لگا تھا۔

''میری سسرال ہے یا تمہاری؟ تم جاؤ، سلام بھی عرض کرو، آداب بھی۔'' ماریہ شوخی سے مسکرائی۔

یہ دونوں یہیں کھڑی نوک جھونک کر رہی تھیں جب امی کی نظر سید صاحب اور عارف پر پڑی، وہ مہمانوں سے علیک سلیک کرنے آگے بڑھ گئیں۔ ماریہ نے تاسف سے فروا کی طرف دیکھا۔

''اچھا بھلا چانس مس کر دیا۔''

''پوری زندگی پڑی ہے، بہت مواقع آئیں گے۔'' فروا نے ماریہ کے چٹکی بھری جو حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی، ایسا چٹ پٹا جملہ اور ایسی دلکش مسکراہٹ؟

''آپ کو بھی بولنا آتا ہے؟''

☆☆☆

کچن انواع و اقسام کی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ خالہ اگرچہ پہلے ہی اپنے کک کو تفصیلی ہدایات دے چکی تھیں پھر بھی ہر تھوڑی دیر بعد وہ کچن میں جا کر جائزہ لے آتیں۔ بے حد خوب صورت ڈیزائنر سوٹ میں ملبوس، انہوں نے نئے انداز میں بال ترشوائے تھے، بالوں کا رنگ بھی تبدیل کروایا تھا جو ان کی عمر اور رنگت کے لحاظ سے بہت سوٹ کر رہا تھا، مناسب میک اپ اور ڈائمنڈ کی قیمتی مگر ہلکی پھلکی جیولری نے ان کی شخصیت میں چار چاند لگا دیے تھے۔ مجموعی طور پر وہ بہت پرکشش اور دیدہ زیب شخصیت کی مالک لگ رہی تھیں۔

''خالہ! آپ بہت خوب صورت لگ رہی ہیں۔'' عائشہ ان کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکی۔

''تھینک یو سوئیٹی۔'' انہوں نے پیار سے اس کے گال تھپتھپائے، ویسے تو ان کا مزاج عموماً اچھا ہی رہتا تھا مگر آج خوش گوار سے بھی زیادہ خوش گوار تھا۔ آج صبح دس بجے کی پرواز سے ان کے شوہر اور بیٹی ان کے پاس آ گئے تھے خوشی دوہری تھی، جو ان کے چہرے اور مسکان سے ہی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

اتنے میں علیزے وہاں آ گئی، جینز اور کالر والی گلابی شرٹ، اس کے تراشیدہ بال اس کے شانوں پہ بکھرے ہوئے تھے۔

''کچھ دیر آرام کر لیتیں، تھک گئی ہوگی اتنی لمبی فلائیٹ سے۔'' خالہ تیزی سے بیٹی کی طرف بڑھیں۔

''میری تھکن کی فکر نہ کریں، اس لمبی فلائیٹ کو میں انجوائے کرتی ہوئی آئی ہوں۔'' وہ صوفے پہ بیٹھ کر لاؤنج کا جائزہ لینے لگی۔ ''کلر اسکیم اچھی ہے یہاں کی۔'' تبصرہ کرتے ہوئے وہ عائشہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

''تمہارا سوشل ورک کیسا چل رہا ہے؟'' وہ اسکائپ کے ذریعے خالہ کے ساتھ ساتھ عائشہ سے بھی رابطے میں رہتی تھی۔

''یہاں سے تو ختم ہو گیا ہے، پلاٹ کے حوالے سے مقدمہ چل رہا ہے، بچوں کو حرا نے کسی این جی او کے ایجوکیشن پراجیکٹ میں مرج (ضم) کر دیا ہے، وہ خود بھی جوائن کر چکی ہے، مجھے بلا رہی تھی، ابھی میں نے کچھ سوچا نہیں ہے۔ ایگزیم کے بعد دیکھوں گی۔'' عائشہ نے تفصیلی جواب دیا۔

''اور تمہارے کیا ارادے ہیں؟''

''میں پاپا کے ساتھ آفس جوائن کروں گی۔'' علیزے نے ڈرائی فروٹس کی پلیٹ میں سے کچھ کا جوا اٹھا کر منہ میں ڈالے۔

''اور سسرال کیا میں جوائن کروں گی؟ تین پروپوزل آئے ہوئے ہیں، کسی ایک کو تو اوکے کرو۔'' خالہ یکدم چمک کر بولیں، دونوں بے ساختہ ہنس پڑیں۔

''وہ پروپوزل نہیں ہیں مما، ان کے نزدیک میں ایک لڑکی نہیں ایک پیکیج ہوں، گرین کارڈ ہولڈر، امیر کبیر پیکیج، سو فی الحال تو اس معاملے کو ایک طرف کر لیں۔ لائف انجوائے کرنے دیں ابھی۔''

''کسی کی نیت پہ ایویں شک نہیں کرتے، تمہیں کیا معلوم، کون لالچی ہے، کون بے غرض۔'' امی نے نکتہ اٹھایا۔

''یہ تو آپ کو بھی نہیں معلوم پھر کیسے فیصلہ کریں گی؟''

''اللہ پہ بھروسا کرتے ہوئے انسان کام کرتا ہے۔'' خالہ نے جواب دیا۔

''یہی تو، بس سب کچھ اللہ پہ چھوڑ دیں، جو وہ بہتر سمجھے گا، وہی سامنے لے آئے گا۔'' علیزے چہکی۔

''صاف صاف کہو کہ ابھی شادی نہیں کرنی۔'' دونوں کی یہ بحث آئے دن کا معمول تھی۔

''شادی، پارٹ آف لائف ہے می، ایم آف لائف (مقصد زندگی) نہیں۔''

''تم ینگ جنریشن، بڑوں کے تجربات کو خاطر میں نہیں لاتے ہو، خود ہر بات کا ایکسپرینس کرنا چاہتے ہو۔'' خالہ نے ایک گہری سانس لی، شادی بیاہ کے معاملے میں وہ ایک روایتی ماں ہی تھیں، جنہیں اب یہ فکر تھی کہ ان کے بچے اپنی زندگی کا یہ اہم فیصلہ بھی کر ہی لیں، مگر بچے تھے کہ پیٹھ پہ ہاتھ ہی رکھنے نہیں دیتے تھے۔

☆☆☆

بہت دیر پیراکی کے بعد وہ سوئمنگ پول سے باہر نکلی، متناسب جسم سے ٹپکتے پانی کے قطروں کو سفید بڑے سے تولیے نے سمیٹ لیا تھا۔ ڈھلتی شام کی خوش گوار ہوا جسم و جان کو بھلی لگ رہی تھی۔ کرسی پہ نیم دراز ہو کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

''مری والی ڈیل سمجھ لو بس ہاتھوں سے نکل گئی ہے۔ ریزوٹس کے نقشے اپنے لاکر میں سنبھال کر رکھ لو۔'' برابر والی کرسی پہ لیٹے فرمان خان نے بڑی ملائمت سے اطلاع دی۔

''مجھے معلوم تھا کچھ نہ کچھ ہوگا، ملک ہے ہی کمینہ اور پاجی، جب تک وزارت اس کے پاس ہے، ہمارے پلان کا کچھ نہیں ہوگا۔'' سارہ پھنکاری۔

''وہ اتنا کمینہ اور پاجی بھی نہیں ہے جوابی کارروائی پر تم نے اسے مجبور کیا ہے۔'' فرمان نے اپنا سگار سلگایا۔

''اپنے بیٹے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

''میں نے؟ میں نے مجبور کیا ہے اسے؟ اس کے بیٹے کی حرکتیں اسے جیل میں لے کے گئی ہیں۔ میں نے کیا کیا ہے؟'' سارہ نے ناگواری کا اظہار کیا۔

''تم بیچ میں نہ آتیں تو۔''

''میں نہ آتی تو کوئی اور آ جاتا۔'' سارہ نے اپنے شوہر کی بات کاٹی۔
''وہ کوئی اور، تم تو نہ ہوتیں۔''
''کام کی بات کرو، اب کیا کرنا ہے؟'' سارہ نے اکتا کر سوال کیا۔
''باہر نکل آؤ اس معاملے سے، تمہاری وجہ سے بھی میڈیا نے زیادہ اچھالا ہے، ورنہ اتنی اہمیت کہاں ملنی تھی اسے، ایسے واقعات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔'' فرمان کا لب ولہجہ لاپروائی کا رنگ لیے ہوئے تھے۔
''تمہیں یقین ہے کہ اگر میں خاموشی اختیار کرلوں تو ریزولیوشن کے نقشے لا کر میں نہیں رکھنے پڑیں گے۔'' سارہ نے شوہر کی طرف گردن گھمائی۔
''ڈیل تو یہی ہوئی ہے۔'' گھنی مونچھوں تلے فرمان کے لب مسکرائے۔
''سارے معاملات طے کر کے پھر آئے ہو مجھ سے بات کرنے؟ اگر میں نے انکار کر دیا تو؟''
''نہیں کر سکتیں۔'' فرمان نے نفی میں سر ہلایا پھر اسے مشورہ دیا۔
''ایک معمولی سے سوشل ورک کے پیچھے اپنا بزنس برباد مت کرو۔''
''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ معاملہ ملک کی منسٹری ڈیل کرے گی، پہلے تو.....''
''پہلے کی باتیں جانے والوں کے ساتھ گئیں، نئے لوگ اپنا قانون اپنے ساتھ لاتے ہیں تم بتاؤ کیسے ہینڈل کرو گی آگے سب کچھ؟'' فرمان سنجیدہ ہو گیا۔
''میں کرلوں گی مینج، مرد سے پیچیدہ کچھ نہیں دنیا میں، جب انہیں ہینڈل کر سکتی ہوں تو معاملات کیا ہیں۔'' سارہ یوسف زئی کا دعوا کچھ غلط بھی نہ تھا۔
اگلے ایک ہفتے میں بساط پہ ایستادہ مہروں کی جگہ تبدیل ہو کر بازی ہی پلٹ گئی تھی۔

☆☆☆

شادی ہال دھیرے دھیرے مہمانوں سے بھرنے لگا تھا۔ بارات آ گئی تھی۔ نکاح تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس لیے تھوڑی دیر بعد کھانا کھولنے کا ارادہ تھا۔ اسٹیج پر دولہا دلہن کا مہمانوں کے ساتھ تصاویر اور مووی کا سیشن جاری تھا۔
دادی بہت مصروف تھیں۔ پرانے رشتے داروں سے بس خوشی غمی کے موقع پر ہی ملاقات ہوتی تھی، وہ جہاں بیٹھی تھیں وہاں آس پاس انہی کے ہم عمر یا کچھ چھوٹے، کچھ بڑے مرد و خواتین کا جمگھٹا لگا تھا۔ سب کے سب بیک وقت ایک دوسرے کی کتھا سن بھی رہے تھے اور اپنی سنا بھی رہے تھے۔
''دادی کی تو آج عید ہو گئی۔''
ماریہ ان کے پاس سے گزرتے ہوئے مسکرائی، ابھی وہ وانیہ سے مل کر آئی تھی اور اچانک ہی اس کی نگاہ اس کونے پر پڑی جہاں چاچا اور شاہ میر کچھ الگ تھلگ سے کھڑے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ شاید اس کو ہی دیکھ رہے تھے، کیونکہ وہی تھی جو اکلوتی میزبان تھی ان کی، باقی تو وہ کسی کو نہیں جانتے تھے۔
''السلام علیکم چاچا جی اینڈ شاہ میر۔'' ماریہ نے ان کے قریب پہنچ کر سلام کیا۔ آنے کا شکریہ ادا کیا اور اپنی خوشی ظاہر کی۔
''شکریہ تو ہمیں ادا کرنا چاہیے کہ تم نے بلایا، اسی بہانے ہمارا بیٹا بھی اپنی تنہائی کے اعتکاف سے باہر نکلا۔''
اگرچہ چاچا جی نے ماریہ کی طرف جھک کر ذرا دھیمی آواز میں کہا تھا مگر شاہ میر تک ان کی آواز پہنچ گئی تھی۔ وہ شکایتی نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا، جب ماریہ کے قریب سے گزرتا عارف ٹھہر گیا۔ آج کی تقریب کا دوسرا مہمان خصوصی دولہا کے بعد وہی تھا، ہر پانچ منٹ بعد اس کو کسی نہ کسی سے ملوایا جا رہا تھا، اس بار وہ بے چارہ اخلاقاً خود ہی رک گیا شاید یہ بھی کوئی رشتے دار ہوں۔

ماریہ نے دونوں مہمانوں کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا۔
"جیتے رہو، ماشاء اللہ۔" چاچا کھڑے کھڑے رسمی سی گفتگو کر رہے تھے عارف سے، شاہ میر نے بھی اسے مبارک باد دے دی، ماریہ انہیں چھوڑ کر آگے بڑھی۔ "دو چار قدم پہ ایک کزن نے اس کا بازو دبوچا۔
"تم نے بتایا نہیں فروا کا کوئی دیور بھی ہے؟"
"یہ جو عارف بھائی کے ساتھ لڑکا کھڑا ہے، فروا کا دیور ہے نا!" پتا نہیں وہ شکایت کر رہی تھی یا تصدیق؟
"عارف بھائی اکلوتے ہیں، ان کا کوئی بھائی نہیں ہے، ایک بہن تھیں، ان کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔" ماریہ نے جلدی جلدی اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
"پھر یہ کون ہے؟ کزن ہے کوئی، دونوں کی شکل کتنی مل رہی ہے، بھائی لگ رہے ہیں۔" وہ محترمہ اپنے قیاس پر مصر تھیں۔
"لگ رہے ہوں گے مگر ہیں نہیں۔"
ماریہ ان سے جان چھڑا کر آگے چل دی پھر کچھ سوچ کر واپس پلٹ کر اس نے چاچا جی کی سمت دیکھا جہاں عارف اور شاہ میر کھڑے تھے، کچھ دیر تک وہ دونوں کو باری باری دیکھتی رہی۔
"واقعی، دونوں میں کتنی مشابہت ہے، سگے بھائی لگ رہے ہیں حیرت ہے میں نے پہلے غور نہیں کیا۔" ماریہ بھونچکا سی۔

☆☆☆

آنکھوں کے سامنے سے وہ منظر ہٹتا نہیں تھا، آنکھیں کھولنے پر بھی، بند کرنے پر بھی ایک ہی چہرہ، ایک ہی منظر۔
"میں تم سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتی۔" تھک ہار کے اس نے اعتراف کیا۔
یہ اعتراف وہ خود سے ہی کر سکتی تھی، اس کے سامنے تو وہ بے اختیار نہیں ہوئی، شاید ہو جاتی، اگر خالہ ساتھ موجود نہ ہوتیں تو، تو شاید، وہ اس کی طرف بڑھتی، جسے دیکھا تھا، جسے دیکھنے کی خواہش شدید تھی، بات کرنے کی تمنا شدید تر، وہ بات کر ہی لیتی اگر خالہ اچانک ہی اس سے انگوٹھی خریدنے کا مذاق نہ کرتیں، عائشہ گھبرا گئی، اور خالہ کے ہنسنے پر بھی اسے اطمینان نہ ہوا۔
وہ اس وقت اور بھی گھبرا گئی جب اسے دور جاتے ہوئے دیکھا، وہ عائشہ کی سمت بڑھ رہا تھا۔ پھر پیچھے کیوں ہٹنے لگا؟ قریب آتے آتے کوئی دور جانے لگے تو بڑی تکلیف ہوتی ہے، عائشہ بھی کرب میں مبتلا تھی، آتے آتے وہ کیوں نہیں آیا؟ کیا وہ بدل گیا تھا؟ جذبے ختم ہو گئے؟ دل بدل گیا؟ کیا ہوا؟
بظاہر تو ایسی کوئی مجبوری اور وجہ نظر نہیں آ رہی تھی پھر پلٹنے کا سبب؟ عائشہ سوچ سوچ کر تھک گئی تھی مگر سوالات پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے اور نیند تھی کہ دامن چھڑا کے بھاگ رہی تھی۔
اور میں جو سمجھتی تھی کہ خاموشی کا رشتہ، ان کہی کی ڈور بھی مضبوط ہوتی ہے، اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے تو کیا میں غلط تھی؟
عائشہ کے سارے سوال، سارے شکوے، ساری شکایتیں، حکایتیں، سب کچھ اپنے آپ سے تھا، اتنی بڑی، انسانوں سے بھری دنیا میں، ایک وقت ایسا بھی آتا ہے انسان پہ، کہ اسے کوئی رازدار ملتا ہے نہ غم گسار، اپنی باتیں، اپنے دل کی حالتیں، خود اپنے آپ سے ہی بیان ہوتی ہیں، اپنی حالت پہ خود ہی ہنسی آتی ہے اور خود ہی رونا بھی، اپنے آنسو صاف کرنے کے لیے اپنے ہی ہاتھ اٹھتے ہیں اور غم سے بوجھل دل کو جب کوئی شانہ میسر نہیں ہوتا تو اپنی ہی گھٹنے، پیٹ کی طرف مڑتے ہیں، جن پہ سر رکھ کر دل کا بوجھ ہلکا کیا جاتا ہے۔
آنسو ہمیشہ کمزوری کی علامت نہیں ہوتے، کبھی یہ جذبے کی شدت کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ ایک طاقتور جذبہ انسان کو اور آنسوؤں کو بے اختیار کر دیتا ہے۔ مگر عائشہ رونا نہیں چاہتی تھی، چاہے جذبے کی شدت کتنی طاقتور ہو، وہ خود

کو کمزور نہیں کرنا چاہتی تھی، مگر بے بسی اور بے مائیگی کا احساس طغیانی کے آگے لگے بند میں دراڑیں ڈال رہا تھا۔
وہ اٹھ بیٹھی، لیپ ٹاپ کھول کر دیکھنے لگی، وہ خوش شکل نوجوان، جس کے لفظوں کے سہارے عائشہ نے ایک نئی مگر ممنوعہ وادی میں قدم رکھا تھا اور اب تک اسی وادی میں سرگرداں و حیراں تھی۔
وہ پُرجوش بے فکرا، کھلنڈرا نوجوان اب نہ اتنا بے فکرا رہا تھا نہ کھلنڈرا، البتہ پرجوش پہلے سے زیادہ ہو گیا تھا، اور پہلے کی طرح گم نام بھی نہیں تھا، ایک مخصوص حلقے میں اس کے نام اور کام کی شہرت تھی۔ اسے ڈھونڈنا اتنا مشکل نہ تھا پہلے کی طرح، مگر ضروری تو نہیں کہ جسے انسان ڈھونڈ لے، اسے پا بھی لے؟ مدثر احمد کا پیج دیکھتے ہوئے عائشہ دل گرفتگی سے سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

حروف الگ الگ بے ترتیب ہوں یا منظم ہو کر کوئی لفظ بناتے ہوں، چاند بابو کے لیے اب اجنبی نہیں رہے تھے، لفظوں سے مانوس ہو چکا تھا، اب اسے اچھے بھی لگنے لگے تھے، ناظرہ قرآن پاک تو اب تکمیل کے مراحل میں تھا، مگر تعلیم کی جستجو نے اس کی محنت لگن اور وقت مزید بڑھا دیا تھا۔
مولوی صاحب سے اردو قاعدے کا سبق لے کر وہ لکھنا، پڑھنا سیکھ رہا تھا۔ مدرسے کا وقت ختم ہوتے ہی مولوی صاحب کے ساتھ ان کے چھوٹے سے گھر چلا جاتا، جہاں وہ گھر کا ہی ایک فرد بن گیا تھا۔ مولوی صاحب اسے اپنا چھٹا بیٹا کہنے لگے تھے، ان کے ساتھ ان کے گھر میں وقت گزارنا اسے اچھا لگتا تھا، حالانکہ اس کی ماں جو اس پہ واری صدقے جاتی تھی، اسے بری تو نہ لگتی تھی اور نانی جو اس کے لاڈ اٹھاتی تھیں، ان سے بھی کوئی خاص کدورت نہ تھی اسے۔
مگر پھر بھی عجیب بات تھی جیسے جیسے وہ بڑا ہو رہا تھا، اپنے آپ سے، اپنے ماحول سے، اپنے پس منظر سے واقف ہو رہا تھا، ایک گریز اور کھنچاؤ اس کی طبیعت میں، مزاج میں، شخصیت میں، پنپنے لگا تھا۔
وہ اپنی ماں سے نفرت نہیں کرتا تھا، ناپسند بھی نہیں کرتا تھا انہیں، پھر بھی ایک لاتعلقی کا، سرد مہری کا بیج اس کے اندر پڑ گیا تھا۔ دھیرے دھیرے کونپل بھی نکل آئی تھی۔
مکمل طور پر وہ ان سب سے فرار حاصل نہیں کر سکتا تھا، خواہش اور چاہنے کے باوجود بھی، یہاں سے کہیں جانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا، لہٰذا اس نے وقتی فرار اور گریز کا راستہ ڈھونڈ لیا تھا، گھر سے پڑھنے کے لیے جو نکلتا تو بس رات گئے سونے کے لیے ہی آیا کرتا تھا اور تو کون اس کا منتظر رہتا۔
ایک ماں ہی تھی جو آنکھیں دروازے پہ ٹکائے رہتی تھی۔ بیک وقت متفکر بھی، خوش بھی، پریشان بھی مطمئن بھی، اس کے دیر سے آنے کی فکر تو ہوتی مگر پھر یہ بھی سوچتی کہ وہ پڑھ رہا ہے۔
یہ طمانیت بھی کافی تھی اس کے لیے اب وہ انتظار میں تھی کہ جلد از جلد بیٹے کا قرآن ختم ہو تو اس کی آمین کی تقریب دھوم دھام سے کرے اور یہ وقت آنے میں زیادہ دیر نہ تھی۔

☆☆☆

سردی بس رخصت ہو رہی تھی، پھر بھی ہلکی ہلکی دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔ دادی کھلے صحن میں تخت پر براجمان تھیں، گرمیوں میں یہی تخت اندر برآمدے میں آ جاتا۔
شریفہ خاتون نے کریلے چھیل کر نمک لگا کر دھوپ میں رکھے تھے اب فرصت اور فراغت سے دادی کے پاس بیٹھی تھی، کچن کی صفائی ستھرائی وہ نمٹا چکی تھی۔ دادی حسب معمول سلائیاں اور اون کا گولہ لیے اپنے شغل میں مصروف تھیں۔
"ارے بھئی شریفہ خاتون! ذرا اخبار کی سرخیاں تو سنانا۔" دادی ان لوگوں میں سے تھیں جو ٹی وی

اور اخبار کی خبروں سے ہولتے بھی رہتے تھے، کلستے بھی تھے، کڑھتے بھی تھے اور اپنا خون وجی دونوں جلاتے تھے مگر خبریں سننا یا پڑھنا ترک نہیں کرتے تھے، اب دادی جان ننگ میں مصروف ہوتیں تو شریفہ خاتون کے ذمے لگا دیتیں، وہ ساری سرخیاں پڑھ کر سنا دیتی۔

''روز کی وہی خبریں ہیں دادی! ہر شے مہنگی ہوگئی، انسان اور روپیہ سستے ہوگئے۔ پڑھ پڑھ کر دل جلتا ہے۔'' شریفہ خاتون نے اخبار اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھیں، پٹرول پہ پھر پیسے بڑھ گئے، اب تیل گھی، سبزی پھل سے لے کر کرایہ تک ہر چیز مہنگی ہوگی، پہلی خبر ہی آفت تھی ہمیشہ کی طرح، یہ لوگ ہم غریب عوام کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے۔'' شریفہ بڑبڑائی۔

''جس کی نہ چھٹی ہو لوائی، وہ کیا جانے پیڑ پرائی۔'' دادی نے ناک کی پھنگ پر چشمہ ٹکا کر حکومت وقت پہ تبصرہ کیا اور سلائیوں پہ اون سرکا کر خانے گننے لگیں۔

''اسرائیل نے مسلمانوں کے خلاف بھارتی اقدامات کی تعریف کی۔'' شریفہ بی بی نے دوسری خبر پڑھی۔

''ہاں بھئی گدھے کو گدھا کھجاتا ہے۔'' دادی کے تبصرے پہ شریفہ مسکرا دی۔

''یہ لو دادی! ٹرمپ نے پھر ایران سے پنگا لے لیا، ان کے جنرل کو مار دیا۔''

''اے ہائے، یہ تو ہے ہی بس کی گانٹھ، ہر جگہ اپنے سینگ گھسا تا رہتا ہے۔ آبلا گلے پڑ، نہیں پڑتی تو بھی پڑ۔'' دادی نے اون کا لڑھکتا گولہ پکڑتے ہوئے منہ بنایا۔

''گیس کی بندش پہ عوام کا احتجاج۔

بہت شوق تھا عوام کو تبدیلی لانے کا، اب آ گئی تو واویلا کیسا، اوکھلی میں سر دینے سے موصلے تو پڑتے ہی ہیں۔ اب چیخیں نکل رہی ہیں۔'' دادی نے طنز کیا۔ حالانکہ عوام الناس میں بلکہ متاثرین میں تو خود ان کا اپنا شمار بھی ہوتا تھا۔

''دادی! گیس تو ہماری طرف بھی بہت کم آ رہی ہے، اتنی پریشانی ہو رہی ہے کیا بتاؤں۔'' شریفہ خاتون نے بے دلی سے اخبار ایک طرف ڈال دیا۔

''پہلے تو بجلی، پانی کا رونا تھا اب چولہوں سے گیس بھی غائب ہوگئی۔ مہنگائی دیکھو تو اگلے پچھلے سارے ہی ریکارڈ ٹوٹ گئے، اوپر سے وزراء اور مشیران کے دل جلانے والے بیانات، ٹماٹر ستر روپے کلو، آلو پانچ روپے کلو، ہیلی کاپٹر کا کرایہ پچاس روپے، کیا سارے مسخرے ہمارے ملک میں ہی ہیں؟''

☆☆☆

کرسی سنبھال کر ماریہ بیٹھ تو گئی مگر دل میں کھد بد ہو رہی تھی، ریسٹورنٹ باہر سے دیکھ کر اب اندرونی جائزہ لیا۔ اس نے جانچتی ہوئی نگاہوں سے دانیہ کو دیکھا۔

''ایسی کیا بات ہے جو بتانے کے لیے اتنا مہنگا لنچ کروانے لے کر آئی ہو؟''

''یہ!'' دانیہ نے اپنا دایاں ہاتھ اس کے سامنے کیا، چمکتا ہوا چہرہ اور دمکتی ہوئی انگوٹھی، دونوں کے بعد اب اسے زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔

''تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آ گیا؟'' ماریہ نے پرجوش ہو کر اپنے انداز میں مبارک باد دی۔

''آ گیا، مگر بہت دور سے آیا ہے۔'' دانیہ کی مسکراہٹ کوئی خاص گلو لگا کر آئی تھی، لبوں سے جدا ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

''کتنے سمندر، کتنے پہاڑ، کتنے صحرا عبور کر کے آیا ہے جوان؟''

''ناروے سے آئے ہیں۔'' دانیہ کا لہجہ اور الفاظ بھی تمیز دار ہو گئے تھے۔

''بس اچانک ہی سب کچھ ہو گیا جلدی جلدی، پرسوں دیکھنے آئے کل انگوٹھی پہنا گئے، میری کزن کے دیور

ہیں، پہچان بین کی ضرورت ہی نہیں پڑی، پھپھو اور نرمین آپی نے اتنی تعریفیں کیں کہ امی ابو مطمئن ہو گئے۔"
وانیہ نے اب ذرا تفصیل بتائی۔
"کام کرنے دیں گے شادی کے بعد؟" ماریہ کو اچانک اپنا بوتیک یاد آیا، ابھی ڈھنگ سے تو کیا بے ڈھنگی شروعات بھی نہیں ہوئی تھیں۔ سارا منصوبہ کاغذوں اور دماغوں میں تھا۔
"اگلے مہینے شادی ہے اور شادی کے بعد اپنے ساتھ ہی لے جائیں گے۔" وانیہ کا انکشاف تھا کہ بم کا گولہ جو ماریہ کے سر پہ پھٹا۔
"اور ہمارے بوتیک کا کیا ہوگا؟" انتہائی صدمے سے ماریہ تو اک دم ہی شل ہو گئی۔
"کوئی اور پارٹنر ڈھونڈ لینا۔"
"کہاں سے ڈھونڈوں؟ لائف پارٹنر ڈھونڈنا تو پھر بھی آسان ہے، بزنس پارٹنر ملنا اتنا آسان نہیں۔" وانیہ کی لاپروائی بلکہ اپنے حسابوں سنگ دلی پر ماریہ تو بس سلگ ہی گئی۔
"تمہیں میری منگنی اور شادی کی خوشی نہیں ہو رہی، بس اپنے بوتیک کا غم کھائے جا رہا ہے۔" پیاری سہیلی کے یوں سلگنے پر وانیہ کا خوشیوں بھرا معصوم دل تڑپ کر رہ گیا۔
"ہاں، خوشی تو ہے، مبارک ہو بہت بہت تمہیں، مگر بوتیک، میرا خواب، میری اسٹرگل؟" ماریہ پھر بلبلا اٹھی۔
"اوہو اتنی ایموشنل کیوں ہو رہی ہو، مل جائے گا کوئی نہ کوئی پارٹنر، بلکہ میں تو کہتی ہوں، چھوڑو بزنس پارٹنر کو، لائف پارٹنر ہی ڈھونڈ لو۔" وانیہ نے تسلی دیتے دیتے اسے مشورہ دے ڈالا۔
"شٹ اپ کا مطلب سمجھتی ہو؟" ماریہ نے خونخوار نگاہوں سے اسے گھورا۔ اپنا خواب بکھرتا دیکھ کر دل ایسا غمگین ہو رہا تھا کہ سامنے رکھا بھاپ اڑاتا پسندیدہ چکن سوپ پینے کو بھی جی نہیں کر رہا تھا۔
"یہ دیکھو۔" وانیہ نے اپنے موبائل کو آن کر کے کچھ کلکس کیے، اوپر نیچے دائیں بائیں کر کے اسکرین اس کے سامنے کی، ایک خوش شکل نوجوان سامنے تھا۔
"اچھا ہے بانگڑو!" ماریہ کے تبصرے نے وانیہ کو صدمے سے دوچار کر دیا۔
"بانگڑو؟"
"میری پیاری بلی سی سہیلی کو لے جانے والا بانگڑو ہی ہوا نا۔" ماریہ اگلے پچھلے سال حساب بے باق کرتی ہوئی دل سے ہنسی تھی، سہیلی کی خوشی اور مسکراہٹ، اس کے خواب سے بڑھ کر تھی، باقی تو بس، اس کے اندر کی شرارتی بچی تھی جو بڑے ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔

☆☆☆

آناً فاناً ہی سارے کام ہو گئے تھے، چنبیلی کو مزید علاج کے لیے بیرون ملک لے جانے کے تمام اقدامات مکمل ہو چکے تھے۔ اس کی پلاسٹک سرجری ہوئی تھی۔ ملک کی ایک مشہور اور سرگرم این جی او نے اس کار خیر کا بیڑا اٹھایا تھا۔ چونکہ طلال ملک کی طرف سے دی جانے والی دھمکیوں کے پیش نظر اس کی جان کو خطرات لاحق تھے لہٰذا انسانی ہمدردی کی بناد پر اسی مغربی ملک میں اسے اسائلم (پناہ) بھی مل گئی تھی جہاں علاج کی غرض سے جا رہی تھی۔ وہ اب مستقل وہاں رہائش اختیار کر سکتی تھی، زندگی بسر کر سکتی تھی، اس کا بیٹا اور ناجو (بطور ملازمہ) دونوں کا اسی کے ساتھ رہنے کا بندوبست بھی ہو گیا تھا۔
روانگی سے ایک روز قبل سارہ یوسف زئی اس سے ملنے آئی تھی۔
"تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ وہاں تمہارا زیادہ اچھا علاج ہوگا۔ تمہاری اور تمہارے بچے کی زندگی بن جائے گی، بہت سے ادارے اور افراد ہیں جو تمہارے لیے فنڈنگ کر رہے ہیں اور آگے بھی کرنے کو تیار ہیں۔" سارہ کی

باتوں میں کچھ مبالغہ تھا تو کچھ سچ بھی تھا۔

"اس کو سزا تو نہیں ہوئی۔" چنبیلی نے مایوسی سے اس مہربان عورت کو دیکھا، جس نے اب تک اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ وہ خدا ہے جو نیتوں کے حال جانتا ہے۔ چنبیلی — تو ایک عام انسان کی طرح سارہ یوسفزئی کا ظاہر دیکھ کر اس کی احسان مند تھی۔

"سب تمہارے سامنے ہی ہے، میں نے تو پوری پوری کوشش کی مگر....." ایک لمحے کو رک کر وہ اپنے چہرے پہ حزن و ملال کے تاثرات لے کر آئی، پھر مزید کہنے لگی۔

"اس کے دونوں گواہ مضبوط ہیں، نکاح پڑھانے والے مولوی صاحب بھی اور اس کی نئی بیوی، دونوں نے بیان دیا ہے عدالت میں کہ....."

"وہ دونوں جھوٹے ہیں۔" چنبیلی تڑپ کر بولی۔

"اس کے وکیل نے ایک ڈلیوری بوائے بھی بطور گواہ پیش کیا ہے جس نے ان دونوں کو پیزا ڈیل ڈلیور کی تھی۔ واچ مین نے بھی ڈلیوری بوائے کے بیان کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ وہ آیا تھا۔"

"سب جھوٹے ہیں، سب کے سب جھوٹے ہیں، اتنے جھوٹے گواہ کہاں سے مل جاتے ہیں؟"

اس کا سوال فقط سارہ سے نہیں تھا بلکہ شاید اس ملک کے پورے عدالتی سسٹم سے تھا۔ مگر اس کا جواب کسی کے پاس ہو بھی تو جواب دینے کی جرات نہیں تھی، سارہ نے بھی اپنی خوب صورت کلائی پہ بندھی نفیس گھڑی میں وقت دیکھا اسے دیر ہو رہی تھی، باہر میڈیا اس کے انتظار میں تھا۔ اس نے چنبیلی کا شانہ ہمدردانہ انداز میں تھپتھپایا۔

"یہاں مجرموں کو سزا کیوں نہیں ملتی؟" چنبیلی نے دور فضا میں کہیں دیکھتے ہوئے دوسرا سوال کر ڈالا۔

"ایسی بات نہیں ہے کہ ہر مجرم ہی سزا سے بچ جائے۔ ٹھیک ہے کچھ لوگ ہیں جو با اختیار اور طاقت ور ہیں مگر کب تک؟ ہر رات کی سحر ہوتی ہے ہر ظلم اور ہر ظالم کا ایک "دی اینڈ" ہے جو کبھی نہ کبھی ضرور ہوگا۔"

سارہ پراثر لہجے میں بولتے ہوئے ان فقروں کی ریہرسل کر رہی تھی جو باہر جا کر اسے صحافیوں سے کہنے تھے۔

"حوصلہ رکھو، نا امید مت ہو، مقدمہ ابھی ختم نہیں ہوا، جب تک فیصلہ نہ آ جائے، آخری لمحے تک مایوسی کو قریب نہ آنے دینا، ٹھیک ہے؟"

اختتامی کلمات بلکہ مکالمات بولتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پہ طمانیت تھی، سب کچھ بہترین طریقے سے نپٹ ہو گیا تھا، اسے، اس معاملے سے الگ ہونے کے لیے کوئی بھونڈا طریقہ نہیں اپنانا پڑا، نہ ہی زیادہ تردد کرنا پڑا۔ دو، تین جھوٹے گواہوں نے اس کا کام آسان کر دیا تھا۔ چنبیلی جا رہی تھی، مقدمہ عدالت میں چل رہا تھا، اسے اپنی زبان بندی اور معاملے سے پہلو بچا کر ایک طرف ہونے کی قیمت مل گئی تھی۔ اپنے دل و دماغ کو یکسو کرتی ہوئی وہ باہر جا رہی تھی جہاں میڈیا اس کا منتظر تھا۔

☆☆☆

سب کچھ مانوس اور جانا پہچانا تھا، بہت بڑا ہال، اس میں لگے فانوس فرشی نشست، پھولدار قالین، گاؤ تکیے، آرائشی روشنیاں، محراب دار کھڑکیاں دروازے اور ان پر لہراتے موسم کے حساب سے قیمتی پردے، بس دیواروں کا رنگ تبدیل ہو گیا تھا، باقی اور کچھ بھی نہیں بدلا تھا، تنقیدی نگاہوں سے اپنے چہار طرف کا جائزہ لیتے اس کے کانوں میں باہر سے آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ وہ بھی نہیں بدلی تھی، وہی کرارگی آواز، کرخت لہجہ اور مخاطب کی عزت اتارتے الفاظ، ابھی بھی وہ کسی کی کھنچائی کر رہی تھی۔

اچانک ہی پہلے سستی سی خوشبو کا ایک بھپکا اور پھر اندر آتے ہوئے تارا کا اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں سلام، دونوں ایک ساتھ اندر آئے۔

''وعلیکم السلام، کیا حال ہیں تارا؟ مزے میں ہو؟''
''کیا خاک مزے میں ہیں، آپ نے تو کبھی پلٹ کر خبر نہیں لی کہ آپ کی سہیلی تارا زندہ ہے کہ مر گئی؟'' تارا اپنے مخصوص انداز میں ناز و ادا کے ساتھ بولتی ہوئی لہرائی۔
''فون پہ سب کی خیریت مل جاتی تھی جھمکا سے، بس آنے کا وقت نہیں ملا کبھی مصروفیت ہی ایسی تھی۔'' سگریٹ ایش ٹرے میں جھاڑتا ہوا وہ مسکرایا۔
''اب کیسے مل گئی فرصت؟'' تارا نے آنکھیں مٹکائیں۔
''نہ تو تھانیدارنی لگی ہے جو سوال جواب کرنے بیٹھ گئی۔ جا، جا کر اپنا کام کر۔'' اندر آتی جھمکا نے اسے ٹاڑا وہ کان دبا کے اٹھ کھڑا ہوا۔
''تھوڑی دیر کے لیے تو موڈ اچھا کر لو آپا، اتنے عرصے بعد آیا ہوں۔'' جمال کے چہرے پہ خوشامدی مسکراہٹ تھی۔
''بھاڑ میں گئی تیری آپا اور جہنم میں جائے تُو، یہ بتا جب میں نے منع کر دیا تھا تجھے کہ تیرا کام میں نہیں کر سکتی تو کیوں ڈھیٹ بنا ہوا ہے؟''
''آپا! میری پیاری آپا..... تیرے سوا کسی پہ بھی بھروسہ نہیں کر سکتا، خود اپنے آپ پر بھی نہیں بس کچھ ہفتوں کی بات ہے، پھر میں خود آ کر لے جاؤں گا اسے، ابھی میرا وقت بہت خراب چل رہا ہے۔ نہ باہر کہیں جا سکتا ہوں نہ اندر آزادی سے گھوم سکتا ہوں، ذرا میری سیٹنگ بن جائے پھر بس تمہاری ذمے داری ختم۔''
جمال کی چرب زبانی اپنے عروج پر تھی۔
''میرے پاس پہلے ہی بہت لڑکیاں ہیں، مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔'' جھمکا نے ٹکا سا جواب دیا۔
''اب اتنی کٹھور نہ بن، یہیں پلا بڑھا ہوں، تیرا بھائی ہوں، بڑی بہن تو.....''
''بکواس مت کر، لعنت بھیجتی ہوں میں، بھائی اور بہن دونوں کے رشتے پہ۔'' جھمکا اتنی زور سے چیخی تھی کہ جمال فوراً ہی خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ صوفے سے اتر کر نیچے بیٹھ گیا، اس کے پیروں کے پاس۔
''اچھا چل، کچھ بھی سمجھ لے، اپنا وفادار کتا ہی سمجھ لے، دکھ میں بڑی مصیبت میں ہوں، اس لڑکی کو مزید وہاں بھی نہیں چھوڑ سکتا، سوی بڑی خبیث عورت ہے اس پہ بھروسہ نہیں ہے مجھے، اپنے ساتھ بھی نہیں رکھ سکتا، میں کہہ رہا ہوں کہ بس چند ہفتوں کی بات ہے، خدا کے واسطے میری مدد کر دے۔'' جمال بری طرح گھگھیا دیا تھا۔
''بہری بوا ٹھیک کہتی ہیں تجھے، لسوڑا، چپک جاتا ہے، جان کو آ جاتا ہے بری طرح۔'' جھمکا اب اسے گھور رہی تھی۔
''ایک ٹائم بتا دے، کب آئے گا؟ اگر اس ٹائم پر نہیں آیا نا تو اسے باہر نکال دوں گی اور تجھے پھر یہاں گھسنے نہیں دوں گی۔''
''بس دو ماہ، دو مہینے کے اندر اندر میں پکا اسے آ کر لے جاؤں گا۔'' جمال کا چہرہ چمک اٹھا۔
''میں ابھی لے کر آتا ہوں اسے، بس ذرا نگرانی رکھنا، ہو سکتا ہے پریشان کرے۔''
''اب دفع ہو گا یا نہیں؟ اور ہاں نام تو بتا دے اس کا؟''
''نائلہ، نائلہ نام ہے۔'' جمال تیزی سے باہر نکلا تھا معاً جھمکا اپنا ارادہ بدل دے۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ناولٹ

سجیدہ غلام محمد

گلہ بانو کی کہانی

''اچھا بھئی شبنم۔ رب راکھا۔'' سلطانہ بی بی نے کوئی پانچویں دفعہ اپنی بہن کو گلے لگایا۔ پیشتر اس کے کہ دونوں بہنوں کو کوئی بھولی بسری بات عین دروازے کی چوکھٹ پر یاد آجاتی، حکم داد فوراً بول پڑا۔

''آپا! وین آ گئی۔ جلدی آجاؤ۔''

''روکو اسے، بھائی! ہم آرہے ہیں۔'' سلطانہ بی بی نے جلدی سے شبنم کی طرف الوداعی ہاتھ ہلایا اور چادر سنبھالتی ہوئی سڑک کی جانب چل پڑیں جہاں وین بس ابھی آ کر رکی ہی تھی اور کنڈیکٹر نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔

''جلدی کرو باجی۔ ٹیم (ٹائم) لیٹ ہو رہا ہے۔''

''خدا حافظ جینو۔ بچی میں، بڑا مزا آیا۔'' گل بانو نے جلدی سے جینو کو گلے لگایا اور پھر وین کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتی ماں کے پیچھے ہولی۔ شاہ رخ

عرف شاہی خالو حکم داد اور ان کے بیٹے حمزہ کے ساتھ پہلے ہی سڑک کنارے کھڑا تھا۔

''چلو چلو، بیٹھو جلدی۔'' حکم داد نے سلطانہ کا سامان وین میں رکھتے ہوئے کہا۔

''پراں ہوناں۔'' گل بانو وین میں کھڑکی والی نشست سنبھال چکی تھی کہ سلطانہ بی بی نے تنگ سی سیٹ پر پھنس کر بیٹھنے کا غصہ اسے ٹہوکا دے کر نکالا۔ وہ منہ بناتی ہوئی کھڑکی کی طرف تھوڑا اور سرک گئی۔ ابھی شاہ رخ ٹھیک سے بیٹھا بھی نہیں تھا کہ کنڈیکٹر نے وین کا دروازہ بند کیا اور ایک جھٹکے سے وین چل

پڑی۔ سلطانہ بی بی نے جھٹکے سے سنبھلتے شاہ رخ کو تھام کر سیٹ پر بٹھایا۔

''موالا لچ ہے انہیں۔ ایک منٹ صبر کر لیں، سواری آرام سے بیٹھ جائے تو چلا لیں۔'' سلطانہ بی بی کی بڑبڑاہٹ جاری تھی۔ گل بانو بے دھیانی میں انہیں سنتی ہوئی کھڑکی سے باہر تیزی سے گزرتے لوگوں کو بے زاری سے دیکھ رہی تھی۔ دھول مٹی میں اٹے ہوئے، پسینے سے تر چہرے، فکرِ معاش سے لڑتے جھگڑتے چہرے اور آنکھوں میں روشن مستقبل کی جوت جگائے تھکن زدہ سے چہرے۔

''وہ لوگ کہاں ہوتے ہیں جو ٹی وی پر نظر آتے ہیں؟'' گل بانو نے حسرت سے سوچا تھا، اور پھر یاسیت سے ہی دھیرے سے مسکرائی۔ ''ٹی وی پر!''

☆☆☆

''ہمارے درمیان یہ فاصلے کب ختم ہوں گے پونم؟'' ہیروئن نے ہیروئن کا ہاتھ تھامتے ہوئے جذبات میں ڈوبے لہجے میں کہا۔

''پتا نہیں۔'' ہیروئن کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔ گل بانو نے کن اکھیوں سے سلطانہ بی بی کی طرف دیکھا، وہ چھوٹی سی منڈیر کے پیچھے کچے چولہے پر شام کی روٹیاں پکانے میں مصروف تھیں۔ گل بانو نے ٹی وی کی آواز آہستہ کر لی اور پھر سے ڈراما دیکھنے میں محو ہو گئی۔

''اب تمہارے بغیر ایک پل نہیں جیا جاتا۔ پتا نہیں تمہارے بن یہ سانس کیسے چلتی ہے۔'' ہیروئن ہیرو کے کندھے پر سر ٹکائے آنسو بہا رہی تھی۔ گل بانو کی بھی آنکھیں نم ہوئیں۔

''یہ دنیا ہماری محبت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی پونم! تم دیکھنا، ہم دونوں جلد ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔'' ہیرو ہیروئن کی زلفوں میں انگلیاں پھیرتا تسلی دے رہا تھا۔ گل بانو کے چہرے پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی۔

''کیونکہ ہم بنے ہی اک دوجے کے لیے ہیں۔'' ہیروئن بھی جذباتی ہوئی۔ پیشتر اس کے کہ ہیرو ہیروئن کے جذبات کا خیر مقدم کرتا، ایک زور کا دھماکا گل بانو کی کمر پر پڑا اور وہ بے دھیانی میں چارپائی سے نیچے گرتے گرتے بچی۔

''یہ کیا واہیات دیکھ رہی ہے تُو؟ کچھ شرم حیا ہے کہ نہیں؟؟'' اماں ایک ہاتھ میں روٹیوں کی چنگیر اٹھائے اسے گھور رہی تھیں۔

''اماں..... وہ میں..... ابھی چینل بدلنے ہی والی تھی۔''

''ہاں، پانچ منٹ سے تُو چینل بدلی کرنے ہی والی تھی۔ ماں کا ہاتھ بٹاتے ہوئے تجھے موت آتی ہے اور یہاں بیٹھ کر عشق معشوقی کے ڈرامے دیکھ رہی ہے۔ چل اٹھ، بند کرا اسے اور چٹائی بچھا۔''

آخری جملہ کہتے ہوئے اماں نے ناگواری سے ٹی وی پر روتی ہوئی ہیروئن کو گھورا اور صحن کے دوسری جانب بنے چھوٹے سے کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ گل بانو نے منہ بناتے ہوئے ٹی وی بند کیا اور بے دلی سے صحن میں چٹائی بچھانے لگی۔ چارپائیاں وہ پہلے ہی کھلے صحن میں بچھا چکی تھی۔

ابھی وہ چٹائی پر برتن رکھ ہی رہی تھی کہ ابا گھر میں داخل ہوئے۔ پیچھے پیچھے شاہی بھی تھا۔ اسکول کے بعد کچھ دیر کھیل کر ابا کی دکان پر چلا جاتا تھا، وہیں اسکول کا کام کرتا اور کچھ دکان بھی سنبھال لیتا۔

''اج گڈی کا فون آیا تھا۔'' سب کھانے کے لیے چٹائی پر بیٹھے ہی تھے کہ ابا نے بتایا۔ ان کی طرف روٹیاں بڑھاتا اماں کا ہاتھ وہیں رک گیا۔

''کیا کہہ رہی تھی؟'' ان کے ماتھے پر بل آ گئے تھے۔

''بتا رہی تھی کہ پامیرے کی طبیعت خراب ہے۔'' ابا نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر اماں سے روٹیاں پکڑ لیں۔

''اس کی تو طبیعت شروع سے ہی خراب ہے۔ ہور پے سگرٹ تے ہور کھائے چھالیہ۔'' اماں نے

شاہی کی پیالی میں دال ڈالتے ہوئے بیزاری سے کہا۔
"بتا رہی تھی کہ ڈاکٹر کہتا ہے، سینے میں بلغم بیٹھ گیا ہے اور بہت مہنگا علاج ہے۔" ابا نے ان کی بات سنی ان سنی کر دی تھی۔
"تو؟" گل بانو کی پیالی میں دال ڈالتے ہوئے اماں نے ابا کو گھورا لیکن وہ روٹی کھانے میں مگن رہے۔
"تو کیا کہہ رہی تھی پھر؟ پیسے تو نہیں مانگ لیے؟" اماں کی سوئی اٹک گئی تھی۔ ابا نے جیسے ان کی بے چینی کا مزا لیا، آرام سے روٹی کھاتے رہے۔
"گل بانو۔ لسی ڈال کے دے۔" اماں کے سوال کا جواب دینے کے بجائے ابا نے گل بانو سے کہا تھا۔ اس نے جلدی سے اسٹیل کے گلاس میں نمکین لسی ڈال کر ابا کی طرف بڑھائی۔ اماں نے انہیں گھورتے ہوئے روٹی کا نوالہ منہ میں رکھا۔
"تھوڑی دال اور ڈال دے۔ بڑی مزے کی ہے۔" ابا نے پیالی ان کی طرف بڑھائی تھی۔ شاہی جلدی جلدی کھانا کھا رہا تھا جبکہ گل بانو کا دھیان اماں ابا کی باتوں کی طرف ہی تھا اس لیے آہستہ آہستہ کھا رہی تھی۔
"اب آگے بھی بتاناں کہ گڈی نے کیا کہا؟" آخر اماں نے تنگ آ کر کہا۔
"اگلے پیر کو آ رہی ہے اِدھر۔" ابا نے ایک اور لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے جیسے دھماکا کیا۔
کیا مطلب اِدھر؟" اماں کا ہاتھ ایک بار پھر ہوا میں ہی رک گیا۔
"اِدھر مطلب اِدھر، ہمارے گھر۔ اسے کسی نے بتایا ہے کہ ہمارے ساتھ والے گاؤں میں کوئی حکیم ہے جو ہر طرح کی کھانسی کا علاج کرتا ہے۔ آرام آ جاتا ہے اس کی دوائی سے۔" ابا نے لسی پینے کے بعد اپنے صافے سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔
"تو ساتھ والے گاؤں جائے ناں۔ ہمارے گھر رہنے کیوں آ رہی ہے؟ پامیرے کی کھوں کھوں ساری نیند خراب کر دے گی اور۔ اور انہیں سلائیں گے کدھر؟ ایکو ایک ہی پنکھا ہے، دوسرے کی تار تو دو مہینے سے جلی پڑی ہے۔"
"کل یاد کرانا، ٹھیک کروا لوں گا۔ بس تار ہی تو بدلنی ہے۔" ابا کا کھانا ختم ہو چکا تھا، وہیں چٹائی پر انگڑائی لیتے ہوئے بولے۔
"میں جو دو مہینے سے کہہ رہی تھی کہ گرمی بہت ہے۔ دوسرا پنکھا بھی ٹھیک کرا لو تو سنتے نہیں تھے۔ اب بہن آ رہی ہے تو پنکھا بھی ٹھیک ہو جائے گا۔" اماں کے لہجے میں طنز تھا۔
"ہر بات پر سیاپا نہ ڈال دیا کر۔" ابا نے جھنجھلا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "دو تین دنوں کی بات ہے۔ انہوں نے آنا ہے، دوائی لینی ہے اور چلے جانا ہے۔ تُو رولا ڈال کر بیٹھ گئی ہے۔ دو سال بعد تو میری بہن آ رہی ہے۔ تو جو ہر تیسرے چوتھے مہینے شبنم کے ہاں ہفتہ ہفتہ رہ آتی ہے، میں نے کبھی اعتراض کیا؟ میری بہن آ رہی ہے تو تجھے تکلیف شروع ہو گئی ہے۔" ابا بڑبڑاتے ہوئے غسل خانے کی طرف بڑھ گئے۔
"تُو کیا دانت نکال کر ہنس رہا ہے؟ سارے دانت نکال کر ہاتھ پر رکھ دوں گی۔" اماں نے اپنے شوہر اور تند پر آیا غصہ شاہی پر نکالا تھا۔ گل بانو سر جھکا کر جلدی جلدی اپنی روٹی کھانے لگی تھی۔

☆☆☆

"پکڑو پکڑو۔" گل بانو دیسی مرغی کے پیچھے بھاگتے ہوئے شور مچا رہی تھی۔ دونوں بہن بھائی پچھلے دس منٹ سے مرغی کو پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ بھی دیسی مرغی تھی۔ پکڑ میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ ابا نے رات سونے سے پہلے کہہ دیا تھا کہ آج گڈی اور پامیرے دوپہر تک پہنچ جائیں گے، اس لیے مرغی کا سالن پکا لیا جائے۔ اماں نے اسکول سے گل بانو کی چھٹی کرائی تھی اور شاہی کے لیے حکم تھا کہ اسکول جانے سے پہلے مرغی پکڑ کر دے جائے۔ ابا نے ناشتے کے بعد اسے ذبح کرنا تھا اور اماں نے پکانا تھا۔
"کٹ کٹ کٹ۔" مرغی شاہی کے ہاتھوں

میں آنے ہی والی تھی کہ اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہوئے تھوڑا سا اڑی اور ایک بار پھر دونوں سے دور چلی گئی۔

"باجی۔ تم اسے دانے ڈالو۔ میں پکڑتا ہوں۔" شاہی نے تجویز دی تھی۔

گل بانو نے مٹھی بھر گندم کے دانے مرغی کی طرف پھینکے، کچھ لمحے تو مرغی مشکوک نظروں سے سر ہلا ہلا کر ان، بہن بھائی اور اپنے آس پاس دیکھتی رہی، پھر فطرت سے مجبور ہو کر جلدی جلدی دانے چگنے لگی۔ شاہی دبے پاؤں پیچھے سے اس کی جانب بڑھا۔

"گٹ گٹ گٹاک!" چار باتیں ایک ساتھ ہوئیں۔ شاہی مرغی پر جھپٹا، مرغی نے ڈر کر گل بانو کی طرف چھلانگ لگائی، گل بانو ہڑبڑا کر اچھلی اور مرغی کو پکڑ لیا اور ٹھیک اسی وقت باہر کے دروازے سے گڈی پھپھو، ان کے پیچھے پھپھا منیر اور ان کے بھی

"وعلیکم سلام، وعلیکم سلام۔" پھپھی نے اس کے سر پر دونوں ہاتھوں سے دبا دبا کر پیار دیا۔

"سلام پھوپھا۔"

"وعلیکم، کھوں کھوں کھوں، سلام۔ جیتی رہ۔ کھوں کھوں۔" جواب میں پھوپھا منیر کھانسنا شروع ہو گئے تھے۔

"سلام ہاشم بھائی۔" گل بانو نے ہاشم کو بھی سلام کرتے ہوئے اس کی جانب دیکھا تو جیسے نظر ٹھہر سی گئی۔ کالے قمیص شلوار میں ملبوس، بہت سلیقے اور ماڈرن سے انداز میں کنگھی کیے ہوئے ہاشم بھائی ویسے تو نہیں رہے تھے جیسے اس نے دو سال پہلے سلیمہ آپا کی شادی پر دیکھا تھا۔ تب تو موٹے سے ہاشم بھائی نے شادی والے دن بھی سر پر تیل کی جیسے پوری بوتل انڈیلی ہوئی تھی، پاس سے گزرنے پر بھی کتنی ہی دیر تک سرسوں کے تیل کی مہک نتھنوں سے جاتی نہ تھی، اور آج۔ آج کتنی اچھی خوشبو آ رہی تھی ان کے پاس سے۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہے گل بانو؟" ہاشم نے سفری بیگ پکے صحن میں ایک چارپائی پر رکھتے ہوئے پیچھے دونوں ہاتھوں میں کالے سفری بیگ اٹھائے ہاشم اندر داخل ہوا۔

"میں کیا (میں نے کہا) السلام علیکم جی۔"

گڈی پھپھو نے اپنے مخصوص انداز میں اونچی آواز میں سلام کیا تو شاہی اور گل بانو اچھل کر ملے اور مرغی گل بانو کے ہاتھ سے چھوٹ کر سرپٹ بھاگ گئی۔

"اماں۔ پھپھو آ گئی۔" شاہی خوشی سے کہتا ہوا پھپھو کی طرف بھاگا آیا۔ گل بانو البتہ وہیں زمین پر بکھرے دانوں اور مرغی کے ٹوٹے پروں کے پاس کھڑی شرمندگی سے دوپٹے کا پلو مروڑتی رہی۔

"ہائے گل بانو۔ تُو تو اتنی بڑی اور سوہنی ہو گئی ہے۔" پھپھو شاہی کو پیار دینے کے بعد گل بانو کی طرف بڑھی تھیں۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری، پھر بوکھلا کر جلدی سے دوپٹے کو سلیقے سے سر اور سینے پر پھیلا لیا۔

"سلام پھپھی جی۔"

پوچھا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" گل بانو کے چہرے پر شرمیلی سی مسکراہٹ اتر آئی، بلاوجہ ہی۔

"بسم اللہ، بسم اللہ۔" اماں کمرے سے نکل آئی تھیں اور اب گڈی پھپھو سے مل رہی تھیں۔ "گل بانو۔ چارپائیاں بچھا لے صحن میں ہی، آج موسم اچھا ہے۔" اماں کے حکم پر گل بانو ایک طرف کھڑی کی گئی چارپائی کی طرف لپکی۔

"ارے مامی۔ میں بچھا لیتا ہوں۔" ہاشم اس سے پہلے لپکا تھا اور اپنی کمر کو دہرا کرتے ہوئے پشت پر ایک چارپائی کو اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔ "اتنی نازک سی لڑکی سے اٹھائی جاتی ہیں کوئی؟" آخری جملہ کہتے ہوئے اس نے اسے گہری نظر سے دیکھا تو وہ شرما سی گئی۔

☆☆☆

"میں نے تو ہاشم پتر سے کہہ دیا تھا کہ بس پہلے پہلے ٹیم (ٹائم) والی بس میں بیٹھ جائیں گے۔ جتنا

دن چڑھ جائے، اتنا ہی کھانسی زیادہ خراب ہو جاتی ہے۔ اس لیے سویرے تڑکے ویلے نکل پڑے تھے ہم۔" گڈی پھوپھی نے گل بانو سے چائے کی پیالی پکڑتے ہوئے اپنے بھائی اور بھابھی کو بتایا۔ سب ہی ایک چھوٹی سی تپائی کے گرد بچھی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ گل بانو نے سب کو چائے پکڑا کر ٹرے تپائی پر رکھ دی اور خود بھی اماں کے پیچھے اس طرح بیٹھ گئی کہ لگ رہا تھا، اماں کے پیچھے چھپی بیٹھی ہے۔

"لے گڈی، بسکٹ بھی کھا۔ پامنیرے۔ تو بھی لے ناں۔" ابا نے بسکٹ کی پلیٹ بہن کی طرف بڑھائی۔ اس نے ایک دو اٹھا لیے۔ گل بانو نے اماں کے پیچھے چھپے سے ہاشم کی طرف دیکھا۔ وہ خاموشی سے سب کی باتیں سنتا چائے پینے میں مصروف تھا۔

"کتنے تمیز والے ہیں، چائے پیتے ہوئے آواز بھی نہیں نکال رہے۔" اسی وقت ابا کے برابر میں بیٹھے شاہی نے لمبی سی 'سڑڑڑڑ' کی آواز کے ساتھ چائے کا گھونٹ بھرا تھا۔ گل بانو نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے اس کی طرف دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں۔

"میرا خیال تھا کہ گیارہ بجے تک پہنچو گے۔ پتا ہوتا تو جلدی ہانڈی روٹی کر لیتی۔" سلطانہ نے بھی چائے کا گھونٹ بھرا۔

"کوئی بات نہیں طنو۔ اپنا ہی گھر ہے۔ چائے پی کر تھوڑا سو جائیں گے۔ تم تب تک روٹی ٹکر پکا لینا۔" گڈی پھوپھی نے بسکٹ چائے میں ڈبو کر منہ میں ڈالا۔

"یہ دونوں آدھے گھنٹے سے مرغی پکڑنے میں لگے تھے۔ وہ نہ پکڑی گئی۔ شاہی کے ابا۔ فارمی مرغی ہی لا دینا۔"

"اچھا۔" ابا نے جلدی جلدی چائے کے گھونٹ بھرے۔

"لے۔ یہ ہاشم پکڑ دے گا ناں مرغی۔ اتنا پھرتیلا ہے۔" پھوپھی نے ہاتھ سے ہاشم کی طرف اشارہ کیا تو وہ جھینپ کر مسکرا دیا۔

"ماشاء اللہ ماشاء اللہ۔ پہلے دیکھا تھا تو اتنا قد نہیں نکلا تھا اس کا۔ اب تو جوان ہو گیا ہے۔" ابا نے ستائشی نظروں سے ہاشم کو دیکھا۔ کسی اور کی نظریں بھی اماں کی اوٹ سے چپکے چپکے کتنی ہی دفعہ اسے دیکھ چکی تھیں۔

"ہاں تو ہونا ہی تھا۔" پھوپھی ہنسی۔ پامنیر خاموشی سے، بس 'سڑڑڑ' کرتے ہوئے چائے پی رہے تھے۔ "خیر سے ایف اے پاس کر لیا ہے۔ اب تو شہر والے کالج جائے گا۔"

"ماشاء اللہ۔" اماں نے بھی خوش ہو کر کہا۔ اچانک ہی ایک بات ان کے ذہن میں آئی تھی۔

☆☆☆

ہاشم اور شاہی نے مل کر مرغی پکڑی تھی اور اب وہ مزے دار شوربے والے سالن کی شکل میں کھانے والی چٹائی کے درمیان میں رکھی تھی۔

"یہ گل بانو تو بہت چپ چپ سی ہے۔ پہلے تو خوب اچھلتی رہتی تھی۔" گڈی پھوپھی نے سالن پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا تو ایک دفعہ پھر اماں کے تقریباً

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف
سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

حساب دل رہنے دو

نبیلہ عزیز

قیمت -/400 روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر:
32735021

پیچھے چھپی بیٹھی گل بانو نے شرم سے سر جھکالیا۔
"اب بھی ویسی ہی ہے۔ بس تم لوگوں کا لحاظ کررہی ہے۔" اماں نے ہنستے ہوئے پول کھولا تھا۔ پھپھی کے ساتھ ان کا رویہ اچانک ہی بہت دوستانہ ہوگیا تھا۔
"کس جماعت میں ہو گل بانو؟" ماں کے ہاتھ سے روٹی پکڑتے ہاشم نے پوچھا تھا۔ گل بانو گڑبڑا گئی۔
"آٹھویں میں۔" انتہائی ہلکی آواز میں اس نے جواب دیا تھا۔
"اور میں پنجم میں۔" شاہی فوراً بولا۔
"میں تو ساتویں کے بعد ہی اسے گھر بٹھانا چاہتی تھی لیکن اس کے ابا کو شوق ہے اسے میٹرک کرانے کا۔" اماں نے پانی گلاس میں ڈال کر گڈی کو پکڑایا۔
"اچھا ہے مامی۔ میٹرک کرلے۔ آج کل لڑکی جتنا زیادہ پڑھ لے، اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ ساتویں آٹھویں جماعت پاس والیوں کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے۔" ہاشم نے عام سے انداز میں عام سی بات کہی تھی۔ لیکن گل اسے لگا جیسے ہاشم نے خاص اس کے بارے میں کہا ہے۔ دوپٹے کا پلو مڑ مڑ کر عجیب ٹیڑھا سا ہوگیا تھا لیکن گل بانو ایک دفعہ پھر اسے انگلی پر مروڑنے کے ساتھ ساتھ نہ جانے کیا کیا خواب دیکھ رہی تھی۔
"تم بھی کھاؤ ناں۔" ایک دفعہ پھر ہاشم نے اسے مخاطب کیا، وہ شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ روٹی کو اماں کی پلیٹ میں ڈالے ہوئے سالن کے ساتھ کھانے لگی۔

☆☆☆

"اماں۔ یہ استری کردو۔" ہاشم نے اپنے کپڑوں کا ایک جوڑا گڈی پھپھی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ اتفاق سے گل بانو قریب سے ہی گزر رہی تھی۔ جب سے مہمان آئے تھے، گل بانو ان کے آس پاس ہی رہتی۔
"پھوپھی جی۔ میں استری کردیتی ہوں۔" اس نے جھجکتے ہوئے کپڑوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
"جیتی رہ گالو۔ میں تمہیں کہنے ہی والی تھی۔ اس نے تو بس مجھے کپڑے پکڑا دیئے، اب مجھے کیا پتا استری کدھر ہے اور کہاں کرتے ہیں۔" انہوں نے گل بانو کو کپڑے پکڑاتے ہوئے کہا۔ "بلکہ تو اس کے کپڑے استری کر، تب تک میں اپنے اور اس کے ابا کا بھی ایک ایک جوڑا نکال لوں۔ ان پر بھی تھوڑی سی استری پھیر دینا، ماڑی موٹی سی۔ کل ڈاکٹر کے پاس جانا ہے ناں۔"
"جی پھوپھی۔ میں ابھی کردیتی ہوں۔" گل بانو کپڑے لے کر پلٹ گئی تھی۔ ہاشم مسکرا کر رہ گیا۔

☆☆☆

"اماں۔ یہ دیکھو ہاشم بھائی کیا لائے ہیں۔" شام کو شاہی اچھلتا کودتا گھر میں داخل ہوا۔ پیچھے پیچھے ہنستا ہوا ہاشم بھی اندر آیا۔
"کیا لے آئے ہو بھئی؟" گھر کے باقی افراد کچے صحن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھے گپ شپ کے ساتھ چائے کے مزے اڑا رہے تھے۔ گل بانو کچھ دیر پہلے ہی کسی کام سے اندر باورچی خانے میں گئی تھی۔ ہاشم دو گھنٹے پہلے شاہی کو لے کر ساتھ والے گاؤں گیا تھا تاکہ ڈاکٹر سے اگلے دن کا ٹائم لے لے۔ اور ان دو گھنٹوں میں گل بانو کتنی ہی دفعہ باہر کا دروازہ کھول کر دیکھ آئی تھی۔ اب جیسے ہی شاہی کی آواز سنی، فوراً کچن کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔
"کچھ نہیں مامی جی۔ بس تھوڑی سی جلیبیاں اور سموسے ہیں۔"
"صحیح ٹیم (ٹائم) پر آئے ہو۔ چائے کے ساتھ اگر جلیبیاں اور سموسے ہوں تو چائے کا مزا بڑھ جاتا ہے۔" ابا جی نے کہا تھا۔
"گالو۔ پلیٹیں لانا دو تین۔ ہاشم پتر سموسے وغیرہ لایا ہے۔ ویسے اس کی ضرورت نہیں تھی۔" اماں نے مسکراتے ہوئے تکلف سے کہا۔
"میں باورچی خانے لے جاتا ہوں۔" ہاشم نے کہا اور دونوں لفافے سنبھالتا ہوا باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں اسے آتا دیکھ کر گھبرائی ہوئی گل

بانو دھلے ہوئے برتنوں کو دوبارہ دھونا شروع ہو گئی تھی۔
"ہائے طنو۔ کیسی باتیں کر رہی ہے۔ ہم صبح سویرے نکلے اس لیے کچھ لے ہی نہ سکے۔ میں نے پہلے ہی ہاشم کو کہہ دیا تھا کہ ڈاکٹر سے واپسی پر خالی ہاتھ نہ آئے، کچھ نہ کچھ لیتا آئے۔" گڈی پھوپھی اماں سے کہہ رہی تھی۔ شاہی سے کہاں صبر ہوتا، وہ بھی جلدی سے کچن کی طرف بھاگ گیا۔
"یار شاہی۔ یہ تمہاری باجی بولتی نہیں ہے؟" ہاشم نے اسے دیکھتے ہی کہا تھا۔ گل بانو نے زیرِ لب اپنی مسکراہٹ چھپائی۔
"بولتی ہے ناں۔ کان کھا جاتی ہے۔ اماں کہتی ہے کہ باجی کی باتیں سن سن کر ان کے سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔" شاہی نے مزے سے بتایا۔
"کوئی نہیں۔ ایسی بات بھی نہیں ہے۔"
"اچھا اب جلدی سے پلیٹیں دو، ہاشم بھائی نفیس کی دکان سے جلیبیاں اور سموسے لائے ہیں۔" شاہی نے اچک کر خود ہی ایک پلیٹ پکڑنے کی کوشش کی۔
"دیتی ہوں ندیدے، صبر کرو۔" گل بانو نے اسے پیچھے کیا اور پلیٹیں نکال کر ہاشم بھائی کی طرف لفافے لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ انہوں نے احتیاط سے لفافے اسے پکڑا دیے۔
"شاہی نے بتایا تھا کہ تمہیں جلیبی پسند نہیں، اس لیے تمہاری پسند کے سموسے لایا ہوں۔" ہاشم بھائی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔
"مجھے اور ہاشم بھائی کو تو جلیبی پسند ہے۔" شاہی ایک بار پھر بول اٹھا۔ گل بانو نے لفافہ کھولتے ہوئے اسے گھورا۔
"مجھے بھی جلیبی پسند ہے۔ یہ تو ایسے ہی بولتا رہتا ہے۔"
"باجی!" شاہی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "تمہیں کب جلیبی پسند ہے؟ ابھی پچھلے ہفتے ہی تو ابا جلیبیاں لائے تھے تو تم نے انہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا، الٹا ناراض ہو گئی تھی کہ سموسے کیوں نہیں لائے۔ اب سموسے لائے ہیں تو تمہاری پسند ہی بدلی ہوئی ہے۔"
"چلو کوئی بات نہیں۔ بدل جاتی ہے پسند بھی۔" ہاشم نے آگے بڑھ کر پلیٹ میں سے ایک جلیبی کا ٹکڑا اٹھا کر بانو کے منہ میں ڈال دیا۔ "میٹھے لوگ زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔" گل بانو ہکا بکا سی انہیں دیکھ رہی تھی۔
"گل بانو۔ لے بھی آؤ جلیبیاں۔" اماں نے آواز دی۔
"چلو بھئی شاہی۔ ہم چل کر سموسے جلیبیاں کھاتے ہیں، تب تک تمہاری باجی ہمارے لیے چائے لے آئیں گی۔" ہاشم نے پلیٹیں اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔
"جلیبی اتنی مزے کی ہوتی ہے یا یہ ٹکڑا مزے کا ہے۔" گل بانو چائے کی پیالی میں ہاشم کے لیے چائے ڈالتے ہوئے سوچ رہی تھی اور ساتھ ساتھ اپنے منہ میں جلیبی کی شیرینی کو بھی شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

سب سوئے ہوئے تھے لیکن اس کو نیند کہاں آنی تھی۔
"کتنے شریف ہیں۔ لفافے پکڑاتے ہوئے مجال ہے جو اپنے ہاتھ مجھے لگنے دیے ہوں اور ایک وہ شگفتہ کا منگیتر ہے، بہانے بہانے سے اس کے ہاتھ پکڑتا رہتا ہے۔ شگفتہ کو اچھی لگتی ہوں گی ایسی باتیں، مجھے تو بالکل بھی نہیں پسند، اور دیکھو تو۔ یہ کتنے شریف ہیں۔ بالکل ہیرو ہی تو لگتے ہیں۔ وہ جو ڈرامے میں ہیرو تھا بھورے بالوں والا، ویسے ہی۔ لیکن نہیں، اس ہیرو سے تو زیادہ پیارے ہیں۔ وہ تو ان کے سامنے کچھ بھی نہیں۔" گل بانو نے دائیں طرف کروٹ لی۔ اس کے ساتھ والی چارپائی پر اماں سو رہی تھیں اور ان کے برابر والی چارپائی پر پھپھی۔ ابا، شاہی، منیر پھوپھا اور ہاشم گھر کی چھت پر چارپائیاں ڈال کر سو رہے تھے۔ اس نے ایک دفعہ پھر کروٹ بدلی اور سیدھی لیٹ گئی۔ نظریں آسمان کی کالی چادر میں چمکتے ان گنت ستاروں

پر جمی تھیں۔ اچانک اس کے ذہن میں دوبارہ شگفتہ اور اس کا منگیتر آ گئے۔

"نہ جانے لڑکیوں کو کیا نظر آ جاتا ہے ان عام سے لڑکوں میں۔" آج اسے اپنا آپ اور ہاشم خاص لگ رہا تھا اس لیے سب عام تھا۔ اس نے ایک بار پھر کروٹ لی اور بائیں جانب مڑ گئی۔ چاند اس کے عین سامنے آ گیا تھا۔

"کیا پتا اوپر چھت پر وہ بھی اسی طرح کروٹیں بدل بدل کر سونے کی کوشش کر رہے ہوں اور نیند نہ آ رہی ہو۔" چاند کو دیکھتے ہوئے، کھلی آنکھوں سے تخیل میں من پسند خواب بنتے بنتے وہ کب نیند کی وادی میں اتری، اسے خود بھی یاد نہیں تھا۔

☆☆☆

"اماں۔ میں آج بھی چھٹی کر لوں؟" گل بانو فرائنگ پین چولہے سے اتارتے ہوئے اماں سے بولی۔

"کیوں؟" اماں نے ایک پراٹھے پر دیسی گھی لگاتے ہوئے اسے گھورا۔

"گڈی پھپھی جو آئی ہوئی ہے۔ تجھے اتنا کام کرنا پڑے گا۔ میں مدد کرا دوں گی۔"

"انہوں نے تو دس بجے ڈاکٹر کے پاس چلے جانا ہے۔ میرا کیا کام بڑھنا؟ چل اٹھ، یہ ٹرے اندر لے جا۔ اندر سب ناشتے کا انتظار کر رہے ہیں۔" اماں نے آخری پراٹھا توے سے اتارتے ہوئے کہا تو گل بانو منہ بنا کر چل دی۔ کتنا دل کر رہا تھا کہ جب تک ہاشم گھر پر ہے، وہ بھی گھر پر رہے۔

"اے دس۔ طنو! ان 'پرونٹھوں' اور انڈوں کی کیا ضرورت تھی؟ کل والا سالن ہی دے دیتی سادی روٹی کے ساتھ۔" گڈی پھپھی نے پراٹھوں کے اوپر سے کپڑا ہٹاتے ہوئے سلطانہ سے کہا تھا۔

"صبح صبح سادی روٹی کھائی جاتی ہے؟ اری گل بانو۔ وہ ایک کٹوری میں سالن رکھا ہے فریج میں، وہ بھی گرم کر کے لے آ۔" اماں نے چٹائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ کچھ ہی دیر میں گھر کے سارے افراد چٹائی پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ گل بانو بھی اور..... ہاشم بھی۔

"تمہارا اسکول کتنے بجے لگتا ہے شاہی؟" ہاشم نے ایک لقمہ منہ میں رکھ کر شاہی سے پوچھا

"آٹھ بجے بھائی۔ بس میں نکلنے ہی والا ہوں۔" شاہی جلدی جلدی پراٹھے کے بڑے بڑے لقمے لے رہا تھا۔

"میں بھی چلوں تمہارے ساتھ؟ ایسے ہی اسکول تک چھوڑ آتا ہوں۔ گھر پہ تو بور ہوں گا۔" ہاشم نے دہی کی پیالی اٹھائی اور اس کا جملہ سن کر بے دلی سے پراٹھا کھاتی گل بانو جیسے لقمہ چبانا بھول گئی۔

"ہاں ہاں، ضرور چلیں۔ میں آپ کو اپنے دوستوں سے بھی ملواؤں گا۔" شاہی نے لقمے کو چائے کے گھونٹ کے ذریعے نیچے اتارا۔ اسی وقت گل بانو جلدی سے چٹائی سے اٹھ گئی۔

"تجھے کیا ہوا؟" اماں کو حیرت ہوئی۔

"خود ہی تو کہہ رہی تھی کہ اسکول سے چھٹی نہیں کرنی۔"

"تیار ہونے جا رہی ہوں، وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔" اس نے اسکول کے کپڑے اٹھا کر باہر جاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"میرا ایک دوست رکشہ چلاتا ہے، وہ ساڑھے نو بجے آ جائے گا تم تینوں کو لینے کے لیے۔ تیار رہیو۔" ابا نے کہا تو ہاشم اور گڈی پھپھی نے اثبات میں سر ہلا دیے۔ پھوپھا منیر گرم گرم چائے پینے میں مگن تھے۔

☆☆☆

"کتنا دور ہے تم دونوں کا اسکول؟" ہاشم نے پوچھا تھا۔ وہ، گل بانو اور شاہی چھوٹی نہر کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

"قریب ہی ہے، زیادہ دور نہیں ہے۔" شاہی نے گلے میں جھولتا بستہ سنبھالتے ہوئے کہا۔

"کاش دور ہوتا۔" ہاشم بڑبڑایا لیکن آواز اتنی بلند ضرور رکھی کہ گل بانو سن سکے اور اس نے سن بھی لی۔

"اوئے اکبر۔" شاہی کو اپنا دوست نظر آ گیا تھا، لپک کے اس کے پاس چلا گیا۔

''اب کہیں تمہاری کوئی سہیلی نہ آجائے۔'' ہاشم نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بس شرما گئی۔

''آج سے میں تمہیں 'گل' کہوں گا۔''

''گل ہاشم' کتنا اچھا لگ رہا ہے ناں۔'' ہاشم مسکرایا۔

''ہائے اللہ۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔'' وہ کچھ شرمائی، کچھ گھبرائی۔ شاہی اپنے دوست کے ساتھ ان دونوں سے کچھ فاصلے پر آگے آگے چل رہا تھا۔

''اس میں بُری بات کیا ہے؟؟ 'گل' مطلب پھول اور 'گل ہاشم' کا مطلب، 'ہاشم کا پھول'۔ پتا ہے جب اماں نے مجھ سے کہا تھا کہ ان کے ساتھ چلوں تو میں نہیں مان رہا تھا۔ میرے ذہن میں تو وہ دو سال پہلے والی گل بانو آرہی تھی، الجھے بالوں والی، ہر وقت رونے دھونے اور ضد کرنے والی۔ لیکن اماں مجھے زبردستی لے آئیں کیونکہ ابا کو اکیلے سنبھالنا ان کے لیے بڑا مشکل تھا۔ اور جب میں نے تمہیں اس دن دیکھا تو میں حیران ہی رہ گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنی خوب صورت ہو گئی ہو گی۔'' ہاشم چلتے ہوئے ہلکی آواز میں بولتا جا رہا تھا اور گل بانو شرم کے مارے اسکول کے سفید دوپٹے میں اپنا منہ چھپائے جا رہی تھی۔

''اری گل بانو!'' اسی وقت نہر کی دوسری جانب سے شگفتہ نے آواز دی۔ دونوں رک گئے اور دونوں نے ہی ناگواری سے اس کی جانب دیکھا جو اب تیز تیز قدم چلتی، نہر پر بنے پل کو پار کر کے ان کی جانب آرہی تھی۔

''السلام علیکم۔'' اس نے پاس آکر ہاشم کو بغور دیکھتے ہوئے گل بانو سے کہا۔

''وعلیکم السلام۔'' گل بانو نے بے دلی سے جواب دیا۔

''شاہی۔ ٹھہر ذرا۔ میں بھی آرہا ہوں۔'' ہاشم نے شاہی کو آواز دے کر روکا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کی جانب چل دیا۔

''اری۔ یہ کون ہے؟'' شگفتہ نے آنکھیں مٹکا کر معنی خیز نظروں سے پہلے ہاشم اور پھر گل بانو کی طرف دیکھا۔

''میری پھپھی کا بیٹا ہے۔'' گل بانو کو اس کا اس انداز میں ہاشم کو دیکھنا اور اس کے بارے میں پوچھنا سخت برا لگا۔

''ہیرو ہے پورا۔'' ہر جماعت میں دو دو سال لگانے والی شگفتہ بے باک بھی تھی۔

''آرام سے۔ اس نے سن لیا تو بہت ناراض ہو گا۔ اسے اس طرح کی باتیں نہیں پسند۔'' اس نے شگفتہ کو جتانے کی کوشش کی۔

''میں نے کیا کہہ دیا؟ بس تعریف ہی تو کی ہے۔'' شگفتہ نے کندھے اچکائے۔ ''کل تنویر آیا تھا۔ یہ دیکھ، میرے لیے کیا لایا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی کلائی آگے کی جہاں ایک نازک سا، بریسلٹ لٹک رہا تھا۔

''ہوں۔ اچھا ہے۔'' پہلے کی بات اور تھی، پہلے گل بانو کو شگفتہ کی ہر چیز دیکھ کر رشک آتا تھا جو اس کا منگیتر اسے دیتا تھا، اب کی بات اور تھی۔ اب اس کو بھی کوئی چاہنے لگا تھا، اس کے لیے یہی بات قابلِ رشک تھی۔

اسکول آگیا، تو دونوں برابر بنے اپنے اپنے اسکول کے اندر چلے گئے اور ہاشم اسکول کے باہر کھڑا رہ گیا۔

اسکول کے اندر گل بانو بے وجہ مسکرا رہی تھی، اسکول کے باہر ہاشم۔

☆☆☆

''اماں۔ گڈی پھپھی کب آئے گی؟ اتنی دیر ہو گئی ہے۔'' اسکول سے چھٹی پر وہ جلدی جلدی چلتی ہوئی گھر پہنچی تھی لیکن ہاشم، پھوپھی اور پھوپھا ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔

''آنے ہی والے ہوں گے۔'' اماں چارپائی پر لیٹی سستا رہی تھیں۔ اس کی نظریں ایک دفعہ پھر باہر کے دروازے کی طرف اٹھیں لیکن مایوس ہو کر پلٹ آئیں۔

''روٹی بنی ہے۔ دال بنائی ہے آج۔ نکال کر

کھا لے۔ شاہی نہیں آیا ابھی تک؟" اماں نے آنکھوں پر بازو رکھے رکھے سوال کیا۔

"نہیں، وہ کہہ رہا تھا کہ اسکول کے بعد کوئی میچ ہے اس کا۔ وہ کھیل کر آئے گا۔" وہ اداس تھی، اماں کی چارپائی پر ایک جانب بیٹھ گئی۔

"کیا ہو گیا؟ ایسے کیوں بیٹھی ہے؟" اماں نے مندی مندی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں اماں۔ بس ایسے ہی۔" اس نے چارپائی پر بچھی چادر سے نکلے ایک دھاگے کو بے زاری سے کھینچتے ہوئے کہا۔

"طبیعت ٹھیک ہے؟ آج روٹی بھی نہیں کھا رہی، پہلے تو اسکول سے آتے ہی کچن میں گھس جاتی تھی۔"

"ٹھیک ہوں اماں۔ وہ شگفتہ۔ ایسے ہی دماغ کھا جاتی ہے اپنے منگیتر کی باتیں کر کر کے۔" گل بانو کی نظریں ایک دفعہ پھر باہر دروازے کی جانب اٹھیں۔

"کیا کہتی ہے؟" اماں نے بھنویں سکیڑیں۔

"کچھ نہیں، بس چیزیں دکھاتی رہتی ہے کہ آج منگیتر نے یہ دیا، کل وہ دیا۔" نظریں مایوس لوٹ آئیں۔

"جھلی ہے وہ۔ تو اس سے بات نہ کیا کر۔"

"میں تو نہیں کرتی۔ وہ خود ہی پیچھے پڑ جاتی ہے۔" وہ اب چادر کے دھاگے کو اپنی انگلی پر لپیٹ رہی تھی۔ "آج صبح بھی جب ہاشم۔ بھائی ہمارے ساتھ اسکول جا رہے تھے تو اس نے دیکھ لیا، پیچھے ہی پڑ گئی کہ یہ کون ہے۔" اس کے منہ سے مشکل سے 'ہاشم' کے ساتھ 'بھائی' کا لفظ نکلا۔

"اچھا؟" اب اماں بھی پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھیں۔

"مشکل سے جان چھڑائی میں نے۔"

"اس سے دور ہی رہا کر۔ اچھی لڑکی نہیں ہے وہ۔"

"جی اماں۔" گل بانو نے پھر سے دروازے کی جانب دیکھا اور جی اٹھی۔ وہاں سے پھوپھی، پھوپھا اور ہاشم اندر آ رہے تھے۔

☆☆☆

"شش شش!" وہ کچن کے باہر لگے نل کے پاس بیٹھی دوپہر کے کھانے کے برتن دھو رہی تھی جب کمرے سے نکل کر ہاشم نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ اس نے چونک کر ہاشم کی جانب دیکھا تھا جو اب محتاط قدموں سے چلتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پتیلی دھوتے اس کے ہاتھ رک گئے۔

"یہ دیکھو۔ میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔" ہاشم نے قریب آ کر آہستہ آواز میں کہا اور قمیض کی جیب سے ایک تھیلی نکالی اور کھولی تو اس میں دو پیارے سے بُندے تھے، سفید موتیوں والے۔

"ہائے اللہ۔ یہ تو بہت پیارے ہیں۔" اس نے جھجکتے اور شرماتے ہوئے بُندے پکڑے۔

"اماں نے پھل لینے بھیجا تھا، میں چپکے سے یہ بھی خرید لایا۔ لاؤ، میں پہنا دوں۔" ہاشم نے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن اس نے گھبرا کر جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں نہیں، اماں پوچھے گی کہ کہاں سے آئے، تو کیا کہوں گی؟"

"کہہ دینا کہ کسی سہیلی نے دیے ہیں، یا وہ جو صبح تمہاری سہیلی ملی تھی، اس کا نام لگا دینا۔"

"نہیں، اماں نے اگر اس سے پوچھ لیا تو؟" اس کے لہجے میں محبت کا شوق بھی تھا، اماں کا خوف بھی۔

"اچھا بھئی، جیسے تمہاری مرضی۔" ہاشم نے بُرا مانتے ہوئے کہا تھا۔ "دل کرے تو پہن لینا، نہ کرے تو نہ پہننا۔"

"ناراض نہ ہوں۔" اس کا دل ہاشم کی ناراضی محسوس کر کے رک سا گیا۔ "میں یہ عید پر پہنوں گی۔ پھر اماں کو شک بھی نہیں ہوگا۔"

"میری خواہش تھی کہ تم ابھی مجھے پہن کر دکھاتیں، لیکن چلو کوئی بات نہیں۔ عید پر ضرور پہننا اور حسین لگو گی۔" ہاشم نے جاتے ہوئے مسکرا کر کہا تو اس نے شرما کر سر جھکا دیا۔

اندر کمرے سے اماں اور گڈی پھوپھی کی باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ پیاری سی، شرمیلی سی

مسکان کے ساتھ دائیں ہتھیلی پر رکھے بندوں کو بائیں ہاتھ کی انگشت شہادت سے چھو کر دیکھ رہی تھی، پھر اچانک کسی خدشے کے تحت گھبرا کر اپنے دوپٹے کے پلو میں انہیں باندھ کر چھپا دیا اور برتن دھونے لگی۔ بندے چھپ گئے تھے، شرمیلی سی مسکان چھپائی ہی نہیں جا رہی تھی۔

☆☆☆

حکیم صاحب کی دوائی کی پہلی خوراک نے ہی اثر دکھا دیا تھا اور پھوپھا منیر کی کھانسی کو کافی آرام آ گیا تھا۔ شام کو سب کے ساتھ بیٹھ کر باتیں بھی کیں اور ابا کے ساتھ ان کی دکان پر بھی گئے۔ ہاشم، شاہی کے ساتھ کرکٹ کھیلنے چلا گیا اور پیچھے رہ گئی خواب بنتی ہوئی گل بانو۔

''مامی۔ سالن بڑا مزے کا ہے۔ بھنڈی میں ذرا سی بھی لیس نہیں ہے۔'' رات کو کھانا کھاتے ہوئے ہاشم نے بے اختیار تعریف کی تھی۔ گل بانو سر جھکا کر کھانا کھاتے ہوئے مسکرا دی۔

''گل بانو نے بنایا ہے۔ میں تو کہہ رہی تھی کہ کل بنا لے لیکن کہنے لگی کہ نہیں، آج ہی پکانی ہیں۔'' اماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''گل بانو کے ہاتھ میں سواد بہت ہے۔ ورنہ آج کل کی لڑکیاں تو پھوہڑ ماریاں۔ کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتیں۔'' پھوپھی نے بھی تعریف کی تھی۔ گل بانو کا سر فخر سے بلند ہوا۔ ''اللہ اس کے نصیب چنگے کرے۔''

''آمین آمین۔'' اماں نے کہا تھا۔ اس نے چپکے سے ہاشم کی طرف دیکھا، وہ بھی گلاس میں جگ سے پانی ڈالتا ہوا اسے ہی مسکراتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''وے شودے۔ پانی گرا دیا۔ دھیان کدھر ہے تیرا؟'' گلاس پانی سے لبالب بھرنے کے بعد تھوڑا سا گر بھی گیا تھا۔ گڈی پھوپھی نے ہاشم کو جھڑکا تو وہ جھینپی ہنسی ہنستا ہوا روٹی کھانے میں مصروف ہو گیا۔ گل بانو نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی تھی۔

☆☆☆

''تو فر میرا خیال ہے کہ پرسوں صبح نکل چلتے ہیں۔'' کھانا ختم ہو چکا تھا لیکن سب ویسے ہی چٹائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ گرم دن کے بعد بدن کو چھو کر گزرنے والی ہلکی ہلکی ہوا اچھی لگ رہی تھی۔

''اتنی جلدی؟ کچھ دن اور رہ لیتے۔'' ابا نے دانتوں کے درمیان تیلی پھیرتے ہوئے کہا۔ برتن سمیٹتی گل بانو بھی اپنی جگہ رک گئی۔

''نہیں بھائی جی۔ پیچھے گھر اکیلا ہے۔ بھینسوں کو بھی تو دیکھنا ہوتا ہے۔ وہ تو میں پاعبدالرحمٰن کو کہہ آیا تھا کہ ڈنگروں کا خیال رکھے۔ اب دوائی مل گئی ہے تو واپس جانا چاہیے۔ حکیم صاحب نے تین مہینے بعد دوبارہ بلایا ہے، فر آ جائیں گے۔'' پھوپھا منیر نے پہلی دفعہ بغیر کھانسے اتنی لمبی بات کی تھی۔ یقیناً یہ دوائی کا کمال تھا۔

''پھر بھی پا منیر۔ ایک ہفتہ یا چلو، تین چار دن تو ہور رک جاؤ۔ ابھی تو میری اور گڈی کی ٹھیک سے گلاں باتاں بھی نہیں ہوئیں۔'' اماں بولیں۔

''کل کا دن ہے ناں۔ کل کر لیجو ساری گلاں باتاں۔'' پھوپھا ہنسے۔ گل بانو نے اداس نظروں سے ہاشم کی طرف دیکھا لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس نے خاموشی سے برتن اٹھائے اور کچن میں آ گئی۔

ابھی تو جی بھر کر دیکھا بھی نہیں تھا اور جدائی کا بگل بج اٹھا۔ اس کا دل بھر آیا۔

''ہاں طنو۔ پرسوں سویرے نکل جائیں گے۔ ہاشم کی پڑھائی کا بھی بہتیرا حرج ہو رہا ہے۔ اب تم لوگ چکر لگانا ناں۔'' گڈی پھوپھی نے کہا۔

''چلو، جیسے تم لوگوں کی مرضی، اچھا ہوتا اگر کچھ دن اور رک جاتے۔'' ابا نے تیلی صحن میں ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا تھا۔

کچن میں کھڑی گل بانو کی آنکھیں بھر آئیں لیکن اس نے بڑی مشکل سے انہیں بھینچ بھینچ کر آنسو اپنے دل پر اتار لیے۔ سونے کا وقت ہونے ہی والا تھا، تب آنسو آزادی سے بہہ سکتے تھے، ابھی نہیں۔

☆☆☆

آدھی رات تک رونے کی وجہ سے صبح جب وہ

جاگی تو آنکھیں متورم تھیں۔ طبیعت بھی ڈھیلی ڈھیلی سی تھی۔

''اماں۔ کل تو گڈی پھوپھی چلی جائے گی، مجھے آج اسکول نہ بھیجو ناں۔ بہت اداسی ہو رہی ہے۔'' اس نے صحن میں جھاڑو لگانے کے بعد اماں سے کہا جو آٹا گوندھ رہی تھیں۔ اماں نے کچھ ثانیے اس کے چہرے پر ٹھہری اداسی دیکھی۔

''اچھا، نہ جا آج اسکول۔ کر لے چھٹی۔'' بالآخر اجازت مل ہی گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی، پھر فوراً ہی معدوم ہوگئی۔

''اماں۔ تُو کہہ ناں پھوپھی کو کہ اتنی جلدی نہ جائے۔ گھر میں رونق سی لگ گئی ہے اس کی وجہ سے۔'' اس نے اماں کے سامنے ہی زمین پر اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تیرے سامنے تو کہا تھا میں نے بھی اور تیرے ابا نے بھی۔ اب نہیں مان رہے تو ہم کیا کریں۔'' اماں نے ہاتھ گیلا کر کے دوبارہ آٹے کو گوندھنا شروع کر دیا۔ وہ بس ایک تیلی سے کچی زمین پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچنے لگی۔

''کی ہویا؟'' پھوپھی ابھی غسل خانے سے نکلی تھیں۔

''کچھ نہیں، اداس ہو رہی ہے کہ پروہنے اتنی جلدی جا رہے ہیں۔'' اماں نے ہنستے ہوئے انہیں بتایا۔

''جھلی نہ ہووے تے۔'' پھوپھی ہنسی اور پیار سے گل بانو کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''پھر آنا ہے ناں ہم نے تین مہینے بعد۔ اور اب جب امتحان کی چھٹیاں ہوں تو تم لوگ بھی ہماری طرف آنا۔''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔'' اماں بولیں' آٹا گوندھ چکا تھا۔

''چلو آج میں بناؤں اپنی دھی کے لیے پروٹھے۔ ایسے اداس بیٹھی ہے۔'' پھوپھی نے اماں سے آٹے کی پرات پکڑ لی تھی۔ گل بانو آنکھوں میں اداسی لیے مسکرا دی۔ کچھ دیر بعد پھوپھی کچے چولہے کے سامنے بیٹھی پراٹھے پکا رہی تھی۔ دوسرے چولہے پر اماں نے چائے کی پتیلی چڑھائی ہوئی تھی۔ وہ بھی ان کے قریب ہی بیٹھی تھی اور تینوں نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں کر رہی تھیں کہ ہاشم انگڑائی لیتا ہوا کمرے سے نکلا۔

''واہ۔ آج تو اماں پراٹھے بنا رہی ہے۔'' غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے اس کی نظر ان تینوں پر پڑی اور وہ وہیں آ گیا۔

''ہاں تے ہور کی۔ میری دھی اداس بیٹھی تھی، مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ میں نے کہا چلو جانے سے پہلے اسے اپنے ہاتھ کا بنا پروٹھا کھلا دوں۔'' پھوپھی نے توے پر روٹی کو دیسی گھی لگا کر گول گول گھماتے ہوئے کہا۔

''دھی اداس بیٹھی تھی تو اسے پراٹھے کھلا رہی ہے۔ میں جو کہتا ہوں کہ پراٹھا بنا دے تو سوکھی روٹی سامنے رکھ کر کہتی ہے کہ پیٹ نکلا جا رہا ہے۔ تجھے تو یہ دھی پیاری ہے، میں نہیں۔'' ہاشم نے مصنوعی ناراضی سے کہا تو سب ہنس پڑے۔

''آج کل کی لڑکیوں کو موٹے بندے پتے نہیں لگدے۔ پیٹ نکل جاوے تو مشکل سے ہی واپس جاتا ہے۔ کوئی کڑی نہیں ملنی تجھے!'' پھوپھی نے ہنستے ہوئے پراٹھا توے سے اتارا تھا۔ گل بانو سر جھکا کر ہنس پڑی۔

''مل جائے گی پھوپھی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' اس نے دل میں پھوپھی کو مسکراتے ہوئے مخاطب کیا تھا۔

''اول جائے گی اماں۔ پیٹ کی خیر ہے، آج میں دو پراٹھے کھاؤں گا، رات والی بھنڈی کے ساتھ۔ تیرے ہاتھ کا پراٹھا اور گل بانو کے ہاتھ کی بھنڈی۔ مزا ہی آ جائے گا۔'' ہاشم نے چٹخارہ بھرتے ہوئے کہا اور غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ عام سے جملے تھے، اس لیے اس کی بات پر ہنستی ہوئی اماں اور پھوپھی گہرائی تک نہیں پہنچیں، لیکن وہ ان ذومعنی جملوں میں چھپا مطلب سمجھتی تھی، اس لیے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ

ہنس دی اور ہواؤں میں اڑنے لگی۔

☆☆☆

''بات سنو گل۔'' ہاشم نے چپکے سے اسے بلایا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اماں اور پھوپھی سو رہی تھیں۔ وہ اس کے پاس چلی آئی۔

''تم نے مجھے روز فون کرنا ہے۔ میرا نمبر ماموں کے موبائل میں ہے۔ تم بس مس کال دیا کرنا، میں کال کرلیا کروں گا۔'' ہاشم نے سرگوشی میں کہا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میں آپ کو بہت یاد کروں گی۔'' آنسو پھر سے آنکھوں میں اتر آئے۔

''میں بھی۔ اگر پیچھے کالج کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں تو کسی بہانے کچھ دن اور رک جاتا۔ اچھا تم رو نہیں، ورنہ مجھے بہت دکھ ہوگا۔'' ہاشم بے چین ہوا۔ اس نے مشکل سے اپنے آنسو پونچھے۔

''یہ دیکھیں۔'' اس نے کان کی طرف سے دوپٹا ذرا سا سرکایا تو ہاشم کا چہرا مسکرا اٹھا۔ کانوں میں اس کے دیے ہوئے بُندے جھول رہے تھے۔

''تم نے پہن لیے۔'' اس نے دھیرے سے بُندوں کو چھوا تو وہ اپنے آپ میں سمٹ سی گئی۔ ہاشم نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

''بہت پیارے لگ رہے ہیں۔ یہ کیسے پہن لیے؟ مامی سے ڈر نہیں لگا؟''

''اسی لیے تو دوپٹا اچھی طرح لپیٹا ہوا ہے کہ اماں کو نظر نہ آئیں۔'' اس نے دوبارہ دوپٹے کو اپنے سر کے گرد لپیٹ لیا۔

''نہیں گل۔ انہیں اتار لو۔ اگر مامی نے دیکھ لیا تو وہ ناراض ہوں گی اور مجھے اچھا نہیں لگے گا کہ کوئی تمہیں ڈانٹے۔ انہیں تب پہننا جب اماں باقاعدہ تمہارا رشتہ مانگنے آئیں گی۔'' ہاشم نے سرگوشی کی تو وہ شرما گئی اور بُندے اتار لیے۔

''تم یہ سمجھو کہ یہ بُندے اور تم اب میری امانت ہو۔ جیسے ہی پڑھائی کے بعد نوکری لگے گی، فوراً اماں کو تمہاری طرف بھیج دوں گا۔''

''ہائے۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ مجھے شرم آ رہی ہے۔'' پتا نہیں اماں کو نیند میں کھانسی آئی تھی یا پھوپھی کو، وہ جلدی سے ہاشم کے کمرے سے نکل گئی تھی۔

''یہ بُندے اور تم اب میری امانت ہو۔'' بُندے اتار کر اپنے کپڑوں والی الماری میں چھپاتے ہوئے اس کے کان میں ایک سرگوشی ابھری تھی۔

''ہائے اللہ جی۔'' وہ بھی شرمائی تھی، دل بھی۔

☆☆☆

ہاشم چلا گیا تھا گل بانو کو اداس کر کے۔

''چل، آج تو اسکول جا ناں۔ پردہنے چلے گئے ہیں۔'' پردہنے تو تڑکے ویلے ہی چلے گئے تھے، اسکول کا وقت قریب ہوا تو اماں نے چارپائی پر اداس سی بیٹھی گل بانو سے کہا۔ کچھ دیر تک وہ اسی طرح چارپائی پر بیٹھی، نیچے لٹکتی ٹانگوں کو ہلاتی رہی، پھر بیزاری کے ساتھ اسکول جانے کے لیے تیار ہونے چلی ہی گئی۔

''اے گل بانو۔'' ہاشم کے ساتھ گزرے تھوڑے سے پل یاد کرتے ہوئے وہ نہر کے پاس سے گزر رہی رہی تھی کہ پل عبور کرتی شگفتہ نے آواز دی اور لپک کر اس کے پاس پہنچ گئی۔

''وہ پردہنا نظر نہیں آ رہا۔ چلا گیا کیا؟'' اس کے لہجے میں تجسس تھا۔ گل بانو کا دل چاہا کہ قریب پڑے خشک بالن (خشک ٹہنیاں جو کچے چولہے کے نیچے جلاتے ہیں) میں سے سب سے موٹی ٹہنی اس کے سر پر مار دے۔

''ہاں چلا گیا۔'' گل بانو نے بس اتنا جواب دیا۔

''اچھا، اسی لیے تو اتنی اداس ہے۔'' شگفتہ نے اسے چھیڑنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اسے نظر انداز کرتی بدستور سر جھکائے اسکول کی طرف چلتی گئی۔

''بات سن گل۔ تو مجھے جو بھی سمجھے لیکن میں تو تجھے اپنی بہت ہی پکی سہیلی سمجھتی ہوں۔ اسی لیے تو اپنی ساری راز کی باتیں تجھے بتاتی ہوں۔'' شگفتہ اس

کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی بولی۔ وہ چپ رہی۔
''تجھے پتا ہے پیار کیا ہوتا ہے؟ محبت کیا ہوتی ہے؟'' گل بانو نے ٹھٹک کر رکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔
''کیا ہوتی ہے؟''
''یہ جو تیری حالت ہے ناں، یہ۔'' شگفتہ نے مسکراتے ہوئے بتایا اور وہ حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔
''کیا مطلب؟''
''دیکھ گل۔ تجھے تو پتا ہے کہ تنویر میرا منگیتر تو ہے ہی، لیکن اس سے بھی پہلے وہ میرا پیار تھا۔ میرا سچا پیار۔ میں گیارہ سال کی تھی جب مجھے اس سے محبت ہوگئی تھی اور میری بھی ایسی ہی حالت تھی جیسی تیری ہے۔ ادھر تنویر بھی میرے بغیر بے چین رہتا تھا۔ اس نے گھر والوں سے کہا کہ ہماری شادی کر دیں۔'' شگفتہ مزے سے بتا رہی تھی اور وہ حیرت سے منہ کھولے اسے سن رہی تھی۔ ''میرے گھر والے نہیں مان رہے تھے کہ شگفتہ چھوٹی ہے ابھی۔ لو بھلا بتاؤ گانو۔ میں کہیں سے چھوٹی لگتی ہوں کیا؟ پورے پندرہ سال کی ہوں۔ بس پھر شکر ہے، ہماری منگنی ہو ہی گئی۔ اب اگلے سال دیاہ ہو جائے گا۔ لیکن صبر تنویر کو ابھی بھی نہیں ہے۔ ہر روز موبیل پر اتنے رومینٹک سے میسج کرتا رہتا ہے۔'' اسے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ شگفتہ یہ سب باتیں اسے کیوں بتا رہی ہے۔
''اچھا۔'' اس نے اتنا کہا اور پھر سے اسکول کی جانب چل پڑی۔
''سن ذرا۔'' شگفتہ نے بھی چلتے ہوئے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ''مجھے لگتا ہے تیرے اور اس پروہنے کے ساتھ بھی ایسا ہی کوئی چکر ہے۔'' گل بانو نے اس کی بات سن کر گھبراہٹ کے مارے قدم تیز کر لیے۔
''وہ جو اس دن تم دونوں ساتھ ساتھ اسکول جا رہے تھے، مجھے تو اسی وقت شک ہو گیا تھا۔ اور آج یہ تیری اتری ہوئی شکل دیکھ کے یقین ہو گیا ہے کہ ضرور یہی بات ہے۔'' گل بانو نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، اس کی ہتھیلیاں پسینے اور گھبراہٹ کی وجہ سے بھیگنے لگیں۔
''اسے کیسے پتا چل گیا؟'' وہ سوچ رہی تھی۔
''دیکھ گل بانو۔ میں تیری بہن جیسی ہوں۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو بتا دے۔ پیار ہو جانا کوئی بُری بات نہیں ہے۔ ہم انسان ہیں، پیار ہو ہی جاتا ہے۔ اب کیا زمانے سے ڈرتے رہیں۔'' شگفتہ کے لہجے میں بے باکی اور گل بانو کے لیے ہمدردی تھی۔ اس نے کچھ لمحے سوچا۔
''اچھا دیکھ۔ تُو کسی اور کو نہ بتانا۔'' آخر اس نے کہہ ہی دیا۔ چلتی ہوئی شگفتہ ٹھٹک کر رکی اور گل بانو کو بھی ایک دم سے روک لیا۔
''سچی میں؟'' اس کے چہرے پر عجیب سی خوشی تھی۔ گل نے شرما کر اثبات میں سر ہلا دیا۔
''اوئے ہوئے، پریمی جوڑا!'' شگفتہ نے ایک آنکھ دبا کر ہنستے ہوئے کہا۔ اس کے اس انداز کو اگر اماں دیکھ لیتی تو یقیناً اسے اٹھا کر نہر میں پھینکتی اور گل بانو کو چوٹی سے پکڑ کر گھر لے آتی۔
''اچھا اب بتانا نہیں کسی کو۔'' اس نے ایک دفعہ پھر اسے یاد کرایا۔
''فکر نہ کر گل۔ تیرا راز میرے پاس امانت ہے۔ چل اب پوری تفصیل بتا، کیسے پیار ہوا؟ پہلے تجھے ہوا یا اسے؟ کوئی تحفہ وغیرہ بھی دیا اس نے کہ نہیں؟ تعریفیں کی تیری؟'' وہ پوچھے جا رہی تھی اور گل شرماتے ہوئے بتائے جا رہی تھی۔
''میں ایویں شگفتہ کو بُرا سمجھتی تھی۔ وہ تو اتنی اچھی ہے، خلوص والی۔'' کلاس میں جاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

''اماں۔ گڈی پھوپھی کا فون آیا؟'' اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی پوچھا تھا۔
''نہ سلام نہ دعا۔'' گیلے کپڑے جھٹک کر تار پر ڈالتی اماں نے اسے گھورا۔

''اچھا اماں، السلام علیکم۔ اب بتا، پہنچ گئے وہ خیریت سے؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہاں ہاں، پہنچ گئے خیر سے۔ تیرے ابا کے پاس فون آ گیا تھا۔'' اماں نے بالٹی میں سے ایک دوپٹا نکال کر نچوڑتے ہوئے کہا۔

''شکر ہے اللہ کا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کچن میں گھس گئی جہاں ٹینڈے روٹی اس کا انتظار کر رہے تھے۔

''ہاتھ تو دھو لے۔ نکمی نہ ہو تو۔'' اماں اس کی کچی بھوک محسوس کر کے مسکرائی تھیں۔

☆☆☆

''بات ہوئی ہیرو سے؟'' شگفتہ نے فوراً پوچھا تھا۔ آج تو گل بالکونی پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

''نہیں۔'' اس نے اداسی سے کہا۔ ''انہوں نے فون ہی نہیں کیا۔''

''تیرا نمبر ہے اس کے پاس؟'' دونوں سہیلیاں اسکول کی طرف چلنا شروع ہو گئی تھیں۔

''نہیں۔ ہمارے گھر میں بس ابا کا موبائل ہے اور وہ دن بھر دکان پر ہوتے ہیں۔ شام کو گھر آتے ہیں تو اماں فون ملاتی ہے رشتہ داروں کو۔''

''ارے پگلی۔ وہ ہیرو تیرے ابا کو فون کرے گا تو تیری بات تھوڑی ہو پائے گی اس سے؟'' شگفتہ نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''یا تو ابا سے ضد کر کہ تجھے بھی موبائل لے دیں یا پھر خود ہی چپکے سے اسے فون ملا لیا کر۔''

''ابا تو کبھی نہیں مانیں گے۔ گھر کے پاس ہی تو ان کی دکان ہے اس لیے کبھی ضرورت نہیں پڑی دوسرے موبائل کی۔ ہاں، انہوں نے مجھے کہا تھا کہ جب بھی بات کرنی ہو، ابا کے موبائل سے انہیں مس کال دے دوں، وہ کال کر لیں گے۔''

''تو پھر دیر کس بات کی؟ کرنا آج فون۔ تُو نے بتایا تھا کہ وہ کالج جاتا ہے، ایسا نہ ہو کسی اور سے پیار ہو جائے اسے۔'' شگفتہ نے ایک ٹہنی جھلاتے ہوئے مسئلے کا حل بتایا۔

''ہائے، یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔'' وہ پریشان ہو گئی تھی۔

''تو اب سوچ لے۔ ابھی بھی وقت ہے۔ ہر روز اسے فون کرنا تاکہ وہ کسی اور کا سوچ بھی نہ سکے۔ یہ مرد بڑی جلدی کسی نئی محبت کے چکر میں پرانی محبت بھول جاتے ہیں۔ انہیں یاد دلانا پڑتا ہے کہ اِدھر اُدھر نہیں، بس ایک ہی کو سوچے۔'' شگفتہ نے اس کی ناک پر انگلی رکھتے ہوئے شوخی سے کہا تو وہ شرما گئی۔

''میں تجھے کچھ پیار والے میسج اور شاعری بھی لکھ دوں گی، وہ بھی بھیج دیا کرنا۔ مردوں کو اچھا لگتا ہے۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' وہ بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔

''میں ہوں ناں۔ فکر ہی نہ کر۔'' شگفتہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''لیکن جب میں میسج کروں گی تو ابا نہ پڑھ لے۔'' اسے ایک نئی تشویش لاحق ہوئی۔

''ارے پگلی۔ میں سکھا دوں گی کہ میسج کو بھیجنے کے بعد کیسے ڈیلیٹ کرتے ہیں۔ تُو فکر نہ کر، میں ہوں ناں تیری مدد کرنے کے لیے۔''

''شکریہ شگفتہ۔'' اس نے ممنونیت سے اس کا ہاتھ پکڑا، وہ بھی مسکرا دی۔

☆☆☆

''ہیلو۔'' اماں غسل خانے میں تھیں۔ ابا دکان سے واپس آئے ہی تھے کہ گاہک آ گیا اور انہیں واپس دکان پر جانا پڑا۔ جلدی میں وہ اپنا موبائل گھر پر ہی چھوڑ گئے۔ موقع اچھا تھا۔ اس نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ کانپتے ہاتھوں سے ہاشم کا نمبر ڈھونڈا اور کال ملا لی۔ ابھی پہلی گھنٹی ہی گئی تھی کہ اس نے کال کاٹ دی اور بے چینی سے ہاشم کی کال کا انتظار کرنے لگی۔

''ہائے۔ وہ جلدی کال ملا لیں۔ ایسا نہ ہو کہ

اماں آجائیں یا ابا ہی واپس آجائیں۔" وہ گھبرا کر بار بار بے تابی سے موبائل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کچھ ہی لمحوں بعد ہاشم کی کال آنے لگی۔ گل بانو کو انتظار کے یہ کچھ لمحے کئی گھنٹوں کے برابر لگے تھے۔

"ہیلو؟"

"ہیلو، میں۔ گل بانو۔" اس نے سرگوشی کی۔

"ارے 'گل'!" دوسری طرف سے ہاشم کی چہکتی آواز پر گل بانو کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ گھبراہٹ کچھ کم ہوگئی تھی۔

"کیسے ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ تمہیں یاد ہی کر رہا تھا کہ تمہاری مس کال آگئی۔"

"مجھے بھی۔ آپ بہت یاد آتے ہیں۔" گل بانو نے سرگوشی کرتے ہوئے غسل خانے کی جانب دیکھا۔ دروازہ ہنوز بند تھا۔

"یاد تو آنا ہی ہے۔" ہاشم ہنسا۔ "ہم دونوں کے دل جو ایک دوسرے کے پاس چلے گئے ہیں۔" وہ بھی

ایک صفحے پر انگلی رکھی۔

"ہاں، ہے تو اچھا، لیکن ایسا نہ ہو کہ انہیں برا لگ جائے۔" اسے تشویش ہوئی۔

"لو، ایسے ہی برا لگ جائے گا۔ میں تو روز تنویر کو کتنے ہی میسج کرتی ہوں، اسے تو بہت اچھا لگتا ہے۔ اچھا، چلو یہ والا شعر دیکھو۔" شگفتہ نے ایک اور شعر پر انگلی رکھی۔

"ہاں، یہ والا زیادہ اچھا ہے۔ میں اسے کاپی پر لکھ لوں۔" اس نے اپنا بستہ کھولتے ہوئے کہا۔

"کاپی پر لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ پورا رسالہ تم لے جاؤ۔ بڑی اچھی کہانیاں ہوتی ہیں اس میں۔ پیار محبت والی۔" شگفتہ نے رسالہ بند کرتے ہوئے اس کی جانب بڑھایا۔

"کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے؟" اسی وقت جمیلہ ان کے پاس آئی۔ اس نے جلدی سے ڈائجسٹ اپنے بستے میں چھپا لیا تھا۔

☆☆☆

[illegible]

طرف جانا ہے۔" گل بانو کے پوچھنے پر ہاشم نے بتایا تو اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔

"میں تو دن گن رہی تھی کہ آپ آئیں گے تو آپ کو دیکھ کر میرے دل کو تھوڑا سکون ملے گا۔" اس نے منہ بسورا۔

"اگر تم میرے سامنے ہوتیں تو جس لہجے میں تم نے کہا ہے، میں تمہاری یہ تیکھی سی ناک دبا دیتا۔" ہاشم نے پیار بھرے لہجے میں کہا لیکن اس کی اداسی کم نہ ہوئی۔

"اتنا اداس نہ ہو۔ ایک دو سال کی بات ہے، پھر میں اماں کو تمہارے گھر رشتہ لینے بھیج دوں گا۔"

"ایک دو سال؟ مجھ سے آپ کے بغیر ایک دن بھی نہیں گزارا جاتا اور آپ ایک دو سال کہہ رہے ہیں۔"

"اتنا انتظار تو کرنا ہی پڑے گا میری جان۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی نوکری مل جائے تب ہی رشتہ تمہاری طرف بھیجوں تاکہ ماموں اور مامی انکار نہ کر سکیں۔"

"وہ کبھی بھی انکار نہیں کریں گے۔ مجھے پتا ہے۔" اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ تین مہینوں کی چوری چھپی باتوں اور شگفتہ کی پڑھائی ہوئی پٹیوں نے اسے کافی نڈر بنا دیا تھا۔

"اور اگر انکار کر دیا تو؟" ہاشم نے اس کی محبت آزمانا چاہی۔

"تو میں بھاگ کر آپ کے پاس آ جاؤں گی یا چوہے مار دوائی پی لوں گی۔"

"اللہ نہ کرے۔ مریں تمہارے دشمن۔ خبردار جو آئندہ ایسی بات منہ سے نکالی تو۔" ہاشم جذباتی ہو گیا تھا اور اپنے لیے اس کا جذباتی پن محسوس کر کے اس نے ہواؤں میں اڑنا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

پھوپھا منیرا کیلے ہی آئے تھے اور دو دن رہ کر دوائی لے کر چلے گئے۔ ان دو دنوں میں اسے کوئی موقع نہ مل سکا کہ ابا کے موبائل کا چوری چھپے استعمال کر سکے اس لیے اس کی بے زاری عروج پر رہی۔ اب تو وہ بات بات پر یا تو رو پڑتی تھی یا شاہی سے جھگڑنا شروع کر دیتی تھی۔

"بات سن۔ ادھر بیٹھ میرے پاس اور بتا کہ کیا مسئلہ ہے۔" پھوپھا جی کے جانے کے بعد ذرا سی بات پر منہ بناتے ہوئے اندر کمرے میں جانے لگی تو اماں نے جھٹ سے اس کا بازو پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

"کچھ نہیں اماں۔" اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔

"پھر بھی کچھ تو ہے۔ بدلی بدلی سی لگ رہی ہے۔" اماں نے بغور اس کا چہرہ پڑھا لیکن وہاں بس بے زاری تھی، دنیا بھر سے بے زاری۔

"کہا ناں کچھ نہیں ہے۔ پیچھے نہ پڑ جایا کر۔" گل بانو نے روکھے پن سے جواب دیا اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اس بدتمیزی پر اماں نے اسے دو لگائی تھیں لیکن کسی مصلحت کے تحت وہ ضبط کر گئیں۔

"ہائے اللہ۔ میں کیا کروں؟" اندر آتے ہی اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ آنکھیں تھیں کہ بلاوجہ آنسوؤں سے بھرے جا رہی تھیں اور آنسو تھے کہ بغیر کسی وجہ کے بہے جا رہے تھے۔

"میں تو پریشان ہو گئی ہوں شبنم۔ گل بانو تو بس گم صم سی رہتی ہے، بات بات پر الجھتی ہے، اب تو میرے ساتھ بھی بدتمیزی کرتی ہے۔ پہلے تو ایسی نہیں تھی۔" شام کو ابا گھر آئے تو کھانے کے بعد اماں شبنم خالہ کو فون ملا کر بیٹھ گئی۔ حالانکہ کتنا دل تھا اس کا کہ جیسے ہی ابا گھر آئیں گے، وہ کسی نہ کسی طرح، آدھے ایک منٹ کے لیے ہی سہی، ہاشم سے بات کر لے گی لیکن۔

"ارے تم تو بلاوجہ پریشان ہو رہی ہو۔ اس عمر میں لڑکیاں ایسا کرتی ہی ہیں۔ میری اپنی جینو کا مزاج بھی کبھی کبھی بگڑ جاتا ہے۔ یہ کچی عمر ہے، گزر جائے گی تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔" شبنم خالہ نے تسلی دی تھی۔

''ہوں۔'' اماں ہنکارا بھر کر رہ گئیں۔

☆☆☆

''آپ سوچ نہیں سکتے کہ یہ تین دن میں نے آپ سے بات کیے بغیر کیسے گزارے ہیں۔'' جمعہ کا دن تھا، ابا جی جمعہ کی وجہ سے دکان جلدی بند کر دیتے تھے۔ ابھی بھی وہ نماز کی تیاری کے سلسلے میں نہا رہے تھے، اماں بھینس کا دودھ نکالنے میں مصروف تھی، اس کو اچھا موقع مل گیا۔ فوراً ہاشم کو مس کال دی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اس کی کال آ گئی۔

''میں خود اتنا بے چین تھا۔ اب مجھے بھی افسوس ہو رہا ہے کہ کاش ابا کے ساتھ میں بھی آ جاتا۔ ہم دونوں کے دلوں کو کچھ سکون تو ملتا۔'' ہاشم کے لہجے میں بھی بے تابی تھی۔

''اگر آپ کو میری فکر ہوتی تو ضرور آتے۔ آپ کو تو بس اپنی پڑھائی اور نمبروں کی فکر ہے۔'' محبوبہ نے روٹھنے کی اداکاری کی۔

''پڑھائی کی فکر اسی لیے ہے ناں تاکہ اپنی دلہن کو خوش رکھ سکوں۔ اسے کسی چیز کی کمی نہ ہو۔'' ہاشم شوخ ہوا۔

''میرے لیے آپ کا ساتھ ہی کافی ہوگا، مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ بس اللہ ہمیں جلدی ملا دے۔'' اس کے لہجے میں محبت اور خلوص بول رہا تھا۔

''گل بانو!'' عقب سے اماں کی کرخت آواز آئی تھی۔ وہ ڈر کر پلٹی اور اس کے ہاتھ سے موبائل گر گیا۔ اماں دودھ سے بھری بالٹی پکڑے، کمرے کے دروازے پر کھڑی غصے اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت میں اسے گھور رہی تھیں۔

''کس سے بات کر رہی تھی؟'' اماں نے بالٹی وہیں دروازے کے پاس رکھی اور تیزی سے اس کی طرف بڑھیں۔

''کسی سے نہیں اماں۔'' گل بانو ہکلائی۔

''کسی سے نہیں؟'' اماں نے غصے میں الماری کے پاس گرا ہوا ابا کا فون اٹھایا۔ ''کسی سے بات نہیں کر رہی تھی؟ یہ کس کا نمبر ہے پھر؟ ہیلو۔ ہیلو۔ کون ہے؟'' ان پڑھ اماں نے فون کان سے لگا کر دوسری طرف سے کچھ سننے کی کوشش کی لیکن کال منقطع ہو چکی تھی۔

''سچ سچ بتا مجھے کہ کس سے باتیں کر رہی تھی؟'' جواب میں گل بانو سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔

''میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے کہ تو کسی سے محبت کی پینگیں بڑھا رہی تھی۔ شرافت سے بتا دے اب۔'' انہوں نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑا لیکن وہ چپ رہی۔ بس اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''ٹھیک ہے، نہ بتا۔ شاہی۔ او شاہی۔ ادھر آ جلدی سے۔'' اماں نے وہیں سے آواز لگائی تھی۔ گھر کے باہر درخت پر چڑھا شاہی بوکھلا گیا۔

''آیا اماں۔''

''اماں، میری سہیلی تھی، ارم، اس سے بات کر رہی تھی اماں۔'' گل بانو نے ان سے موبائل پکڑنے کی کوشش کی تاکہ شاہی کے آنے سے پہلے ہاشم کی کال کا ریکارڈ مٹا دے۔

''مجھے پاگل نہ بنا گل بانو۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔'' اماں غصے میں بپھری ہوئی تھیں۔

''کیا ہوا اماں؟'' اتنے میں شاہی آ گیا تھا۔

''یہ لے فون اور مجھے دیکھ کر بتا کہ ابھی یہ کس سے بات کر رہی تھی۔'' اماں نے موبائل شاہی کو جیسے ہی پکڑایا، گل بانو نے ایک دفعہ پھر جھپٹا مار کر اس کے ہاتھ سے موبائل لینا چاہا لیکن اماں نے اسے زور سے پیچھے کی طرف کھینچا۔ وہ زمین پر گری تھی۔

''شاہی۔ کسی کا فون نہیں آیا تھا۔'' گل بانو نے شاہی کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا لیکن وہ کہاں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''اماں۔ آخری کال ہاشم بھائی کی تھی۔'' راز کھل گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سن ہو گئی۔

''ہاشم!'' اماں نے حیرت سے شاہی اور پھر زمین پر بیٹھی گل بانو کی طرف دیکھا۔ ''تو ہاشم سے باتیں کر رہی تھی؟'' اس نے کوئی جواب نہیں دیا، بس

سر جھکائے بیٹھی رہی۔

''تو ہاشم سے باتیں کر رہی تھی؟'' اماں اسے بالوں سے پکڑ کر کھڑا کرتے ہوئے چلائی۔ وہ پھر بھی چپ رہی۔

''اب گونگی ہو گئی ہے؟ زبان نہیں ہے منہ میں؟'' دائیں گال پر زور کا تھپڑ پڑا تھا۔ گل بانو سسکی۔ شاہی سہم کر دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''کب سے چکر چل رہا ہے؟ ساری شرم، ساری حیا مر گئی ہے تیری جو چکر چلا رہی ہے؟ مجھے پہلے ہی شک ہو گیا تھا کہ کوئی گل کھلا رہی ہے تُو، اسی لیے سب سے اکھڑی ہوئی تھی۔'' اماں اس کی پشت پر دوہتڑ مارتے ہوئے چلائی تھی۔ اسی وقت ابا نہا کر نکلے اور شور شرابے کی آواز سن کر جلدی سے ادھر آ گئے۔

''کیا ہو گیا؟ کیوں مار رہی ہے اسے؟'' انہوں نے اماں کو روکنے کی کوشش کی۔ گل بانو مار کھاتے ہوئے بے آواز رو رہی تھی۔

''ہماری عزت خاک میں ملا رہی تھی۔ ہاشم کے ساتھ پیار محبت کی باتیں کر رہی تھی۔'' اماں نے غصے سے موبائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا کہہ رہی ہے تُو؟ غلط سنا ہو گا تُو نے۔'' ابا نے حیران ہو کر روتی ہوئی گل بانو اور غصے سے بھری ہوئی اماں کی طرف دیکھا۔

''کوئی غلط نہیں سنا میں نے۔ ابھی ملاؤ فون اور کرو بات ہاشم سے۔''

''آرام سے، ایسے مسئلے اس طرح حل نہیں ہوتے۔'' ابا سر پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔

''تُو دفع ہو جا میری نظروں کے سامنے سے ورنہ چمڑی ادھیڑ کر رکھ دوں گی۔'' اماں ایک بار پھر گل بانو پر چلائی تھیں۔ منہ میں دوپٹہ دبا کر سسکیاں روکتی وہ بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

''ملاؤ ناں ذرا اس ہاشم کو فون۔ ساری بات سامنے آ جائے۔'' اماں ابھی بھی شدید غصے میں تھیں۔

''پہلے مجھے تو کچھ پتا چلے کہ ہوا کیا ہے؟''

''ہونا کیا ہے، میں دودھ نکال کر آئی تو کسی سے فون پر باتیں کر رہی تھی۔ میں نے ذرا کان لگا کر سنیں تو.....'' اماں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ابا بھی جہان دیدہ تھے، اماں کے ادھورے جملے کا پورا مطلب سمجھ گئے۔

''یہ تو منہ سے پھوٹ نہیں رہی تھی۔ شاہی نے بتایا کہ آخری فون ہاشم کا آیا تھا۔''

''ہوں۔'' ابا سوچ میں پڑ گئے۔

''کیا سوچے جا رہے ہو کسی؟ فون کیوں نہیں ملاتے؟'' اماں جز بز ہوئیں۔

''فون ملا تو لوں لیکن آگے کہوں کیا اسے؟ جو تھوڑی بہت عزت بچ گئی ہے، اسے ایسے ختم کر دوں؟'' ابا ان کے اصرار پر جھنجھلا اٹھے۔ اماں بھی گہرے سانس لیتے ہوئے ان کے پاس بیٹھ گئیں۔ کچھ منٹ یونہی خاموشی میں گزر گئے۔

''اچھا میں کرتا ہوں بات۔'' آخر کچھ سوچ کر ابا نے فون اٹھایا اور ہاشم کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن کسی نے فون نہیں اٹھایا۔

''فون نہیں اٹھا رہا وہ۔'' ابا نے کال کاٹ دی۔

''اٹھائے گا بھی کیسے۔ منہ چھپا کر پڑا ہو گا کہیں۔'' اماں نے ناراضی سے کہا۔

''بات کو اتنا نہ بڑھاؤ۔ جوان اولاد ہے۔ آرام سے بات کرو گل بانو سے، پوچھ کہ اصل بات کیا ہے۔''

''وہ جیسے بتا دے گی۔'' اماں کے لہجے میں غصہ اور طنز تھا۔

''اگر تُو اس طرح مار کٹائی کر کے پوچھے گی تو کبھی نہیں بتائے گی۔ پیار سے، تحمل سے پوچھ۔ بس ایک دو جملے سن کر اپنی دھی پر سے اعتماد نہ ختم کر۔ کچی عمر ہے، ہو جاتی ہیں ایسی غلطیاں۔'' ابا ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔

''کچی عمر اور کام پکی عمر والے۔'' اماں

بڑبڑائی تھیں۔

"میں نماز پڑھنے جارہا ہوں۔ آرام سے بات کریو اس سے۔ کوئی حل نکل آئے گا۔" ابا چلے گئے اور اماں وہیں چارپائی پر لیٹ گئیں۔ صدمے نے جیسے ان کی ہمت اور طاقت نچوڑ لی تھی۔

سوچوں کے بھنور میں گم اماں چارپائی پر لیٹ گئیں۔ گل بانو کی پیدائش، اس کی پیاری توتلی سی باتیں، آنکھوں میں معصومیت سموئے انہیں کام کرتے دیکھنا اور پھر اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اماں کی دیکھا دیکھی خود بھی کام کرنے کی کوشش کرنا، جب بھی بازار جانا ہوتو اماں کی انگلی مضبوطی سے ہر وقت پکڑے رکھنا، یہاں تک کہ اماں چڑ جاتی تھی "اب انگلی چھوڑ بھی دے، کچھ اور پکڑ ہی نہیں پا رہی"۔

گھر میں ہرن کی طرح قلانچیں بھرتی، اِدھر اُدھر بھاگتی ہوئی، شاہی سے لڑتی جھگڑتی اور پھر اس کے لاڈ اٹھاتی ہوئی گل بانو۔ اماں کی گانو!

"میری گل بانو تو معصوم تھی۔ کیا پتا ہاشم نے ہی اسے سبز باغ دکھائے ہوں۔ جوان ہورہی ہے، اس عمر میں تو کوئی ہلکا سا مسکرا کر دیکھ لے تو اچھا لگنا شروع ہوجاتا ہے، شاہی کے ابا ٹھیک کہتے ہیں، مجھے اس سے پیار سے پوچھنا چاہیے، آخر کو وہ میری ذمے ہے، میری جمی ہوئی، ایسے تھوڑی کسی غلطی پر دور کر دیتے ہیں۔" اماں کی نظر میں جیسے پیدائش سے لے کر اب تک کی گل بانو کی پوری زندگی فلم کی طرح دوڑ گئی تھی۔ غصہ ٹھنڈا ہوچکا تھا اور جوش کی جگہ ہوش نے لے لی تھی۔

کمرے سے نکل کر پہلے تو انہوں نے دودھ سنبھالا جو ابھی تک دروازے کے قریب پڑا ہوا تھا۔ پھر آہستہ سے برابر والے کمرے کی طرف بڑھیں۔ گل بانو کمرے کے ایک کونے میں اسٹیل کی پیٹی کے ساتھ قدرے چھپ کر بیٹھی ابھی تک رو رہی تھی۔

"گل بانو۔ اِدھر آ میرے پاس۔" اماں نے نرمی سے اسے بلایا تو روتی آنکھوں کے ساتھ اس نے چونک کر اماں کی طرف دیکھا۔

"آ میری بیٹی، میرے پاس آکر بیٹھ اور مجھے سب کچھ سچ سچ بتا۔ رب کی قسم، اب تجھے نہیں ماروں گی۔" اماں نے پیٹی کے سامنے بچھی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اسے کہا تھا۔ وہ آنسو پونچھتی ہوئی جھجک کر اٹھی اور ان کے برابر بیٹھ گئی۔

"دیکھ۔ مجھے تجھ سے ایسی امید نہیں تھی اس لیے اتنا غصہ آگیا۔ چل اب مجھے بتا سب سچ سچ تاکہ ہم کچھ سوچیں۔" اماں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا تو چودہ سال کی لڑکی ماں کے پیار کا لمس ملتے ہی پگھل سی گئی اور سب کچھ سچ سچ بتاتی چلی گئی۔

"ہوں۔" ساری بات بتانے کے بعد وہ خاموش ہوئی تو اماں نے کچھ سوچتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

"تجھے لگتا ہے ہاشم تجھ سے ویاہ کرے گا؟" اماں کے پوچھنے پر اس نے سر جھکا لیا۔ اس بات کا وہ کیسے جواب دیتی۔

"چل، تیرے ابا آتے ہیں تو ان سے بات کرتی ہوں۔ لڑکی والے رشتہ ڈالتے اچھے نہیں لگتے لیکن تیری خاطر میں گڈی سے بات کروں گی۔ مگر تو وعدہ کر کہ آج کے بعد تُو کبھی ہاشم سے اس طرح چھپ کر بات نہیں کرے گی۔ چھپ کر کرنے والا کام گناہ ہوتا ہے، نہ رب پسند کرتا ہے نہ لوگ۔ سمجھ میں آئی؟"

"اماں۔ مجھے معاف کردے۔ غلطی ہوگئی مجھ سے۔" گل بانو نے اماں کے آگے شرمندگی سے ہاتھ جوڑ دیے۔

"اللہ تجھے خوش رکھے، تیری عزت کی حفاظت کرے۔" اماں نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا تھا۔ گل بانو کے دل پر شرمندگی، گناہ اور ماں باپ کا مان توڑنے کا بھاری پتھر آگرا تھا۔

ابا نماز پڑھ کر گھر آئے تو ایسا لگا جیسے انہیں کچھ پتا ہی نہیں ہے گھر میں کتنی بڑی بات ہوگئی ہے۔ معمول کی طرح گل بانو اور شاہی سے کھانے کے

دوران باتیں کیں، کچھ دیر آرام کیا اور پھر دکان پر چلے گئے۔ اماں نے بھی دوبارہ اس واقعے کو نہیں چھیڑا اور یہی وہ بات تھی جو اسے شرمندہ کیے جا رہی تھی۔

''اب بتا، کیا کہا گل بانو نے؟'' رات کو شاہی اور وہ سو گئے اور اماں ابا کے برابر والی چارپائی پر آ کر بیٹھی تو ابا اٹھ بیٹھے۔ اماں نے ساری بات بتا دی، ہاشم کا گل بانو کی طرف لگاؤ، اس کے دیے ہوئے ہندے اور فون پر دونوں کے رابطے کا طریقہ۔

''اس کا مطلب ہے کہ ہاشم بھی۔'' ابا نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور کچھ سوچنے لگے۔

''ویسے ہاشم شریف لڑکا لگتا ہے۔ جب وہ گڈی کے ساتھ آیا تھا تو اس وقت میرے ذہن میں گل بانو کے لیے اس کا خیال آیا تھا لیکن چپ کر گئی کہ ابھی گل بھی چھوٹی ہے اور ہاشم بھی پڑھ رہا ہے۔'' اماں نے بستر کی سلوٹیں ہٹاتے ہوئے کہا۔

''ہوں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کریں۔ خود سے بیٹی کا رشتہ دیتے ہوئے عجیب لگتا ہے، اگر کچھ نہ کریں تو بچے پھر سے کوئی ایسی حرکت نہ کر لیں۔'' کچھ دیر دونوں ہی خاموش، اپنی اپنی جگہوں پر سوچتے رہے۔

''بات تو کرنی پڑے گی۔ میں کل باتوں ہی باتوں میں گڈی سے دونوں کے رشتے کی بات کرتی ہوں۔ یا پھر ہاشم کو فون ملا کر سمجھاؤ کہ اپنے بڑوں کے ذریعے بات کرے۔'' اماں نے کہا تھا۔

''چل، دیکھتے ہیں کل، کیا کرنا ہے۔'' ابا جی لیٹ گئے تھے۔ اماں بھی سرہانہ ٹھیک سے رکھتے ہوئے لیٹ گئیں۔ دونوں کی آنکھوں سے نیند دور تھی اور دونوں ہی آسمان پر ٹمٹماتے، جلتے بجھتے ستاروں کو دیکھتے ہوئے بھولی سی بیٹی کے بارے میں سوچ رہے تھے جو اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگ گئی تھی۔

اگلے دن گل بانو اسکول گئی ہوئی تھی تو ابا نے اماں کو گڈی کا نمبر ملا دیا۔

''دیکھ گڈی، ہم غیر تو ہیں نہیں۔ اپنے ہی ہیں اس لیے میں خود ہی گل بانو کا رشتہ ڈال رہی ہوں ہاشم کے لیے۔ تو کیا کہتی ہے؟'' اماں نے کہا تھا۔ بیٹی کا پردہ رکھنا بھی ملحوظ تھا۔

''کیا کہہ رہی ہے طنو؟'' گڈی کے لہجے میں حیرت تھی۔

''کیوں، کیا ہوا؟ گل بانو کو تو نے دیکھا تو ہے، سوہنی نہیں ہے کیا؟'' اماں کو گڈی کی حیرت پر تعجب ہوا۔

''نہیں نہیں، میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ گل بانو تو بہت ہی اچھی لڑکی ہے۔ لیکن طنو۔ ہاشم کے رشتے کی بات تو بانو کی نند کے ساتھ چل رہی ہے۔''

''بانو کی نند؟'' اب اماں حیران ہوئیں۔

''ہاں، ابھی پچھلے ہفتے ہی بات چلائی ہے۔ لڑکی میٹرک کر رہی ہے۔'' گڈی اپنی ہی دھن میں بولے جا رہی تھی۔

''تو نے ذکر نہیں کیا پہلے۔'' اماں نے بے بسی سے کہا۔

''رشتہ پکا ہوتا تو ذکر کرتی ناں۔ ابھی تو بات شروع ہی ہوئی ہے۔'' گڈی ہنسی تھی۔

''اچھا۔ ہاشم، ہاشم کو پتا ہے اس رشتے کا؟ راضی ہے وہ؟'' اماں نے اٹکتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔

''وہ تو بڑا خوش ہے۔ اسی نے تو بات چلانے کو کہا تھا۔'' مزید اماں سے سنا نہ گیا۔

''اچھا میں ہنڈیا دیکھ لوں۔ خدا حافظ۔'' کال بند کر کے وہ کچھ دیر وہیں گم صم بیٹھی رہیں۔

''کیا ہوا؟'' ابا بھینس کو چارہ ڈال کر آ رہے تھے۔

''ہاشم کی تو بات پکی ہو رہی ہے۔ بانو کی نند کے ساتھ۔'' اماں کے لہجے میں دکھ تھا۔

''اچھا؟'' ابا نے بھنویں سکیڑیں۔ ''اور ہاشم؟''

''وہ خوش ہے۔ گڈی بتا رہی تھی کہ اسی نے بات چلانے کو کہا تھا۔'' اماں وہیں کرسی پر بیٹھ گئیں اور ابا کو تکنے لگیں۔ ''اب کیا ہوگا؟''

''ہوں۔ تو ہاشم کھیل کھیل رہا تھا ہماری دھی

کے ساتھ۔ تو فکر نہ کر، گل بانو کو آ لینے دے، اس کے سامنے بات کرتا ہوں ہاشم سے۔" ابا نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"لیکن شاہی کے ابا۔ گل کے سامنے؟" اماں، ابا کی بات سن کر حیران بھی ہوئیں، پریشان بھی۔

"کہہ دیا ہے ناں کہ فکر نہ کر۔ بس رب پہ بھروسہ رکھ اور بیٹی کے نیک نصیب کی دعائیں کر۔ بس یہی چاہیے۔ اب جا اور ہانڈی روٹی کر، میں بھی دکان کھولوں جا کر، اور ہاں۔" ابا جی چلتے چلتے پلٹے۔

"آج گل بانو کی پسند کا کچھ پکا لے۔ آج اس کا دل ٹوٹے گا۔" آخری جملہ کہتے ہوئے 'فکر نہ کر' کہنے والے ابا کا لہجہ بھی بھرا گیا تھا۔ صافے سے آنکھیں پونچھتے ہوئے وہ جلدی سے بیرونی دروازہ پار کر گئے۔

"گل بانو۔ میری دھی۔ یہ کیا کیا تُو نے۔" اماں نے یاسیت سے سوچا تھا۔

☆☆☆

"گل بیٹی۔ ادھر آ۔" ابا نے دوپہر کے برتن سمیٹتی گل بانو کو پیار سے اپنے پاس بلایا۔

"جی ابا؟" وہ جھجکتی ہوئی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اتنا تو اسے پتا تھا کہ ابا کو سارے معاملے کا علم ہے۔

"تیری ماں نے سب بتا دیا تھا مجھے۔ اب دیکھ، میں ہاشم کو فون کرنے لگا ہوں۔ تیرے سامنے مونبل کی آواز کھول کر بات کروں گا تاکہ تُو سب سنے اور تجھے یقین آئے کہ ہم تیرا بُرا نہیں چاہتے۔" ابا کی بات سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"نہیں ابا، مجھے یقین ہے، تُو اور اماں کبھی بھی میرا بُرا نہیں سوچیں گے۔" اس نے روتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا تھا۔

"نہ نہ، رونے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اب چپ کر جا، میں ہاشم کو فون ملانے لگا ہوں۔" ابا نے اس کے سر کو نرمی سے تھپتھپاتے ہوئے کہا اور ہاشم کا نمبر ملا کر اسپیکر آن کر دیا۔ گھنٹی بجتی رہی لیکن ہاشم نے فون نہیں اٹھایا۔ آخر گھنٹی بج بج کر کال خود ہی کٹ گئی۔

"جس انسان کو پتا ہو ناں کہ اس نے غلط کیا ہے، وہ ایسے ہی بھاگتا ہے۔" ابا نے کہا اور گڈی پھوپھی کا نمبر ملا لیا۔

"سلام علیکم بھائی۔" دو گھنٹیوں کے بعد ہی گڈی پھوپھی نے کال اٹھا لی تھی۔

"وعلیکم السلام گڈی۔ کیسی ہے تُو؟" اسپیکر پھر آن تھا۔ گل بانو رونا بھول کر ابا کی کارروائی دیکھنے میں لگ گئی۔ قریب ہی اماں بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔

"میں ٹھیک ہوں۔ تسی سناؤ۔"

"رب کا کرم ہے۔ گڈی۔ یہ ہاشم پتر سے بات کرا دے ذرا۔"

"اچھا اچھا، ابھی کراتی ہوں۔" یہ کہہ کر گڈی پھوپھی نے ہاشم کو آواز دی تھی۔ اسے آنا ہی پڑا۔

"السلام علیکم ماموں جی۔" لہجے میں جھجک واضح تھی۔

"وعلیکم السلام ہاشم۔ دیکھ پتر۔ مجھے پتا ہے تو میرا فون جان بوجھ کر نہیں اٹھا رہا تھا۔ ڈرنے کی بات نہیں ہے۔" ابا نے کن انکھیوں سے اس کو دیکھتے ہوئے موبائل کے اسپیکر پر کہا۔

"نن..... نہیں ماموں۔ ایسی بات نہیں ہے، میں دوسرے کمرے میں تھا اس لیے آپ کا فون نہیں سن سکا۔" ہاشم ہکلا رہا تھا۔

"چھوڑ یہ باتیں، مجھے بس تو اتنا بتا کہ گل بانو اور تیرے بیچ کچھ ہے؟ ہے تو سچ سچ بتا دے، میں کچھ نہیں کہوں گا۔" ابا کی بات سن کر گل بانو کا سر شرم سے جھک گیا، اسے لگا کہ وہ کبھی ابا کے سامنے سر نہیں اٹھا سکے گی۔ لیکن ہاشم کا جواب سنتے ہی اس کا سر حیرت سے اٹھ گیا۔

"نہیں ماموں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے ایسا کبھی بھی نہیں سوچا۔" ہاشم نے تیزی سے کہا تھا۔ اماں نے حیرت سے انگلی دانتوں میں دبا لی اور گل بانو کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''تو نے کبھی اس سے پیار محبت کی باتیں نہیں کیں؟ شادی کا وعدہ نہیں کیا؟'' ابا بہت تحمل اور ضبط کے ساتھ پوچھ رہے تھے۔

''نہیں..... نہیں ماموں، ایسا تو میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔'' ہاشم مزید کچھ کہہ رہا تھا، ابا نے فون ہی کاٹ دیا۔

''تو نے سنا تھا ناں گل بانو۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے ایسا کبھی بھی نہیں سوچا، تو اب تو نے بھی نہیں سوچنا اس کے بارے میں۔ مجھے پتا ہے کہ وہ جھوٹا ہے اور تو سچی، مجھے یہ بھی پتا ہے کہ اس نے یہ سب تجھے کہا ہوگا جو تو نے ہمیں بتایا ہے لیکن بس۔ اب یہ سب یہیں ختم۔ جو پیار چھپ چھپ کر ہوتا ہے ناں، اس کا کوئی گواہ بھی نہیں ہوتا، اور جب کوئی گواہ نہ ہو تو پھر وہ پیار ایسے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ایک ہی ہلے میں سب بھول بھال جاتا ہے۔'' ابا اس کو اپنے ساتھ لپٹائے کہہ رہے تھے اور گل بانو کی آنکھیں بھیگتی جا رہی تھیں۔

''یہ پیار، یہ محبت، کہانیوں اور ڈراموں میں اچھی لگتی ہیں کیونکہ وہ انسان نے خود اپنی مرضی سے لکھے اور بنائے ہوتے ہیں۔ اصل دنیا میں تو محبت اسی کی اچھی جس کے ساتھ رب سوہنے نے جوڑ بنایا ہے، وقت سے پہلے اس محبت کو ناقدروں کو نہ دے۔ اب جا اور جا کر رب کا شکر کر جس نے تیری عزت اور بھرم رکھا۔ چل شاباش میری دھی۔'' ابا کی باتیں سن کر اپنے دل پر آنسو گراتی گل بانو میکانکی انداز میں اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ اماں نے بھی اس کے پیچھے جانا چاہا۔

''نہ جا، رونے دے اسے، رونے سے دل ہلکا ہو جاتا ہے اور دل ہلکا ہو تو زیادہ صاف نظر آتا ہے۔'' اپنی آنکھیں پونچھتے ابا جی نے انہیں روک دیا تھا۔ وہ چپ چاپ آ کر دوبارہ چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ کمرے کی فضا بوجھل ہو گئی تھی۔ آج پھر ایک دل ٹوٹا تھا، آج پھر وقتی محبت کا پول کھلا تھا۔

بیٹی کچے چولہے کے پاس پیڑھی پر چپ چاپ بیٹھی، کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھی۔ ماں سے دیکھا نہ گیا۔

''ایسے کیوں بیٹھی ہے گل بانو؟'' اماں اس کے پاس جا کر بیٹھی تھیں۔ اس نے اداسی سے ان کی طرف دیکھا۔

''اماں۔ یہ سب کیا تھا؟'' آنکھوں میں نمی اترنے کو بے تاب ہوئی۔ اماں نے گہرا سانس لیا اور چولہے کے نیچے پھونک مار کر بجھتی آگ کو تیز کیا۔

''یہ سب بس ایک کھیل تھا، ایک بہلاوا، وقت گزاری، ٹیم پاس۔ اور کچھ نہیں۔''

''محبت کچھ نہیں ہوتی؟''

''کیڑھی محبت گانو؟ محبت یہ تھوڑی ہوتی ہے جو دنیا سے چھپ چھپ کر کی جائے؟ لگتا ایسا ہی ہے کہ یہ محبت ہے، لیکن وہ ہوتی نہیں۔ محبت کرنے والے مرد میں اتنی ہمت تو ہو کہ دنیا کے سامنے آ کر بتا سکے، عزت سے لڑکی کا ہاتھ مانگ سکے۔ اندھیرے میں چھپ کر ہاتھ پکڑنا کون سی محبت ہوئی، یہ تو کھوٹ ہوا دل کا۔'' اماں ان پڑھ تھی لیکن زمانے کو پڑھ چکی تھی۔

''بس چھوڑ اب ایسی باتیں، تیرے ابا نے کہا تھا ناں کہ سوچنا نہیں اب اس بارے میں۔ مٹی پا۔'' اماں کی بات سن کر نم آنکھوں کے ساتھ گل بانو مسکرائی تھی۔

اس نے سنبھل جانا تھا، نرم سے دل کی کچی مٹی میں محبت کا بیج گرا تھا، تھوڑا وقت تو لگنا تھا اسے نکال پھینکنے میں۔ بس تھوڑا سا وقت لگنا تھا۔ لیکن یہ بات تو پکی تھی کہ اب گل بانو نے بھٹکنا نہیں تھا، وہ اب بھٹک سکتی ہی نہیں تھی، اتنی بچی اب تھوڑی رہی تھی کہ ابا اماں کے اعتبار اور ظرف کے آگے وہ یہ غلطی، دوبارہ کرتی، دوبارہ اپنی محبت کسی ناقدرے کو پکڑاتی، دوبارہ کسی شگفتہ کی باتوں میں آ جاتی اور دوبارہ اپنے دل کی مٹی میں محبت کا بیج بوتی۔ اماں اور ابا نے اس کی غلطی سدھار کر اس کے اوپر ایک اور احسان کر دیا تھا۔

رقشین نعیم

یار دل دار

حیدر نے بیگ کی زپ بند کی، موبائل درمیانی میز سے اٹھا کر جیب میں رکھا۔ ایک زندگی سے بھرپور مسکراتی ہوئی نظر دوستوں پر ڈالی اور باری باری سب سے بغل گیر ہونے لگا۔

الس، عادل اور احسن سے مل کر ادھر ادھر دیکھا۔ محب اللہ نظر نہیں آیا۔ احسن نے اس کی نظروں کا مطلب سمجھ کر میڈروم کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔

"اوئے مولوی! آجا یار باہر۔ دولہا رخصت ہونے لگا۔"

محب اللہ فوراً ہی باہر آ گیا۔ ہاتھوں میں خاکی رنگ کا ایک لفافہ پکڑا ہوا تھا۔ آ کر حیدر سے گلے ملا اور خاکی رنگ کا لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"یہ لے..... کچھ خشک میوہ جات وغیرہ ہیں۔ راستے میں کھا لینا۔"

"واہ جی واہ..... کیا بات ہے..... جناب دولہا میاں کو خشک میوہ جات پیش کیے جا رہے ہیں۔ گویا وہ شادی کرنے نہیں دنگل لڑنے جا رہے ہوں۔" عادل ہاتھ نچاتے ہوئے بولا۔

"ویسے ایک بات تو بتا لالے!" احسن نے محب اللہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"پوچھ، لالے کی جان!" محب اللہ پورے کا پورا احسن کی طرف گھوم گیا۔

"سفر پر تو ہم بھی جاتے ہیں۔ ہمارے ساتھ تو یہ لاڈ تو نے کبھی نہیں کیے۔" اس نے آنکھوں سے حیدر کے ہاتھ میں پکڑے لفافے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو گھوڑی چڑھنے کی تیاری کر..... تیرے ساتھ اس سے کہیں زیادہ لاڈ کروں گا۔" محب اللہ نے احسن کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"شادی میری ہو رہی ہے....." حیدر کھنکھارتے ہوئے بولا۔ "سامان باندھ کر گھر سے "میں" جا رہا ہوں۔" اس نے میں پر اچھا خاصا زور دیتے ہوئے کہا۔

"تم سب ادھر ہی ہو..... مجھے ہنسی خوشی الوداع کرو، اس کے بعد مارتے رہنا بونگیاں۔"

"اوکے۔" احسن نے تابع داری سے سر ہلایا۔

"اور ہاں....." حیدر دو چار قدم چل کر، کچھ یاد آنے پر مڑا۔

"تم سب لوگ ٹھیک وقت پر پہنچ جانا۔"

"اور تو.....!" محب اللہ کی طرف اشارہ کیا۔

"جان پر کھیل کر بھی آنا پڑا تو آ جانا..... ورنہ ساری زندگی بات نہیں کروں گا۔" شہادت کی انگلی اس کے سینے پر بجائی۔ "میرے نکاح پر بھی تو نہیں تھا۔"

"کیونکہ..... تیرا نکاح تو درمیان میں یونہی، زبردستی بلکہ خوامخواہ ہی ہو گیا تھا۔ اصل میں تو فنکشن تیری بہن کی شادی کا تھا۔" محب اللہ نے یاد کروایا۔

"اوہ ہاں.....!" حیدر نے ہونٹ سکوڑے۔ باقی تینوں نے بھی سر ہلایا۔

"ویسے یار!" حیدر نے محب اللہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "تو ضرورت سے زیادہ حاضر جواب ہوتا جا رہا ہے۔ اب تیری بھی شادی ہو جانی چاہیے۔"

محب اللہ جھینپ کر دو قدم پیچھے ہوا۔

"صدقے جاؤں....." عادل نے بلائیں لیتے ہوئے کہا۔ "کیسا پیارا لگتا ہے میرا لعل شرماتے ہوئے۔"

"تھوڑی شرم وحیا تو بھی ادھار لے لے کہیں سے۔" حیدر، عادل کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں، کیوں نہیں..... تجھ سے ہی ادھار لے لیتا ہوں....." قبل اس کے کہ عادل مزید کچھ بولتا..... انس نے دونوں ہاتھ اٹھائے۔

"ایک منٹ، ایک منٹ..... آئیں حیدر بھائی! آپ کو باہر تک چھوڑ آؤں۔ دیر ہو جائے گی آپ کو....." وہ حیدر کو بازو سے پکڑتے ہوئے بولا۔

حیدر ہنسنے لگا۔

"نہیں یار! خود ہی چلا جاتا ہوں۔ وقت پر پہنچ جانا تم سب، انتظار کروں گا میں۔" وہ باہر کی جانب بڑھا۔

باقی چاروں اسے چھوڑنے گیٹ تک ساتھ

آئے۔

☆☆☆

حیدر واش روم میں تھا، جلدی جلدی نہا کر کپڑے تبدیل کرنے کے چکر میں وہ موبائل کی مسلسل بجتی ہوئی گھنٹی کو جان بوجھ کر نظر انداز کر رہا تھا۔ وہ چاروں اڈے پر پہنچ چکے تھے۔

عین اس وقت جبکہ وہ پانی گرم کر کے غسل کے لیے جانے ہی والا تھا عادل کی کال آئی۔

"یار! ہم لوگ پہنچ گئے ہیں۔ لینے کے لیے آجا۔"

حیدر سوچ میں پڑ گیا۔ گیس کی لوڈشیڈنگ کی وجہ سے تین گھنٹے میں پانی گرم ہوا تھا۔ اس وقت یہ گرم پانی سونے کے بھاؤ بھی کوئی اس سے خریدتا تو وہ نہ دیتا۔

وہ سوچ بچار میں پڑا ہوا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کرے۔

"سو گیا ہے یا دار فانی سے کوچ کر گیا ہے۔" عادل کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"جگر! بس آدھا گھنٹہ دے دے مجھے، پانی بالکل تیار ہے۔ بس میں نہا کر فوراً پہنچتا ہوں۔"

"آدھا گھنٹہ....." عادل اتنی زور سے چیخا کہ حیدر کو مجبوراً موبائل کان سے دور کرنا پڑا۔

"آدھا گھنٹہ لگائے گا نہانے میں، شادی کی خوشی میں کیا پورا سال بغیر نہائے گزار لیا۔" عادل کی تشویش بھری آواز حیدر کی سماعت سے ٹکرائی۔

"اوہ نہیں یار! نہانے میں تو بس پانچ منٹ لگیں گے۔ باقی وقت تو راستے میں لگے گا۔"

"چل ٹھیک ہے، پھر ملتے ہیں۔" عادل نے فون بند کیا۔

جب تک حیدر غسل خانے سے باہر آیا۔ موبائل چوتھی بار بج بج کر تھک ہار کر خاموش ہو چکا تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ ان ہی چاروں میں سے کوئی ہوگا اور جلدی آنے کی تلقین کرنے کے لیے بے چین ہوگا۔

حیدر نے جیکٹ پہنی، گرم مفلر کانوں پر لپیٹ کر اوپر سے گرم اونی ٹوپی پہنی، کی چین اٹھا کر ہاتھ میں گھماتے ہوئے، موبائل اٹھا کر جیب میں ڈالتے ہوئے یونہی ایک سرسری سے نظر موبائل کی اسکرین پر ڈالی۔ بے ساختہ ہی ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ چار مسڈ کالز کے ساتھ زری کا نام جگمگا رہا تھا۔

"اوہ....." ہونٹ گول کر کے افسوس بھری سانس خارج کی، لیکن اس وقت اس سے زیادہ کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ کال کرنے کا وقت تو بالکل بھی نہیں تھا۔

امی کو مطلع کر کے وہ ہیلمٹ اٹھا کر باہر آگیا۔ بائیک اسٹارٹ کرنے کے لیے کک لگانے ہی والا تھا کہ موبائل پھر سے گنگنانے لگا۔ جیب سے نکال کر دیکھا۔ زری کالنگ لکھا آرہا کر رہا تھا۔ بات کرنے کا وقت نہیں تھا اور نظر انداز کرنے کی ہمت نہیں تھی، سو کال ریسیو کر ہی لی۔

"ہاں بولو زری! خیریت ہے۔" بغیر کسی تمہید کے انتہائی عجلت میں اس نے دریافت کیا۔

"حیدر! آج ہماری مہندی کی رات ہے۔" جانے کس دھن میں وہ بولی تھی۔

"یہ بتانے کے لیے تم نے کال کی ہے؟" حیدر نے حتی الامکان خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کی۔

"نہیں، یہ تو یونہی ایک بات کر دی۔ اچھا سنو۔" اس کا لہجہ کچھ دھیما ہوا۔

"زری! میں اس وقت تھوڑا جلدی میں ہوں۔ بعد میں بات کرتے ہیں۔" بات ختم کر کے اس کو احساس ہوا کہ زری نے اس کی بات بالکل نہیں سنی، وہ اپنے ہی کہے جا رہی تھی۔

"میری سہیلی میرے لیے اتنا خوب صورت مہندی کا جوڑا، پیلا پراندہ اور کنگن لے کر آئی ہے۔ اتنی خوب صورت لگ رہی ہوں میں ایمان سے۔" اس کے بعد وہ یقیناً تھوڑا سا شرمائی بھی ہوگی۔ لیکن حیدر کے پاس محظوظ ہونے کا بالکل وقت نہیں تھا۔

"کتنا ظلم کیا ہے نا ہمارے گھر والوں نے، جو ہماری مہندی کا فنکشن نہیں رکھا۔" وہ نان اسٹاپ

بولے جارہی تھی۔

''تو کیا کروں.....؟ ان کے ظلم کے خلاف دھرنا دے دوں یا جان کا نذرانہ پیش کروں۔'' حیدر ضبط کی انتہا پر تھا۔

''کیا ہے..... اتنا غصہ کیوں کررہے ہو؟'' زری تنک کر بولی۔

''زری! میری بات سنو، میں اس وقت جلدی.....''

اس کا جملہ ابھی درمیان میں ہی تھا کہ زری ایک مرتبہ پھر شروع ہوگئی۔

''میں نے تو اب ساری عمر تمہاری ہی باتیں سننی ہیں۔ تم ذرا سکون سے میری بات سنو۔''

(یا اللہ! معلوم نہیں کتنی صلوٰتیں وہ لوگ عائبانہ سنا چکے ہوں گے اور کتنی وہاں پہنچ کر سننا پڑیں گی..... ایک تو یہ زری کی بچی.....)

''سب کہہ رہے ہیں۔ میں اتنی حسین لگ رہی ہوں اس وقت اتنا روپ آیا ہے مجھ پر..... پر..... اگر تم نے ہی نہ دیکھا تو پھر کیا فائدہ..... سنو، تمہارا دل نہیں کررہا مجھے دیکھنے، مجھ سے ملنے کو.....؟''

(اس وقت تو میرا فقط یہی دل کررہا ہے کہ سر کسی دیوار سے دے ماروں)

''زری! میں جب سے پیدا ہوا ہوں تمہیں دیکھتا آرہا ہوں۔'' وہ اچھا خاصا زچ ہو کر بولا۔

''جھوٹ مت بولو..... پورے تین برس چھوٹی ہوں تم سے۔ جب تم پیدا ہوئے تھے۔ میں نہیں تھی تب۔'' زری تڑپ کر بولی۔

''زری پلیز، میرے دوست بہت دیر سے میرا انتظار کررہے ہیں، مجھے ان تک پہنچنے کی جلدی ہے۔ تم سے میں بعد میں.....'' اچانک ہی اس کو احساس ہوا کہ وہ اس کی بات بالکل نہیں سن رہی۔

''پتا ہے حیدر! شرارے فلم کی ہیروئن کی خاطر ہیرو سارے زمانے سے چھپ کر اس کے کمرے تک پہنچ آیا تھا۔ مہندی کی رات اور.....''

کال کاٹنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

''اف.....'' ایک ٹھنڈی سانس بھر کر حیدر نے بائیک اسٹارٹ کیا۔

☆☆☆

''زیادہ لیٹ تو نہیں ہوا نا.....'' سلام دعا کے بعد کچھ کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے اس نے پوچھا۔

''نہیں حیدر بھائی! صرف ایک گھنٹہ پندرہ منٹ لیٹ ہوئے ہیں۔ اس آدھے گھنٹے کے بعد جس میں آپ نے ہمیں جوائن کرنا تھا۔'' انس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ..... اصل میں سڑک پر ٹریفک بہت زیادہ تھا۔'' کچھ خجالت آمیز انداز میں حیدر نے وضاحت پیش کی۔

''اوہ..... آئی سی۔'' احسن نے پیشانی پر دو انگلیاں مس کرتے ہوئے کہا۔ ''شکر ہے تو نے بتادیا ورنہ ہم تو سمجھے تھے تو پورا گھنٹہ بس نہاتا ہی رہا ہے۔''

''یار حیدر! باقی سب تو ٹھیک ہے۔ پر اس موٹر سائیکل پر ہم سب پورے کیسے آئیں گے۔'' محب اللہ نے بروقت ایک انتہائی معقول سوال کیا۔

''تم لوگ ٹیکسی میں آؤ گے۔ موٹر سائیکل پر میں آؤں گا صرف۔'' حیدر نے اردگرد ٹیکسی کی تلاش میں نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

''میں تیرے ساتھ چلوں گا موٹر بائیک پر۔'' عادل کی بات پر حیدر تھوڑا پریشان ہوا۔

''یار! وہ اصل میں، مجھے ایک بڑے ضروری کام سے کہیں پہنچنا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور کو ایڈریس سمجھا کر میں تم لوگوں کو بھجوادوں گا۔ امی، تم لوگوں کا ویٹ کررہی ہیں۔ میں بس آدھے پونے گھنٹے تک واپس آجاؤں گا۔'' پوری پلاننگ اس نے دوستوں کے گوش گزار کی۔

''اچھا جی..... اور جو ٹیکسی ڈرائیور ہمیں اغوا کر کے کہیں اور لے گیا پھر.....؟'' احسن الفاظ چبا چبا کر بولا۔

''ٹیکسی ڈرائیور..... اور اغوا!'' حیدر کا منہ کھلا۔

''اکیلا، بے چارہ آدمی..... تم چار مشٹنڈوں کو اغوا

کر کے کیوں اور کہاں لے جائے گا۔" حیدر نے جوابی وار کیا۔

"اور جو خدانخواستہ، تجھ بے چارے، اکیلے کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو گیا۔ اللہ نہ کرے ایکسیڈنٹ وغیرہ۔ تو شامت تو ہم بے چاروں کی آئے گی۔ تیرے گھر میں تو سب کو یہی پتا ہوگا نا کہ اپنے دوستوں کو لینے گیا ہے۔ ایسے میں پولیس تو ہمیں پکڑ کر لے جائے گی۔" عادل ایک اور دور کی کوڑی لایا۔

"یار——" حیدر یار پر زور دے کر بولا۔

"مجھے تمہاری بھابھی سے ملنے جانا ہے۔ وہ ناراض ہو گئی ہے مجھ سے۔" حیدر کو مجبوراً اپنی پریشانی بتانا پڑی۔

عادل کا منہ پورا کھل گیا۔

"میری بھابھی تجھ سے ناراض ہو گئی ہیں اور تو میری بھابھی کو راضی کرنے جا رہا ہے—— نہال بھائی جان سے ماروں گے تجھے۔" عادل بروقت بولا۔

"ابے گھامڑ! وہ اپنی دلہن کی بات کر رہا ہے۔" محب اللہ عادل کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"اوہ——" عادل نے ہونٹ سکیڑے۔

"بات سن۔ سیدھے سیدھے گھر چل ہمارے ساتھ۔ اس کے بعد جہاں کہیں جانا ہو چلے جانا۔" احسن بولا۔

"ہاں بلکہ ہمیں بھی ساتھ لے چلنا۔ ہم خالو کے اور خالو ہمارے درشن کر لیں گے۔" عادل دانت نکالتا ہوا بولا۔

"آپ لوگ غالباً بھول رہے ہیں۔ خالو جان نے حیدر بھائی کو ہم ویلے نکموں سے دور رہنے کا کہا تھا۔" انس نے ان لوگوں کو یاد کروایا۔

(حق، ہاہ—— زری بی بی کم سے کم آج کی رات تمہیں منانے کے آثار نظر نہیں آ رہے ہیں۔)

حیدر نے سر پر ہاتھ پھیرا۔

کچھ دیر کی بات تھی۔ حیدر کی معیت میں وہ گھر کی سمت رواں دواں تھے۔

☆☆☆

اندر کمرے میں وہ چاروں اپنے اپنے بیگ کھولے شادی میں پہنے جانے والے کپڑے نکال رہے تھے۔

باہر شادی والے گھر کی مخصوص چہل پہل محسوس ہو رہی تھی۔

دروازہ کھول کر حیدر اندر آیا۔ ایک ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھامے، دوسرے سے استری پکڑے اس نے سرگوشی سے، ذرا سی بلند آواز میں عادل کو پکارا۔

"عادل یار! یہ دروازہ بند کر جلدی سے۔" آنکھوں سے اپنے پیچھے کھلے دروازے کی طرف اشارہ کیا، جسے اس نے پاؤں سے ٹھوکر مار کر کھولا تھا۔

عادل نے دروازہ بند کیا۔ احسن نے اس کے ہاتھ سے ٹرے لی۔

"شکر ہے——" حیدر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کسی نے دیکھا نہیں۔"

"کیا——؟" محب اللہ اور احسن کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"یہ——" اس نے ہاتھ سے ٹیبل کی جانب اشارہ کیا۔ جہاں استری اور چائے کی پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔

"تو چائے چوری کر کے لایا ہے——؟" احسن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"دیکھ—— ہماری تو خیر ہے۔ ہمیں فرق نہیں پڑتا۔ لیکن یہ مولوی چوری کی چائے نہیں پیے گا۔" عادل دو پیالیاں اپنی طرف کھسکاتے ہوئے بولا۔

"اوہیں یار——!" حیدر نے سر نفی میں ہلایا۔

"میں استری کی بات کر رہا تھا۔"

"آپ استری چوری کر کے لائے ہیں——؟" اب کے انس کا منہ کھلا۔

"چوری کر کے نہیں، چھپا کر لایا ہوں۔" حیدر کی بات پر پہلے سب نے ایک دوسرے کو اور اس کے بعد حیدر کو دیکھا۔ گویا کہہ رہے ہوں، وضاحت پیش

کی جائے۔

''صبح سے معزز مہمانان گرامی ایک کے بعد ایک استری پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔ فارغ ہی نہیں کر کے دے رہے۔ میں چپکے سے اٹھا کر لے آیا ہوں۔ تم لوگ جلدی جلدی اپنے کپڑے استری کر لو تاکہ اس کی ڈھنڈیا مچنے سے پہلے میں واپس چھوڑ آؤں۔'' وہ اپنی چائے کی پیالی اٹھاتا ہوا بولا۔

''او کے.....'' سب نے سر ہلایا۔

''انس یار!'' عادل نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے آواز لگائی۔

''جی.....؟'' انس سیدھا ہوا۔

''پہلے تو اپنے کپڑے کر لے..... پھر.....'' تھوڑا توقف کیا۔ ''میرے کپڑوں پر بھی استری مار دینا.....'' جملہ مکمل کر کے انس کی طرف دیکھنے سے احتراز برتا۔

''اور میرے کپڑوں پر بھی.....'' احسن نے عادل کا جملہ اچکا۔

''جی، نہیں..... میں کوئی آپ لوگوں کے کپڑے ویڑے استری نہیں کر رہا۔'' انس نے ترنت جواب دیا۔

''بدتمیز..... نافرمان.....'' احسن اور عادل کے منہ سے ایک ہی وقت میں نکلا۔

''میں صرف اپنے اور محب اللہ بھائی کے کپڑے پریس کروں گا۔'' انس کی اگلی بات نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔

''یہ مولوی نا..... تعویذ گھول گھول کے پلاتا ہے اس کو۔'' احسن نے عادل کے کان میں سرگوشی کی۔

''ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' عادل نے تائید کی۔

''لائیں محب اللہ بھائی! کپڑے دیں مجھے۔'' انس چائے ختم کر کے کھڑا ہوا۔

''نہیں یار..... تو اپنے کپڑے کر، میں خود کر لوں گا۔'' محب اللہ نے انکار کر دیا۔

''اب دے دوں میں اپنے کپڑے.....؟'' عادل نے آس بھری نظروں سے ایک مرتبہ پھر انس کو دیکھا۔

اس سے پہلے کہ انس کوئی جواب دیتا۔ دروازہ زور سے بجا۔

''حیدر بیٹا! استری تو نہیں دیکھی تم نے۔'' ایک بوڑھی زنانہ آواز واضح طور پر سب نے سنی۔

حیدر نے دروازہ تھوڑا سا کھولا۔

''جی، پھپھو.....! ابھی کچھ دیر پہلے جستی پیٹی پر رکھی دیکھی تھی، وہیں سے کسی نے اٹھائی ہوگی۔''

''وہ، گوگا کہہ رہا تھا۔ حیدر بھائی کے ہاتھ میں دیکھی تھی میں نے۔''

''میرے ہاتھ تو بالکل خالی ہیں، یہ دیکھیں پھپھو.....'' حیدر نے دونوں ہاتھ سامنے کیے۔

''اچھا..... چلو.....'' وہ واپس مڑیں۔ ''گوگے سے دوبارہ پوچھتی ہوں۔''

''نہیں، نہیں پھپھو..... گوگے سے نہ پوچھیں۔'' حیدر جلدی سے بولا۔ ''امی یا ناز سے پوچھیں (ان کو یقیناً کچھ پتا نہیں ہوگا)۔''

پھپھو واپس مڑیں، حیدر اندر آ گیا۔ دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھائی۔

اندر، وہ چاروں کانوں کو ہاتھ لگائے توبہ توبہ کر رہے تھے۔

''یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ.....؟'' حیدر غصے سے انہیں گھورتے ہوئے بولا۔

''تیرے جھوٹ کی معافی طلب کر رہے ہیں اللہ سے۔'' محب اللہ بولا۔

''کون سا جھوٹ.....؟'' حیدر نے آستینیں اور تیوریاں دونوں چڑھائیں۔

''وہ جو تو ابھی اپنی پھپھو سے بول رہا تھا۔ استری والے معاملے پر۔''

کیا جھوٹ بولا ہے میں نے.....؟

''ہاں.....؟'' لہجے میں جلال شامل ہوا۔

''پھپھو نے پوچھا، استری تو نہیں دیکھی۔ میں نے کہا، تھوڑی دیر پہلے جستی پیٹی پر دیکھی تھی۔ کیا جھوٹ تھا اس میں.....؟ پھر انہوں نے کہا، گوگا کہہ

رہا تھا، حیدر بھائی کے ہاتھ میں دیکھی تھی میں نے، تو میں نے اپنے خالی ہاتھ دکھا دیے پھپھو کو....."

درشت انداز میں کہتے کہتے بھی حیدر کی اپنی ہی ہنسی چھوٹ گئی۔

باقی سب بھی ہنسنے لگے۔

"لیں جناب..... میرے کپڑے تو ہو گئے۔"

انس اتنی دیر میں اپنے کپڑے پریس کر کے فارغ ہو چکا تھا۔

انس کے بعد محب اللہ پھر احسن اور اس کے بعد عادل سب ہی کے کپڑے پریس ہو گئے۔

عادل نے استری کا تار نکالا ہی تھا کہ دروازہ پر دستک ہوئی۔

"ہوں..... کون.....؟" حیدر نے پوچھا۔

"میں گوگا۔ حیدر بھائی! دروازہ کھولیں جلدی سے۔ آپ کے خلاف پرچا کٹنے والا ہے۔"

حیدر نے چٹخنی گرائی۔ پندرہ، سولہ برس کا لڑکا اندر داخل ہوا۔

"جلدی سے آجائیں۔" دروازے سے منہ نکال کر اس نے حیدر کو دیکھا۔

"استری کی گمشدگی کا پرچا کٹے گا.....؟" حیدر نے استفسار کیا۔

"جی نہیں..... آپ کی گمشدگی کا۔ استری تو اوپر والوں سے مانگ لی تھی۔ آپ درکار ہیں؟ سہرا بندی میں صرف آدھا گھنٹہ باقی ہے۔ آپ تیار ہو جائیں آ کر۔"

"اچھا، آتا ہوں۔"

گوگا واپس چلا گیا۔ حیدر دوستوں کی طرف مڑا۔

"یار! تم لوگ بھی تیار ہو جاؤ۔ رسم کے لیے باہر بلواتا ہوں پھر۔"

سب نے سر ہلایا۔

☆☆☆

گولڈن شیروانی کے ساتھ سرخ رنگ کا کلاہ اور پاؤں میں گولڈن کھسہ.....

وہ سب بہترین طریقے سے تیار ہو کر حیدر کا انتظار کر رہے تھے، جب مکمل اور بھرپور تیاری کے ساتھ دولہا کی انٹری ہوئی۔

"کیسا لگ رہا ہوں؟" حیدر نے گردن اکڑا کر دریافت کیا۔

"زبردست، بہت اچھا، ماشاء اللہ۔"

سب ہی کے منہ سے توصیفی کلمات برآمد ہوئے۔

"شکر ہے۔" حیدر نے گردن اور کندھے ڈھیلے چھوڑتے ہوئے کہا۔

"کس بات کا حیدر بھائی؟" انس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"صرف، تم نمونوں سے خطرہ تھا مجھے کہ کچھ الٹا سیدھا نہ بول دو مجھے دیکھ کر۔"

"برادر!" عادل اٹھ کر اس کے قریب آیا۔ "باقی سب تو ٹھیک ہے، پر یہ سرخ کلاہ، کس کے مشورے پر پسند کیا تو نے؟"

اس نے ہاتھ سے اس کے کلاہ کے ساتھ لہراتے ریشمی کپڑے کو اس کے کندھے سے پیچھے پھینکتے ہوئے پوچھا۔

"وہ اصل میں نا، دلہن کا لہنگا سرخ ہے تو یہ اس سے میچنگ میں ہے۔ سسرال سے آیا ہے۔" حیدر نے وضاحت دی۔

"تو یہ کلاہ بعد میں دلہن کو پہنائیں گے کیا؟" عادل سچ مچ حیران ہوا۔

"او، نہیں یار! یہ فیشن ہے آج کل۔ دولہا، دلہن کے جوڑے میچنگ اور کنٹراسٹ میں بنائے جاتے ہیں۔"

"اللہ اللہ....." محب اللہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "آنے والے وقتوں میں ہو سکتا ہے، لہنگا دولہے کو پہنایا جانے لگے اور شیروانی دلہن کو۔"

"کروڑ روپے کی بات کی ہے مولوی۔" حیدر، محب اللہ کو دیکھ کر مسکرایا۔ "وہ وقت آنے سے پہلے پہلے تو بھی کچھ سوچ لے، شادی وادی کے بارے

میں۔"

"یار..... میں تو شادی کے لیے سو فی صد تیار ہوں۔ چاہے اس کے لیے لہنگا پہننا پڑے یا غرارہ۔" احسن دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔

اس بات پر گونجنے والے قہقہہ بڑے بے ساختہ تھے۔

☆☆☆

بارات روانگی کے لیے تیار تھی۔

دولہا کی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ حیدر کے کزن نے سنبھالی، آگے حیدر بیٹھا۔

پیچھے محب اللہ، عادل اور احسن فٹ ہوگئے۔

انس بے چارہ باہر کھڑا غور ہی کر رہا تھا کہ وہ کہاں اپنی جگہ بنائے، جب عادل نے شیشہ نیچے کر کے منہ باہر نکالا۔

"سن شہزادے! تو ایسا کر، دولہے کی گود میں بیٹھ جا۔ ہم کہہ دیں گے شہ بالا ہے۔"

انس نے برا سا منہ بنا کر چہرہ دوسری طرف موڑ لیا (مطلب شدید ناراض)۔

حیدر کی نظر بھی اسی وقت انس پر پڑی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

"سوری یار! میں نے نوٹ ہی نہیں کیا کہ ایک بندے کی جگہ کم ہے۔"

ابھی یہ بحث شروع ہوا ہی چاہتی تھی کہ جگہ کی کمی کو کیسے کور کیا جائے کہ ایک موٹر سائیکل بمعہ اپنے سوار کے زن کر کے ان کے پاس آ کر رک گیا۔

موٹر سائیکل سوار نے ہیلمٹ اتارا تو اندر سے گوگا برآمد ہوا۔

"حیدر بھائی، ممانی جان سخت ناراض ہو رہی ہیں۔" (اس نے حیدر کی امی کے بارے میں بات کی)۔

"آپ کی گاڑی کی وجہ سے پوری بارات لیٹ ہو جائے گی۔ جلدی نکلیں۔" اس نے پیغام پہنچا کر ہیلمٹ پہنا اور بائیک اسٹارٹ کرنے ہی والا تھا کہ حیدر کی بات پر ٹھٹک کر رک گیا۔

"تو اگر بائیک پر جا رہا ہے تو ہماری ایک سواری ساتھ لیتا جائے گا۔" گوگا حیران ہی رہ گیا۔

"آپ بائیک پر جائیں گے؟"

"اونہہ۔ میں نہیں یہ....." ہاتھ سے انس کی جانب اشارہ کیا۔

انس بدک کر پیچھے ہوا۔ "میں نہیں جا رہا اس بچے کے ساتھ بائیک پر۔"

"یہ بچہ سترہ برس کا ہو چکا ہے اور پچھلے پانچ برس سے موٹر بائیک چلا رہا ہے۔" بچے نے سخت ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے مطلع کرنا ضروری سمجھا۔

"اوہ، ویری گڈ یار۔" احسن دروازہ کھل کر نیچے اتر آیا۔

"تو کو لی فائی کر گیا ہے۔ میں چلتا ہوں تیرے ساتھ۔"

گوگے اور انس کے ماتھے کے بل کچھ کچھ کم ہوئے۔

معاملہ بخیر و عافیت نمٹ گیا۔ انس نے احسن کی چھوڑی جگہ سنبھال لی۔ دولہا کی گاڑی روانہ ہوئی۔

احسن اور گوگا موٹر بائیک پر عازم سفر ہوئے۔

گوگا موٹر بائیک چلا نہیں اڑا رہا تھا۔

"آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں بھائی جان؟" اس نے پوچھنا ضروری خیال کیا۔

"یار میں خود کو ایف سولہ طیارہ میں بیٹھا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔" احسن نے فوراً ہی سچ بول دیا۔

"سچ بھائی جان!" گوگا خوشی سے بے حال ہو کر مزید اونچی ہواؤں میں اڑنے لگا۔

اور احسن کو لگا کہیں وہ اڑتے اڑتے، اوپر ہی نہ پہنچ جائے۔

"دیکھ لیجیے گا بھائی جان! ہم ان سے پہلے پہنچیں گے۔" اس کے جوش کا عجیب ہی عالم تھا۔

"کہاں؟ جنت میں۔" احسن نے سوال پوچھنے کے ساتھ جواب بھی خود ہی دیا۔

"جی، جنت میں۔" ایک پیٹرول پمپ پر رکتے ہوئے وہ بولا۔

"یار تو مجھے بارات سے الگ کر کے جنت پہنچانے لگا ہے۔" احسن کو اتنی صاف گوئی کی امید نہیں تھی بچے سے۔

"نہیں میرا مطلب تھا "جنت شادی ہال" وہیں جا رہی ہے بارات۔"

"اوہ، اچھا اچھا۔" احسن نے سر ہلایا۔

پیٹرول ڈلوا کر گوگا ابھی موٹر بائیک اسٹارٹ کرنے ہی والا تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔

ریسیو کر کے کان سے لگایا۔ چند سیکنڈ بات سنی پھر جی اچھا کہہ کر کال کاٹ دی۔

"ہمیں واپس جانا پڑے گا۔" احسن کو اطلاع دی۔

"کیوں؟ شادی کینسل ہو گئی کیا؟" احسن نے حیرانی سے پوچھا۔

"نہیں۔ حیدر بھائی کا کلاہ گھر پہ ہی رہ گیا ہے۔ ان کا فون آیا ہے کہ واپس گھر جا کر، کلاہ لا کر ہمیں جوائن کرو۔"

"تو اب ہم بارات سے پہلے کیسے پہنچیں گے جنت میں۔ میرا مطلب ہے جنت شادی ہال میں؟" احسن نے دانت نکالتے ہوئے گوگے کو چھیڑا۔

اور یہ چھیڑ چھاڑ اس کو خاصی مہنگی پڑی کیونکہ احسن کا طعنہ گوگے کے دل پر جا لگا تھا۔

اب جو اس نے بائیک اڑانی شروع کی تو پیٹرول پمپ سے گھر تک اڑاتے ہوئے ہی لایا۔

گھر سے کلاہ لے کر جوں ہی وہ گلی سے مین روڈ پر آئے، موٹر بائیک دوبارہ سے ایف سولہ بن گئی۔

اس کے بائیک چلانے کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اب وہ جنت شادی ہال نہیں سیدھا جنت الفردوس پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

احسن کو بچپن میں قاری صاحب کی یاد کروائی ہوئی تمام دعائیں بمعہ تلفظ یاد آتی گئیں اور وہ ان کا ورد کرتا گیا۔

آخر احسن کی دعائیں رنگ لے آئیں اور موٹر بائیک بتدریج آہستہ سے ہوتے ہوتے بالآخر رک گیا۔

"آ گیا شادی ہال؟" احسن نے شکر کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، پولیس آ گئی۔" وہ بائیک سے اترتے ہوئے بولا۔

اس کی بات پر احسن کی سٹی گم ہوئی۔

کیونکہ ان کی بائیک سے کچھ فاصلے پر ٹریفک پولیس کا اہلکار اپنی بائیک کھڑی کر رہا تھا۔

"آج کی رات تو تھانے میں ہی گزرے گی۔" گوگا مزے سے بولا۔

"کیوں؟" احسن بمشکل تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

"بھئی ایک تو میرا لائسنس نہیں ہے پھر میں کم عمر ہوں، تو شناختی کارڈ بھی نہیں۔ اوپر سے میں اوور اسپیڈنگ بھی کر رہا تھا تو ایک رات تو ضرور ہی تھانے میں گزارنا پڑے گی۔"

گوگا اتنے سکون سے بولا جیسے تھانے میں رات گزارنے کی نہیں فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر کی بات کر رہا ہو۔

"تجھے کوئی پریشانی نہیں ہے؟" یہ وہ آخری سوال تھا جو احسن نے گوگے سے کیا کیونکہ ٹریفک اہلکار ان کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

"نہیں پریشانی کیسی؟ میرے ساتھ تو پانچ سال سے یہی کچھ ہو رہا ہے۔"

یہ وہ آخری جواب تھا جو گوگے نے دیا تھا۔

اور ایسے میں احسن کو صرف انس کا ایک ہی جملہ یاد آیا تھا۔

"میں اس بچے کے ساتھ بائیک پر نہیں جا رہا۔"

بس پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔